مکتبہ جدید

قرۃالعین

سفینۂ غمِ دل

سفینۂ غزل

سفینۂ غمِ دل

قرۃ العین حیدر

مکتبۂ جدید ○ لاہور

اشاعت اول ۱۹۵۲

اشاعت جدید ۱۹۶۹

پبلشر: مکتبۂ جدید لاہور

پرنٹر: الامان پرنٹنگ پریس لاہور

فصلِ اوّل

۱

"مما —— میں سینٹوجن تو خیر ہرگز نہ پیوں گا۔" آنریبل ایلبرو الفرڈ ریگسٹن اپنے گہرے سیاہی مائل براؤن بالوں کی لٹ پیشانی پر سے جھٹک کر برآمدے میں سے نیچے باغ میں کود گیا اور نہایت فیصلہ کن انداز میں موگرے کے پودوں کی طرف دیکھنے لگا۔ رابیل پھر کھِل رہی ہے۔ اس نے اُداسی سے سوچا۔ مولسری بھی۔ یہ بنارس کی صبح ہے۔ ہوا میں جو یہ مار ڈالنے والی مہک تیر رہی ہے مجھے اس سے دلی نفرت ہے۔ اس نے پھر فیصلہ کیا۔

"سینٹوجن —— ماسٹر ایلبر —— صرف ایک پیالی" مس کیتھلین چیو نے پچھلے کی کھڑکی میں سے جھانک کر مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہرگز نہیں" ۔ اس نے دہاڑ کر جواب دیا اور لمبے لمبے قدم رکھتا سمر ہاؤس کی طرف چلا گیا۔

"کچھ نہیں۔" مس کیتھلین چیو نے افسوس کے ساتھ حسبِ معمول اپنے دل سے گفتگو شروع کی۔ لیڈی اسپیلا کے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ماسٹر ایلبر بھی بڑے ہو گئے۔ بچپن ہمیشہ اتنی تیزی سے گزر جاتا ہے (وہ سینٹوجن کی بوتل اور ٹرے سائیڈ بورڈ پر رکھتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئیں جہاں قلوپیی ان کی کرسی پر بیٹھا قیلولے میں مصروف تھا)

میں لیڈی اسٹیلا کے یہاں سات سال سے ہوں۔ ایک سال ڈبلن۔ چار سال لندن۔ اور اس بیہودہ ملک میں یہ دوسرا سال ہے۔ اور سات سال میں یہ بچے تقریباً جوان ہو گئے اور اسی تیزی سے یہ اخلاقی انحطاط کی طرف جا رہے ہیں۔ اب میں ان میں کوئی اصلاح نہیں کر سکتی۔ ماسٹر ایلمر سگریٹ پیتے ہیں اور مس پمیلا بالوں کا شنگل بوب کرتی ہیں۔ لیکن سر آیڈگر کہتے [illegible] نے جدید نفسیات پڑھی ہوتی۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ماسٹر ایلمر اٹھارہ سال کے ہو چکے ہیں اور بے حد نفیس نظمیں لکھتے ہیں۔ جو خود سر آیڈگر کی سمجھ میں نہیں آتیں [illegible] جدید شاعری"۔ سر آیڈگر نے اس روز کچھ نہ سمجھتے ہوئے دو لفظوں میں [illegible] تشریح کر دی تھی۔ یکلخت مس کتھلین چیپو کو ایسا لگا جیسے سر آیڈگر اور [illegible] کے لئے بیک وقت ان کے دل میں ایک ناقابلِ بیان قسم کی محبت اور ہمدردی اور [illegible] کا احساس شدت سے امڈ آیا تھا۔ انہوں نے سوتے ہوئے [illegible] سے اٹھا کر کشن پر رکھ دیا۔

عبدل دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ "صاب! میم صاب سنیچر کی صبح کو پہلی بس کی طرف [illegible] گیا۔" اس نے مؤدبانہ اور انتہائی سنجیدہ آواز میں مس چیپو کے کان کے قریب [illegible] آہستہ سے کہا۔ "مس صاب ساتھ لے جانے کے لئے چیزیں نکلوا دیجئے۔"

"اچھا [illegible]" عبدل ہمیشہ تقریباً انگریزی بولتا تھا۔ لیکن مس چیپو کو اردو میں جواب دینے [illegible]۔ خالص برٹش اسٹائل۔ انہوں نے ذرا مسکرا کر سوچا۔

"میم صاب [illegible] ہائے ——" بلینڈی کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے عبدل سے [illegible] کیا۔ خالص برٹش اسٹائل۔ انہوں نے خیالات کا سلسلہ

جاری رکھا۔ خالص برٹش۔ لیکن میں تو آئرش ہوں۔ وہ پھر دل میں مسکرائیں "کوئی ہائے" انھوں نے چپکے سے دل میں اس جملے کو اسی مخصوص تلفظ میں ادا کرنے کی مشق کی۔

"میم صاحب مارننگ روم میں خط لکھ رہا ہے"۔ عبدل نے پیچھے آتے ہوئے اسی سنجیدہ آواز میں جواب دیا۔

سر ایڈگر اور لیڈی رکسٹین کو بے تکی سے بے تکی جگہوں میں جا کر پڑاؤ کرنے کا خبط تھا۔ پچھلے دو سال کے عرصے میں وہ اسی طرح صوبے کے سارے دُور افتادہ علاقے گھوم چکی تھیں۔ اُتر میں نیپال کی ترائی۔ پورب میں مرزا پور اور دیوریا جیسی خوفناک جگہیں۔ پچھلی کرسمس میں یہ لوگ جنوب کے ایک مقام دیوگڑھ میں بارہ سنگھے مارنے گئے تھے۔ جہاں رات بھر کوسی ندی کے کنارے غالباً گلدار دہاڑتے تھے اور مرہٹوں کے زمانے کے سرخ مٹی کے قلعے تھے ——— پیلی بھیت۔ اُنھوں نے لرز کر سوچا۔

کیمپ میں کون کون ہوگا۔ مس جیویہ نے تازہ گوبھی کے ہرے نم پتوں کی مہک پر سے ناک ہٹا کر آنکھیں بند کیں۔ ہز ہائی نس ہوں گے۔ پٹنے سے بریڈن کارٹر ز بھی ضرور آ رہے ہوں گے۔ شاید کوچ بہار کے مہاراجہ صاحب ہوں۔ تین چار گنے چنے ہندوستانی ہوں گے تین چار اور ادھر اُدھر کے راجکمار اور رانیاں ہوں گی۔ ان ہندوستانی راجواڑوں کے مسخرے پن سے مس کیتھلین جیویہ کو اور زیادہ وحشت ہوتی تھی۔

"مس صاحب! ایلمر بابا ساتھ نہیں چلیں گے"؟ عبدل نے دریافت کیا۔

"نائیں جائے گا"۔ مس جیویہ نے نہایت خوش اسلوبی سے مختصراً جواب دیا اور اپنی اردو کی مہارت اور کامیابی پر دل میں مسکرائی وہ پھر کمرے کی طرف آگئیں۔ ہاں۔ ایلمر بابا

نایٹ ہو جائے گا۔ انہوں نے دل میں دہرایا۔ اگلے مہینے سے ماسٹر ایڈگر کے امتحانات شروع ہیں اور اس کے بعد وہ کیمبرج چلے جائیں گے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ ماسٹر ایڈگر اٹھارہ سال کے ہو چکے ہیں اور جدید شاعری کرتے ہیں۔ مس چیویوٹ واپس آ کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئیں اور دریچے سے باہر دیکھنے لگیں۔ لیکن کاش اس کے باوجود اس وقت اگر وہ سگریٹ پینے کے بجائے سینٹ جن پی لیتے انہوں نے رنجیدگی سے سوچا۔

لیڈی اسٹیلا رکسٹن نے خط لکھنا ختم کیا اور مارننگ روم کی کھڑکی کے پردے برابر کر کے برآمدے میں آ گئیں۔ خط میں انہوں نے بیگم زینب عباسی کو شکار کی دعوت دی تھی۔ اور ایڈگر کی شکایت لکھی تھی جسے ہاتھیوں پر سواری کرنے کا بالکل شوق نہیں اور جب سے ہز ہائی نس نے اندازہ لگایا ہے کہ اُن کے ڈویژن کے نئے کمشنر بہادر کو شکار کا جنون ہے۔ وہ مستقل مصر ہیں کہ ہم سب کو لے کر سی۔ پی کے جنگلوں کی طرف جائیں۔ لیکن ایڈگر کے زکام کی وجہ سے یہ ارادہ بدل دیا گیا ہے۔ اسی قسم کی محبت اور پیار کی چند اور باتیں لکھنے کے بعد لیڈی اسٹیلا رکسٹن نے امید ظاہر کی تھی۔ کہ اُن کی گوڈ چائلڈ چھوٹی سی اسٹیلا اب انفلوئنزا سے سنبھل گئی ہو گی۔ اور جھانسی کی آب و ہوا اسے موافق آ رہی ہو گی۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ ان کی گورنس مس کیتھلین چیویوٹ ضلعوں کی پروونشل زندگی سے سخت نالاں ہیں اور شب و روز دعائیں مانگتی ہیں کہ ایڈگر کا تبادلہ لکھنؤ ہو جائے جو ہم سب کے لئے مجھے یقین ہے بہت اچھا ہو گا۔ کیا تمہارا یہ خیال نہیں ہے زینب ڈیئر؟ اسٹیلا اور علی کو بہت سا پیار لکھنے کے بعد اُنہوں نے خط بند کر کے چپراسی کو دیا تاکہ صاحب بہادر

کی ڈاک کے ساتھ فوراً اسٹیشن بھجوا دیا جائے۔ اور برآمدے میں آ کر انہوں نے ایمبر کو آواز دی۔

ایمبر انہیں باغ کے ایک کونے میں ملا۔ جہاں وہ املتاس کے نیچے بیٹھا دو نوجوان مالیوں کو سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ کی سیاست کے بنیادی نکتے ذہن نشین کرانے میں کوشاں تھا۔ مما کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ جلدی سے اُلٹے ہوئے گملے پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس طرح ہنستا ہوا گویا مما سے معذرت خواہ ہے، وہ اُن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ٹینس کورٹ کی طرف چلا گیا۔ جہاں بیٹھ کر مما اس کی مدد سے شکار کے مہمانوں کی فہرست مرتب کرنا چاہتی تھیں۔

مس گلینبلیبن جینیؔ نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے لیڈی اسٹیلا کے سفید فراک میں ملبوس پُر وقار جسم کو پھلیندے کے درختوں میں آہستہ آہستہ اوجھل ہوتا دیکھا۔ ان کے ساتھ ساتھ ایمبر ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا ہوا چل رہا تھا۔ پتوں میں سے چھنتی ہوئی دھوپ اس کے چاکلیٹ بالوں پر جھلملا رہی تھی۔ مس جینی نے کھڑکی کا پٹ آہستہ سے بند کیا گویا وہ اس منظر کے شدید حسن اور امن سے اس درجہ خوف زدہ تھیں کہ اُنہیں خدشہ تھا کہ کسی ہلکی سی حرکت یا جنبش سے وہ منتشر نہ ہو جائے۔ اتنی جذباتیت۔ شاید یہ میرے کیلٹک خون کا اثر ہے انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ اور شاید میں بھول رہی ہوں کہ مجھے پیلی بھیت سے کتنی شدید نفرت ہے۔ پیلی بھیت۔ مرزا پور۔ دیوریا۔ انہوں نے یہ نام دل میں دہرائے اور رنج سے آنکھیں بند کر لیں۔

۲

رات۔ وجود کی ساری گڑبڑ، بے ترتیبی، بے اطمینانی اس تاریکی میں گم ہو جاتی ہے۔ صرف شہروں کی دیواروں کے کنارے اور درختوں کے محیط باقی رہ جاتے ہیں۔ کھیتوں کا گھیرہ۔ کائنات اپنی ابتدا کی طرف واپس جا چکی ہے۔ ندیاں، پہاڑ، دور افتادہ جنگلوں کے راستے۔ یہ سمندر۔ اس پر خاموشی اور وقار سے تیرتا ہوا یہ جہاز جو انگلستان جا رہا ہے۔

لمحات کا سنگین، تکلیف دہ تسلسل، جو نغمے کے ستونوں کو اوپر اٹھاتا اس کرب مسلسل کی فصیلیں کھڑی کر رہا ہے۔ نظریں جو اس تاریکی میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ نظریں جو ہر جگہ، ہمیشہ انتظار کریں گی ـــــ ریاض بہت دیر تک ریلنگ پر جھکے رہنے کے بعد ڈیک کی نسبتاً تیز روشنی میں واپس آ گیا۔ اس اندھیری، ابدی رات میں اگر ہم سب کے دماغ کام کرنا چھوڑ دیں، اس نے سوچا اور خفیف سا تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھر گیا ـــــ غالباً کوئی احساس، کوئی سنسنی بھی صحیح نہیں ہے۔ وقت کے اس حصے میں، وہ اس جگہ، ان انسانوں سے وابستہ ہے، اور رات ان سب چیزوں پر اپنی تحکمانہ بے نیازی سے جھکی ہوئی ہے (اس نے بچوں کی طرح ہتھیلیوں سے آنکھیں مل کر ڈیک کا ایک چکر لگایا۔ پھر ڈرائنگ روم میں جا کر کرسیوں اور میزوں کے درمیان سے گزرا، دریچوں کے پاس جا کر کھڑا ہوا اور شدید تکان کے احساس کے ساتھ ایک صوفے پر

بیٹھ گیا) کاش یہ سب لوگ جو اِدھر اُدھر بیٹھے ہیں، دیکھ سکتے کہ وقت کتنی خوبصورتی سے چل رہا ہے۔ یہاں اتنی روشنی ہے۔ اتنی روشنی ہے ——— اس نے پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

میں نے زندگی کی، آس پاس کی اتنی تفصیلات ذہن نشین کیں اور پھر بھلا دیں۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ یہ سارے محسوسات، ساری تفصیلات ہمیشہ بیکار جائیں گی۔ زندگی کے، میری اپنی زندگی کے تانے بانے میں ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس جگہ باہر کی اس تاریکی سے بھی میرا کوئی رشتہ نہیں۔ (یہ سب نہایت غیر شخصی سی چیزیں ہیں۔ اس نے نہایت بے پروائی کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی۔ نہایت غیر شخصی) چٹانیں۔ پانی۔ آسمان جو بہہ رہا ہے۔ صبح اور شام۔ وقت جو ہمیشہ ایک منظر، ایک سانیٹ، ایک نغمے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں ان چیزوں سے ہمیشہ الگ رہوں گا۔

صوفے پر سے اُٹھ کر وہ پھر دریچے کے قریب چلا گیا۔ نزدیک کی میز پر ایک ادھیڑ عمر کی امریکن عورت خط لکھنے میں مصروف تھی اور بار بار رومال سے ناک کو چھوتی تھی۔ ستون کی دوسری طرف دو پارسی لڑکیاں دو جرمن ڈاکٹروں کے ساتھ تاش میں مصروف تھیں۔ وجود کے احساس سے ہر چیز کے مقام کا تعین سا ہو جانا چاہیئے۔ اُس نے سوچا۔ گویں بھی اس تاریکی میں خیمہ زن ہوں۔ (کس قدر شاعرانہ خیال ہے، اس نے مسکرا کر دل میں کہا) گو میں بھی اس تاریکی میں خیمہ زن ہوں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ میں موجود ہوں۔ (ایک سطح کے نیچے وجود قائم ہے، بہہ رہا ہے، وہ بیگا) پچھلے چوبیس سال سے زندہ ہوں۔ پڑھا لکھنا کو پسند کرنے کے علاوہ (جو ایک خاص حیثیت، خاص سطح

سے اپنے وجود کی نمائندہ ہے) میں نے ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ کیمبرج میں ریسرچ کی۔ اور انڈین سول سروس کے لئے دوبارہ ولایت جا رہا ہوں (زندگی کے مفصل اور اہم ہونے کے احساس کا تعین) وہ دریچے سے باہر دیکھتا رہا۔ جہاں اتنا عمیق، پراسرار اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے نے وقت کو معطل کر دیا تھا۔

ہاں دریچے سے ہٹ کر اس نے صوفے پر واپس آتے ہوئے سوچا۔ غالباً کوئی احساس کوئی سنسنی بھی صحیح بھی نہیں ہے۔ کوئی خیال اس وقت چاکلیٹ بالوں والا وہ خوبصورت انگریز لڑکا جو یو۔ پی کے کسی ڈویژن کے کمشنر کا بیٹا ہے اور ہر سال اپنے والدین سے ملنے کیمبرج سے ہندوستان آتا رہتا ہے ۔ وائن پر شوبرٹ کا نغمہ ختم کرنے کے بعد اپنے کیبن میں بستر کے پاس دو زانو جھکا دعا مانگ رہا ہوگا۔

اے سمندر کے ستارے! ہم کو بچا۔ ہم کو بچا۔

یہ ٹھنڈی، مختصر سی دنیا جس میں سارے ملحد آخر میں نہایت شدید کیتھولک بن جاتے ہیں (جذبات کا تعین) آنریبل ایلمر رمسیٹن جو اٹھارہ انیس سال کی عمر میں عقل پرستوں کا چیلا تھا۔ اب اتنی شردھا کے ساتھ ورجن میری کا مجسمہ ساتھ ساتھ رکھ کر جہاز پر عبادت کرتا ہے۔ ریاض نے ایک جماہی لیکر آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لئے اور بے وحیانی سے پارسی لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اکیلے موسم اور اکیلے زمانے جو میرے دوست ہیں اس نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا اور ڈیک کا فرش عبور کرکے بار کی طرف چلا گیا۔

(جہاز اپنی اہمیت اور رفتار کے احساس کے ساتھ سکون سے موجوں پر آگے بڑھتا گیا)

۳

نادرہ کے کمرے میں ابھی روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے لیمپ کو بجھا کر اب سو جانا چاہیے فواد نے طے کیا۔ نہایت عمدہ، خنک رات ہے لکھنؤ کی ٹھنڈی، خوشبودار رات۔ دھیمی چاندنی اور اس کے ساتھ ساتھ زمین دُور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے وسعت کے آفاقی احساس کا اسے خیال آیا۔ زمین۔ گاؤں بستیاں۔ صوبے۔ دوسرے ملک۔ دوسرے انسان (دوسرے خطّے۔ لاہور سے ریاض، اس کا دوست آجکل پھر لندن گیا ہوا ہے) دنیا خوب پھیلی ہوئی ہے۔ جزیرے۔ سمندر۔ وہ خاندان جو انڈامانز میں ہے۔ کچھ لوگ پہاڑوں پر ہیں۔ کچھ وادیوں میں۔ سمندروں پر جلاوطنوں اور دیوانوں سے بھرے ہوئے جہاز چل رہے ہیں۔ وادی کے کھیتوں اور چوپالوں میں روشنیاں جل رہی ہیں۔ بہت سے لوگ مرتے بھی ہیں۔

"نادرہ" اس نے آواز دی۔

"سو جاؤ" نادرہ نے جواب دیا اور روشنی بجھا دی۔ نیچے باغ میں نادرہ کے دریچے میں سے نکلتا ہوا جو روشنی کا راستہ سا بن رہا تھا۔ وہ دفعتاً غائب ہو گیا۔

سائے۔ زینے کے چاروں طرف سائے رواں ہیں اور ہم اس وسعت پر حملہ آور کس طرح ہوتے ہیں! اس نے تعجب سے سوچا۔ رات گذرتی جا رہی ہے اور سویرا ہونے والا ہے۔ میری پیاری بہن نادرہ آج رات بہت دیر تک پڑھتی رہی۔

برابر کے کمرے میں ابوؐ اور امی کے دوستوں کا بہت سا سامان بند پڑا ہے جو انڈامان گئے ہوئے ہیں۔ اندھیرے میں چیزوں کی شخصیت مختلف ہو جاتی ہے اور رات کے وقت خالی خاموش کمروں میں گھومنا اچھا لگتا ہے۔ (اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پرسوں راحیل کے والد کا انتقال ہو گیا)

موت ۔ ان سب باتوں کی حیثیت الگ الگ ہے ۔ موت ۔ اس نے دریچہ بند کر کے اور تکیے پر سر رکھ کے اطمینان سے غور کرنا شروع کیا۔ چنانچہ راحیل کے والد کا پرسوں انتقال ہوا۔ راحیل ایک سیدھے، سیاہ بالوں والی خاموش سی چھوٹی سی لڑکی ہے۔ اس کے والد تھے۔ دو شخصیتیں۔ ان میں سے ایک نے خود کو ابدیت میں داخل کر دیا۔ یعنی انہوں نے ابدیت اختیار کر لی اور زندگی کو چھوڑا۔ ابدیت۔ یعنی راحیل کے والد ایک صاحب تھے۔ جو ابوؐ سے ملنے اکثر آیا کرتے تھے۔ اور ڈرائنگ روم میں ہمیشہ ایک خاص کونے میں آتشدان کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور پائپ پیتے تھے۔ پرسوں شام ایسا ہوا کہ وہ ختم ہو گئے۔ راحیل ابھی زندہ ہے اور بہت سے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ اور سب کا وجود الگ الگ ہے۔ مثلاً یہ خاندان جو پچھلے تین سال سے انڈامان گیا ہوا ہے۔ ان کا فرنیچر۔ تصویریں۔ پرانا پیانو۔

تکیے پر آسائش کے احساس کے ساتھ آنکھیں بند کئے کئے اس نے فضا کی خاموش صداؤں کو سننے کی کوشش کی۔ ہوا جو مدھم، دور کی آوازوں کی ندی میں بہہ رہی تھی، موسم گرما کے سبز پرندے جو رات کے جنگلوں میں سے نکل کر آئے تھے۔

وہ پھر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات اس کے باپ کے گھر پر اس مشہور و معروف خوبصورت نجم الدولہ ہاؤس پر سے بہتی جا رہی تھی۔ ابدیت نہیں ہے۔ نہیں ہے

لیکن رکو۔ ٹھہرو۔ ٹھہر جاؤ۔ تھوڑی دیر اور۔ تھوڑی دیر اور۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ دور دور تک زمین اور پانیوں پر گرتی ہوئی چاندنی دھندلی ہو گئی تھی۔ تاریکی اور وسعت۔

وسعت۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ۔

۴

خلا کی نیلگوں وسعت میں عجیب عجیب شکلوں کے جانور پھر رہے تھے اور اونچے درخت اور بیلیں ہوا میں لٹک رہی تھیں۔ فضا میں نمی اور خنکی تھی۔ اور مس کیتھلین جو مصر تھیں کہ میں دو چمچے آسٹو مالٹ دودھ میں ملا کر پیوں تاکہ صبح کے وقت کی دریا کی ٹھنڈی ہوا کے اثر سے مجھے زکام نہ ہو جائے۔ مس چیچو صاحب مسلسل اپنا سرخ کوٹ پہنے تھیں۔ اسٹیمر کے کیبن میں کھڑکی کے پاس لیٹے لیٹے میں نے کچھ سوتے اور کچھ جاگتے میں یہ سب کچھ دیکھا۔ باہر صبح کی نیلگوں سفیدی پھیلتی جا رہی تھی اور نقرئی پانی پر کناروں کے سائے ڈولتے تھے۔ ہوا صبح کی دھندلی چاندنی میں چاندی کی سی ٹھنڈی لو کی طرح دہک رہی تھی۔ شدھ اشنان دھرم ہندوؤں کے بازار، مسلمان جولاہوں کے محلے، انگریز حکام کی کوٹھیاں، دریا کے پرے ان سب پر صبح کی کاسنی دھند چھائی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کی طویل عمارات، سارناتھ کا ابدی سکوت، جونپور اور قنوج کے تیز سرخ گلابوں کے تختے، آم کے باغات۔

اس حسن کا ذہنی تجزیہ ناممکن ہے، یہ منظر ابدی ہے اور لازوال۔ ابا جان نے اسٹیمر کے عرشے پر آکر اپنے آپ سے کہا۔ کوئی ہم سے یہ صبح، یہ موسم، یہ کھنکارتے ہوئے برہمن، یہ چہچہاتی لڑکیاں، یہ الوہی سکون کے ساتھ ٹہلتی ہوئی گائیں، یہ مناظر چھین سکتا ہے — نہیں۔ ابا جان نے طے کیا۔ بنارس کی صبح۔ بنارس کی صبح

ہماری زندگی کی کیفیت کا ایک جزو ہے۔ یہ ہم سے کبھی نہ چھٹے گی۔

اسٹیمر کنارے سے آن لگا۔

"اپنا کوٹ اٹھاؤ۔ ممی کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترو۔" مس کینٹقلین چیو نے حکم دیا۔ "گھاٹ پر کتنے بہت سے لوگ کھڑے ہیں میرا!" میں نے خوش ہو کر میرا سے کہا۔

تین سفید شیروانیاں۔ دو بنارسی پگڑیاں۔ ایک دوپلی ٹوپی۔ میرا نے ریلنگ پر جھک کر باقاعدہ گننا شروع کیا۔

"ہز ہائی نس کی ہلوزین پل کے اس پار کھڑی ہے۔ وہاں تک پیدل چلنا پڑے گا سرکار!" دوپلی ٹوپی نے دست بستہ دریافت کیا۔

"ممی میرا کوٹ!" سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے چلا کر کہا۔

"ڈونٹ شاؤٹ" مس چیو نے پھر آہستہ سے ڈانٹا۔

"صبح بخیر یور ہائی نس!"

"صبح بخیر۔ صبح بخیر۔ خوش آمدید!" سب ریت پر چلتے ہوئے گھاٹ کے پتھروں پر آ گئے۔

"بنارس!" ممی نے ہوا میں کچھ سونگھتے ہوئے کہا۔

"بنارس۔ سوشیودری موسی نے خود کو بتایا" میرا مایا۔ ادھر آؤ۔ ٹھیک سے چلو۔ کود پھاند مت مچاؤ۔" انہوں نے فوراً آواز بدل کر ڈانٹا۔

"کودتی ہوئی مت چلو" مجھے مس چیو نے حسبِ معمول حکم دیا۔

"پورٹ بلیئر سے جب ہم چلے —— ممی نے ہز ہائی نس کو کوئی واقعہ سنانا شروع کیا۔

"گنگا کے حسن کا اندازہ کیجئے۔" انکل راج ونش کہہ رہے تھے "میں دیش کے سارے دریاؤں پر تیرا ہوں۔ گوداوری، جمنا، پدما لیکن اپنی گنگا ماں کی تعریف کیسے کروں۔" ہم سب کے دل میں گنگا ماں کے خالص اپنے ہونے کا احساس شدید ہو گیا۔ باتوں کے جوش میں ہماری رفتار اور ترتیب پھر غلط ہو گئی۔ ارون سب سے آگے چل رہا تھا۔

"سڑک پر شور نہ کرو۔" مس چیٹو نے پھر حکم لگایا۔

"مس چیٹو اب تو بالکل سٹھیا گئی ہیں۔ لیڈی اسٹیلا جیسی رومینٹک روح کے پاس سات آٹھ سال رہنے کی وجہ سے مس چیٹو کا ذہن بالکل برباد ہو گیا۔ اگر انہوں نے جدید نفسیات پڑھی ہوتی ——" ممی نے ہاتھ ہلا کر چپکے سے ہز ہائی نس سے کہا۔ "لیکن مس چیٹو جین آسٹین پڑھتی ہیں۔ سوچئے ذرا جین آسٹین۔"

"تین سال کے عرصے میں ان لڑکیوں نے مجھے بالکل ڈی مورلائز کر دیا۔" ارون نے دہاڑ کر چھوٹے مہاراجکمار کو شکایتاً بتایا۔ "کرنل براؤنز میں میں بوکسنگ چیمپئن تھا اور پورٹ بلیئر میں یہ خرگوشنیاں مجھ سے اپنی گڑیوں اور گڈوں کا بیاہ کرواتی تھیں۔ میرے لئے ایک داڑھی تیار کر کے رکھی تھی۔ غضب خدا کا مجھ سے ایک مرتبہ پوریاں بلوائیں۔" ارون کی آنکھوں میں تقریباً آنسو آ گئے۔

آسمان پر سارے میں سفیدی پھیل چکی تھی۔ "ہے رادھے، ہے شیام۔" محل کے مندر سے کیرتن کی آواز بلند ہوئی۔ موٹریں پھاٹک کے اندر جا کر رکیں۔

"خان بہادر صاحب کے زمانے میں اس جگہ بارہ دری تھی۔ خان بہادر صاحب

یہاں اجلاس کرتے تھے۔" دیوان صاحب نے مجھے زینے کے ایک ستون پر جھکا کر نیچے اشارہ کیا۔ "بیٹا آپ کو یاد ہیں ــــ ؟" انہوں نے پوچھا۔

"کون ــــ ؟ خان بہادر صاحب ــــ ؟" میں نے بے خیالی سے پوچھا۔

"بھلا بیٹا کو کیا یاد ہوں گے۔" دوپلی ٹوپی نے ہیں ہیں ہیں کرکے جواب دیا۔ "بٹیا خان بہادر صاحب آپ کے دادا تھے۔ سارا بنارس ان سے تھر تھر کانپتا تھا۔ مہاراجہ صاحب تو ان کے حکم بنا پتہ نہ توڑتے تھے۔ کیا زمانے تھے ــــ" دوپلی ٹوپی نے آنکھیں نیم وا کیے عقیدتمندانہ لہجے میں بات جاری رکھی۔ "پر یہ بھی کتنے آنند کی بات ہے کہ سرکار اتنے قریب کے ضلع کے حاکم ہو کر آ گئے ہیں۔ کتنے آنند کی بات۔"

"ڈارلنگ اسے تھینک یو۔" مس چیوٗ نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔

"تھینک یو۔" میں نے دوپلی ٹوپی کا شکریہ ادا کیا۔ اور ستون پرسے اتر آئی۔

"سرکار وہاں تشریف لے چلیے جہاں خان بہادر صاحب ــــ" دیوان صاحب نے کہنا شروع کیا۔ ہم سب ہال سے باہر نکل آئے۔

"اس ساری فوج کو اگلے ہفتے مسوری پیک اوٗف کرنا ہے۔" ممی اور سوئیٹیری موسیا تھکی ہوئی آواز میں ہز ہائی نس سے کہہ رہی تھیں۔ "بچّوں کو زیادہ عرصہ گھر پر کبھی نہ رکھنا چاہیے۔"

"پورٹ بلیئر میں تو میں بالکل ڈی ٹی ری اور ریٹ ہو گیا تھا۔" ارجن نے پھر شکایت کی۔ اسے بڑے بڑے الفاظ استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔

چنانچہ یہ ہماری سرزمین ہے۔ جس سے ہمارا کبھی زیادہ تعلق نہیں رہا۔ بنارس سے

غازی پور کی طرف آتے ہوئے جوگ مایا نے سوچا۔ دھوپ میں چمکتا ہوا سفید اور عثیانا شہر، نیگھوں بستیاں، سارناتھ۔ رام نگر کے ہاتھی کشتیوں کے پل پر سے گزر رہے تھے۔ اس جگہ نند کمار آکر ٹھہرا تھا۔ یہاں سے انگریز کی توپ چلی تھی۔ یہاں آکر لارڈ کارنوالس مرا تھا۔ "اسٹیلا نینی تال سے کب آرہی ہے؟" جوگ مایا نے پیچھے مڑکر پوچھا۔ "وہ سب مئی میں دہرہ آئیں گے نا؟"

"اُفوہ کتنی مصروفیت۔" میرا نے خوش ہوکر مستقبل قریب کا اندازہ لگایا۔

"وہ سب؟" اروِن نے فکرمندی سے مجھ سے پوچھا۔ "یعنی تمہاری ساری کزن خواتین؟ چار اور لڑکیاں۔ اس کے لی بڑکی۔ چار اور —" اروِن نے ایک اور وحشیتی لفظ استعمال کیا اور خاموش ہوگیا۔

"اسٹیلا آجکل دن بھر شہسواری کرتی ہے۔ کھانے کے کمرے سے غسل خانے تک گھوڑے پر بیٹھ کر جاتی ہے۔" میں نے سب کو مطلع کیا۔

"اور جعفر اور علی —؟" اروِن نے رنجیدہ آواز میں پوچھا۔

"ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر نادرہ بھی اس مئی میں دہرہ آجائے" جوگ مایا نے کہا۔

"ایک اور لڑکی —؟ یعنی سب ملا کے چار اور ایک پانچ، اور چار [illegible] تو دیکھیں"

اروِن نے حساب لگا کر ایک آہ بھری اور خاموش ہوگیا۔

ووکی ٹینڈر سڑک پر اطمینان سے تیرتی رہی۔

"یورپ کے ضلعوں کا انتظام بہت خراب ہو رہا ہے سرکار —" دوسری موٹر میں وہ ڈپٹی نے ابا جان سے کہنا شروع کیا۔ "کورٹ آف وارڈز کی حالت بھی سقیم ہے

دراصل، جب سے یہ گول میز کانفرنسوں اور عدم تعاون اور بائیکاٹوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، زندگی کا نظام بالکل تہ و بالا ہوتا جا رہا ہے۔ رعایا مفسد ہو گئی ہے۔ جب تک انگریز کا اقبال بھاری ہے ہم لوگ خیریت سے ہیں۔ ورنہ نجانے کس روز کیا سے کیا ہو جاوے۔ جو ہمارے لڑکے ولایت سے لوٹ کر آتے ہیں وہی ایسے خیالات پھیلا رہے ہیں۔ سنا ہے بنگالے کا حال اور تشویشناک ہے!———

آگے پیچھے ساری موٹریں غازی پور کی سایہ دار سڑک پر داخل ہو گئیں۔

معلوم ہوتا ہے میری ساری عمر ان ہی بنگلوں میں گزر جائے گی۔ مس کیتھلین ہیوم نے موٹر سے اتر کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ برساتی کی چھت پر یونین جیک صبح کی ہوا میں نرمی سے سرسرا رہا تھا۔ گویا مس ہیوم کو آہستہ سے خوش آمدید کہتا ہو۔ چاروں طرف آم اور فالسے کے درخت تھے اور ڈھیروں گلاب۔ کوٹھی کے پیچھے گنگا بہ رہی تھی۔

شاید میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں۔ انہوں نے سوچا۔ ورنہ مجھے اس جگہ کے حسن اور سکون سے بے انتہا بے چین ہو جانا چاہیے تھا۔ لیڈی اسٹیلا ہمیشہ کہتی تھیں ان جگہوں میں کتنا حسن، کتنا سحر، کتنی موسیقی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے (وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پچھلے برآمدے کی طرف آ گئیں جدھر سے گنگا نظر آتی تھی) یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان کمبخت ضلعوں سے نفرت ہے۔ دفعتاً انہوں نے دیکھا کہ موگرے کے پھول کھل رہے تھے۔ ماسٹر ایلبر کو موگرے کے پھول کتنی دیوانگی کی حد تک پسند تھے۔ ماسٹر ایلبر نے غالباً اب تک شادی بھی کر لی ہو گی۔ انہیں خیال آیا۔ لیڈی ریمنگٹن کے یہاں سے علیحدہ

ہوئے انہیں اتنا عرصہ ہو گیا تھا اتنے دنوں تمہارے یہاں علی گڑھ اور پھر پورٹ بلیئر رہیں علیگڑھ انہیں کافی پسند آگیا تھا۔ سیدراس مسعود اور نواب مزمل اللہ خان کا علی گڑھ۔ یہاں کے ماحول میں کچھ کچھ مشرق کا روائتی گلیمر نظر آجاتا تھا۔ طلباء کی ترکی ٹوپیاں۔ مسجد کی اذانیں باہر سے آنے والے ترک مہمان (تقسیم اسناد کے موقعہ پر چانسلر، وائس چانسلر اور آپاجان لقرئی اور طلائی کارچوب کے منقش چوغے پہن کر ڈائس پر آتے، عربی میں خطبے پڑھے جاتے۔ مس چیوم موقعے کی اہمیت اور سنجیدگی کو نہایت شدت سے محسوس کرتیں) ہاں۔ انھوں نے سوچا۔ انہیں علی گڑھ ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہاں کے اجاڑ گرد آلود کھیت۔ دور دور پر پروفیسروں کی کوٹھیاں۔ پروفیسروں کی جرمن بیویاں۔ سوئمنگ باتھ کلب۔ لڑکے۔

پھر پورٹ بلیئر۔ علی گڑھ سے ان کو آپاجان اور رانی کے ساتھ پورٹ بلیئر جانا پڑا تھا جو ایک مثالی برطانوی نوآبادی تھی۔ ایسی نوآبادی جو دنیا کے سمندروں، جزیروں، ساحلوں اور براعظموں میں ہر جگہ موجود ہے۔ برطانوی براکریسی کے اس دور افتادہ اولمپس پر سول سروس کے تین ہندوستانی عہدے دار تھے۔ فلیگ اسٹاف ہاؤس پر شامی پہرے دار رہتے تھے۔ تینوں ہندوستانی خداؤں کے ہاں دوہری گارد تھی۔ جن میں چند وہ انقلابی بھی شامل تھے جنہوں نے بنگال کے دہشت پسندوں کا ساتھ دیا تھا۔ (یہ سب مس چیوم کو بے حد رومینٹک معلوم ہوتا۔ نیچے برساتی میں جب گارد تبدیل ہوتی اور ہتھیاروں کے جھنجھنانے کی آواز اوپر لاؤنج میں آتی تو ان کو بہت اچھا لگتا) دن بھر خدا بور ہوتے رہتے۔ شام کو ڈنر سوٹ پہن کر اور اپنی اپنی موٹر لانچ میں بیٹھ کر کوباد جزیرے کے کلب چلے جاتے

بچے دن بھر برآمدوں کے لکڑی کے فرش پر اسکیٹنگ کرتے اور شور مچاتے رہتے۔

لیکن اب یہ بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں جس طرح لیڈی اسٹیلا کے بچے بڑے ہو گئے۔ مس ہنٹ نے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر سوچا اور پھول اسی طرح کھل رہے ہیں۔ گنگا کے کنارے موگرے کے پھول اسی طرح کھل رہے ہیں۔ انہوں نے افسوس سے باغ کی طرف نگاہ کی۔

۵

بارش کی وجہ سے فضا پر گہری نیلی دھند چھا گئی۔ بانس کے پتوں پر سے پانی کے قطرے یکسانیت کے ساتھ نیچے شفاف بجری پر ٹپک رہے تھے۔ صبح سویرے میرے کمرے کی سرخ ٹائیلوں والی چھت پر جب یہ قطرے گرے تو میری آنکھ کھل گئی۔

"تم ایسے موسم میں رائیڈنگ کے لئے گئی تھیں؟" میں نے ہوا کی نمی اور خوشبو جب ناک میں گھسی تو پلنگ پر سے اٹھے بغیر سوال کیا۔

"علی گیا تھا ——" اسٹیلا نے جو کیچڑ سے لت پت جوتے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔ کھانے کے کمرے میں جعفر اور انشو نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ "اللہ کے فضل سے کس قدر کا ہلا کرتے ہیں۔ سب بچے ——" ہرمزی خانم بڑبڑاتی ہوئی گیلری میں سے گزر گئیں۔

"دورے" میں نے فی الحال پلنگ سے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے سوچا۔ اللہ کا شکر کہ یہاں آ کر یہ دوروں پر جانے کا سلسلہ ختم ہوا۔ ابا جان کا نہایت مرغوب قسم کا مشغلہ معلوم ہوتا تھا مستقل دورے۔ آم کے باغات میں ٹھہرے ہوئے بیلوں کی گھنٹیاں، چپراسیوں کی آوازیں، الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے عدالت کے اہلکاروں کے گروہ۔ سامنے کے کھیتوں پر سے اٹھتا ہوا کہرہ۔ شفاف نہریں۔ خیموں کے اڑتے ہوئے پردے۔ بیل گاڑیوں پر لدا ہوا فرنیچر اور قناتیں۔ موٹروں کی قطاریں۔ اگلا پڑاؤ ہردوئی، اگلا پڑاؤ زنگی پور، اگلا پڑاؤ

سیدان پور، مشرقی یو۔پی کے تعلقیق زمینداروں کے ہاتھی اور جانکی بائی کی گجریاں (دوسرے سے واپس آ کر گھر کے بند کمرے کھولے جاتے اور گیلری کی میز پر کرسمس کی ڈاک اور اوپر کرسمس کیک رکھے ملتے)۔

یہ جون ہے۔ میں نے ناک دریچے سے آتی ہوئی ہوا میں ڈبو کر اندازہ لگایا۔ کچھ عرصے بعد سات سو میل کا طویل راستہ طے کر کے ابا جان پھر گنگا کے کنارے چلے جائیں گے اور اپنے کام میں مصروف ہو جائیں گے۔ ابا جان کبھی نہیں تھکتے۔ کبھی اپنی تھکان یا اکتاہٹ دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے۔ بہت دنوں سے ابا جان نے گولف کھیلنے کے بعد واپس آ کر رات گئے تک لیمپ کے پاس بیٹھ کر کچھ لکھا بھی نہیں (کچھ عرصہ پہلے انہوں نے غور و فکر میں ڈوب کے اور کبھی کبھی مسرت کے احساس کے ساتھ گنگناتے ہوئے "ہما غانم" مکمل کی تھی)۔

"فوادو" علی نے دریچے میں سے اندر جھانک کر مختصراً اطلاع دی۔ وہ غالباً سیدھا اصطبل کی طرف سے آ رہا تھا اور اب کھانے کے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

فوادو۔ میں کود کر پلنگ پر سے اتر آئی۔ چنانچہ اب ہم دن بھر اسکیٹنگ کریں گے۔ فوادو ہمیں ناک پر سنترے بیلنس کرنے کی ترکیب سکھائے گا۔ ہفتے اور اتوار کو ہم سب پاپا، میرا اور ارون کے ساتھ مسوری جا کر چوکو بار کھایا کریں گے اور گریٹا گاربو کے فلم دیکھیں گے۔

"بٹیا آج ناشتہ نہ کریو کا۔ چوتمس صاحب بہت تمہار دماغ خراب کر دیہن ہیں" ہمرے کی نعلم نے گدڑی میں سے منہ نکال کر کہا۔ میں تیزی سے غسل خانے میں پہنچی۔ بٹیا آپی کی طرح نہا دھو کر کھانے کے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔

غسل خانے کی کھڑکیوں کے باہر پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔

آشیانہ۔ بادلوں کے ہلکے دھندلکے میں سے فواد نے درختوں کے دوسری طرف دیکھا۔ دیوار کے گھرے جنگلوں کی عمیق خاموشی۔ بانس کے جھنڈ کے نیچے تالاب کے کنارے کنارے چلتے ہوئے اس نے سوچا (تالاب باغ کے آخری سرے پر تھا۔ جہاں سے آشیانے کے پہلو کے برآمدے کے شیشے کے دریچے نظر آتے تھے چمنی میں سے دھوئیں کی باریک اور بھیگی سی لکیر سکون سے اوپر اُٹھ رہی تھی اور کھانے کے کرے میں جو شور مچ رہا تھا، اس کی آوازیں ہوا کے ساتھ تیرتی ہوئی یہاں تک آ رہی تھیں) آشیانہ۔ اس کی سرخ چھت ہے۔ سفید فریم والے طویل دریچے اور سرخ قالینوں والے برآمدے۔ اس کے باغ میں وادی کے پہلے سفید پھول کھل رہے ہیں اور اس کے کنارے ہمالیہ کی ایک ہو ہاندر بالا رستہ پنا شور کرتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ میرے چاروں طرف نیلا کہرہ ہے اور بارش۔ پھر مستقبل ہے، جس کی طرف ایک پل بنا کر ہم اس پر سے گزرنا چاہتے ہیں۔ لیکن علماء اپنی بحثیں خود نہیں سمجھ پاتے اور سیاستدان اور فلسفی مسخروں سے زیادہ فضول ہیں۔ چنانچہ میں ان ہرے جھنڈوں کے نیچے ٹہلتا ہوں۔ جہاں سرخ بالوں والی لڑکیاں گٹار بجاتی ہیں۔ ہمارے پاس تجربہ نہیں ہے اور ہم کتنے کم عمر ہیں۔ لیکن میں اس موسم کے لئے خدائے قدوس کا شکر گذار ہوں۔ اس نے چلتے چلتے پھر چاروں طرف نظر ڈالی۔ کھلتے ہوئے محفوظ پھولوں کا خیال، بدقسمت پتے جو کل ٹوٹ جائیں گے اجرن کے سینے میں تیری آواز۔ سڑکیں۔ جن پر ہم نے اپنے گھوڑے تیزی سے دوڑائے۔

——— "جب تک ہم اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کرتے" ——— پہلے کے برآمدے میں، گوکو پیتے پیتے عالیہ باجی نے ابا جان سے ایک اور بحث شروع کر دی۔ فواد سامنے کی روش پر سے ٹہلتا ہوا برساتی کی طرف نکل گیا۔ انہوں نے اسے آواز دی،

لیکن وہ آگے جا چکا تھا۔

اتنی خوبصورتی ہے۔ اتنی دیوانگی ہے۔ اس نے جھنجھلا کر اپنے آپ سے کہا۔ وہ روش کی بجری پر سے گزرتا پھاٹک تک پہنچ گیا تھا۔ ملٹری اکیڈمی کے چند کیڈٹ سامنے بھیگی ہوئی سڑک پر سے مارچ کرتے گزرے۔ سڑک کے دونوں طرف چنار کے درخت تھے اور ان کے پیچھے سے راج دنش کا "راج محل" نظر آ رہا تھا۔ وہ سست روی سے چلتا رہا۔ اس کے دونوں جانب ہندوستانی ریاستوں کے راجکماروں کی کوٹھیاں تھیں جو برسوں، مدتوں سے یوکلپٹس کے ان جھنڈوں میں چھپی چپ چاپ کھڑی تھیں اور ریٹائرڈ انگریز اور ہندوستانی عہدے داروں کے "کنٹری ہاؤس" وضع کے مکانات، لکڑی کے فرش، پرانے بھاری فرنیچر، قالینوں اور زرد پردوں والے پُراسرار گھر۔ جن کے چاروں طرف سیب اور بادام کے درخت تھے۔ اور گھاس پر السیشین کتے اطمینان سے سوتے تھے۔ پرنس آف ویلز رائل ملٹری اکیڈمی، جہاں سرکارِ برطانیہ کے جاں نثار افسر تیار کیے جاتے۔ انگلش پبلک اسکول، کیتھولک خانقاہیں۔ جلاوطن امیر کابل کا قید خانہ۔ وائسرائے کا جائے قیام۔ وائسرائے کے گھوڑوں کے اصطبل۔ دیوداروں میں چھپا ہوا رائل ہوٹل جہاں انگریز خواتین چھتریوں کے سائے میں گارڈن چیرز پر بیٹھی الکحل سے شغل کرتیں۔ کرنل بلیس کا اصلی، روحانی وطن۔

فوآد اسی طرح بے خیالی سے سڑک پر، پہاڑی نہر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ نہر کا تیز رو پانی پتھروں پر شور کرتا رسپنا ندی کی سمت رواں تھا۔ سامنے دھندلکے میں چھپا ہوا اونچا نیلا پہاڑ تھا، مسوری، جو شام کو جھلملا اٹھتی (مانو اندر مہاراج روز رات کو اپنی اونچی، اکیلی چوٹیوں پر جی بھر کے دیوالی مناتے ہوں) جہاں سوآئے میں ہندوستان کی مہارانیاں آدھ گز چوڑے بورڈر کی ساریاں اور طویل بندے پہنے، پولا نیگری کے سے بال بنائے مہالکشمی

کے گھوڑوں پر تبادلہ خیالات کریں۔

فواد چلتے چلتے سڑک کے موڑ تک پہنچ گیا۔ چپاتی کی تیز خوشبو اس کی ناک میں پہنچ رہی تھی۔ اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ چند لمحے بعد اس نے اپنے آپ کو راج محل کے دوسرے پھاٹک کے سامنے موجود پایا۔ سامنے سے میرا ایک کتے کو ڈانٹتی بھاگتی آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں آدھا توس تھا۔ اس نے بھی غالباً ابھی ناشتہ ختم نہیں کیا تھا۔

"او ——— ہلو فواد ———" میرا نے پھاٹک پر پہنچتے پہنچتے چلا کر آواز دی۔

"ہلو میرا۔ ہاؤ آر یو؟" فواد نے پھاٹک کی پلیا پر ایک پاؤں رکھ کر پوچھا۔

"فائن۔ ہاؤ آر یو۔ فواد ———" وہ پلٹ کر پھر چلائی "ارون۔ مایا۔ فواد آ گیا۔"

مایا اور ارون برساتی میں سے لان پر نکل آئے۔ راج ونش خاندان بارش سے محفوظ ہونے کی غرض سے صبح کی چائے برساتی میں پی رہا تھا۔

"ہاؤ از آشیانہ ——— سب لوگ ابھی بریکفاسٹ سے فارغ نہیں ہوئے" مایا نے فواد سے اس کے میزبانوں کی خیریت دریافت کی۔ پھر کھانے کے وقت کے لئے تاش کھیلنے یا اسکیٹنگ کرتے یا ریکارڈ بجانے کی خاطر وہ سب آشیانے کی طرف چل پڑے۔

میں نے دریچے میں سے دیکھا کہ راج محل کے پھاٹک میں سے نکل کر وہ سب جا رہے

سمت آ رہے ہیں۔ امتیاز قیادت کر رہا تھا۔ فواد پیچھے پیچھے چپکا چلا آ رہا تھا اور میرا اس سے متواتر سوالات کر رہی تھی۔ لیکن نادرہ کا بھائی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فواد کو نادرہ کے متعلق ہماری غیر ضروری تفصیلات کی ہر وقت اطلاع رہے۔ غالباً وہ میرا سے یہی کہہ رہا تھا اور میرا اس کی ایک نہ سنتی تھی۔ پھر جب وہ سب اندر آ گئے تو ہم نے دوپہر بھر خوب شور مچایا اور تیسرے پہر کو فواد ہمیں چوکو بارز کھلانے پریڈ گراؤنڈ لے گیا جہاں درختوں کے نیچے سفید کرسیاں بچھی رہتی تھیں اور خاموش مزاج انگریز بیٹھے بیئر پیتے رہتے تھے۔ جب ہم چوکو بارز کھا رہے تھے۔ اس وقت ایک اُداس سے اطالوی نے سیکسوفون پہ ایک اداس سا نغمہ بجایا جس کو سنکر سب بہت رنجیدہ ہوئے۔ کیونکہ فواد نے اپنے لئے بیئر کا ایک گلاس اور منگوایا۔ پھر ہم لوگ سینما کی مٹینی دیکھنے گئے۔ کیونکہ ہم کو شام کو سینما دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ فواد کے ساتھ بھی نہیں۔ پہلے ایک فیچر دکھایا گیا۔ اس کے بعد ہم نے پرل وائٹ کے سیریل کا چودھواں باب دیکھا اور گوڈ سیو دی کنگ کے بعد گھر واپس آ گئے۔

تم لوگ کب تک واپس آتے ہو ـــــــ نجم الدولہ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نادرہ نے جگ بابا راج بنش کو لکھا۔ کالج کھلنے میں ابھی اتنے دن ہیں۔ فواد پھر انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔ تمہارے یہاں گیا تھا۔ وہاں سے کہیں اور چلا گیا۔ اللہ کی قسم ہم اتنے بور ہوتے ہیں کہ مسز ہمیسن سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ آجکل اخبار بالکل نہیں پڑھتی۔ گیری کو پڑتک کے تازہ حالات سے واقف نہیں ہوں۔ پدما لکھنؤ اطلا کی کرن جو لاہور میں ہے ـــــــ

بوریت کی وجہ سے اس نے خط مکمل نہیں کیا اور اندر چلی گئی۔ اس کی امی بیگم نسیم احمد ابھی ابھی خواتین کی ایک آل انڈیا کانفرنس کے لیے قیصر باغ گئی تھیں۔ چار اُس نے اکیلے بیٹھ کر پی۔ پھر اس نے رتنا کو فون کیا۔ رتنا سد ھا نتا، یونیورسٹی کے ڈین کی ہیانسٹ بیٹی بھی اس وقت گھر پہ نہ تھی اور یونیورسٹی کے نہار اشٹرین وائس چانسلر کی گلیمرس بیٹی شگفتلا سے ملنے گئی ہوئی تھی، جس نے ایک زندہ جیتے جاگتے رُوسی بالشویک سے شادی کی تھی۔ نادرہ نے شگفتلا کو فون کیا۔

"ہم عطیہ کے یہاں جا رہے ہیں۔ فوراً وہاں پہنچو۔" شگفتلا نے بشاشت سے کہا۔

عطیہ۔ اگر آپ نے لکھنؤ نہیں دیکھا تو گویا دنیا میں کچھ نہیں دیکھا اور لکھنؤ میں عطیہ کو نہیں دیکھا تو گویا لکھنؤ میں کچھ نہ دیکھا۔ یہ ایک مشہور مقولہ تھا۔ ہیڈی لیمار سے زیادہ

حسین عطیہ نے اسی سال یونیورسٹی میں ٹوپ کیا تھا۔

وہ تیار ہو کر نیچے اُتری تھی جب فواد کی آواز ہال میں گونجی۔

"اُلو کے خالو۔ کب آئے"؟ نادرہ نے تیزی سے زینہ طے کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس قدر بوریت پھیلا رکھی ہے تم نے" فواد نے چاروں طرف دیکھ کر شکایتاً کہا۔ "اب کس کا پیڑا لوٹنے جا رہی ہو"؟

"عطیہ ---- ابھی آتی ہوں ایک منٹ میں"۔

"شکنتلا اور رتنا کو ابھی میں نے اس طرف جاتے دیکھا ہے ---- سب کو میرا پیار دے دینا" بعد میں اس نے اضافہ کیا اور خود سیڑھیوں پر بیٹھ کر نادرہ کو پھاٹک سے باہر جاتے دیکھتا رہا۔

چنانچہ وہ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد پھر فواد کو اپنے باپ کے گھر، اس نجم الدولہ ہاؤس میں موجود پا رہا تھا۔ جگنوؤں کا، مکانوں کا سحر۔ برآمدے میں چائے کا سامان رکھا تھا۔ باورچی خانے میں اُلو کے لئے سوپ تیار ہو رہا تھا۔ زندہ رہنے کا عمل۔ اب مستقبل اس کے سامنے پھیلا تھا۔ اس فضا کے پرے۔ اس شام کے اندھیرے میں سارا شہر خاموشی سے اس کے سامنے بکھرا ہوا تھا۔

سیڑھیاں اُتر کر وہ باغ میں آ گیا۔ سوئمنگ پول کی دوسری طرف، سید علی ظہیر کی کوٹھی میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اُوپر کی منزل میں اس وقت غالباً "انگارے" کے مصنفین بنّے بھائی کی نئی کتاب "لندن کی ایک رات" کا ذکر کر رہے تھے۔ درختوں کے پرے عطیہ کے ہاں رتنا واگنر کا کارنیول بجا رہی تھی۔ اشوک کے جھنڈ میں چھپے ہوئے آرد۔

اسکول کے اسٹوڈیو میں خستگیر مینڈیکا کا پورٹریٹ بنانے میں مصروف تھے۔ ندی کے دوسرے کنارے، نمبر اکیس، فیض آباد روڈ پر وہ سب دہرہ دون اور غازی پور سے اپس آچکے تھے اور پچھلے دالان میں ہسٹیلا عباسی اور اس کے خاندان کی دوسری لڑکیاں جو ریاں الاپ رہی تھیں، موری آج جلے چلاہے کل ——— اور کیسے کہ آؤں پیا توری اٹریا، مگھیا کی پڑتی پھواررے ——— یہ وہ لوگ تھے جن کے ہاں ماحول کا اثر اور روٹین قائم رکھنے کے لیے نقرئی شمعدانوں میں جلتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی میں وعظ میں ہوتی تھیں اور غالب و ناسخ کے ایک ایک شعر پر بحث کرنے میں ساری رات گزار دی جاتی تھی۔

یہ نیا لکھنؤ تھا۔ لیکن اکبر برج کے پار فسانۂ آزاد، مرزا رسوا اور اودھ پنچ کا لکھنؤ بھی ابھی زندہ تھا۔ جس میں پتنگوں کی مخفلیں جمتیں۔ چین و جاپان کی اڑتی۔ مسولینی کی اوبیس بابا پر چڑھائی کا ذکر خیر ہوتا۔ بٹیروں اور کنکووں کے معرکے ہوتے۔ ان کی زندگیوں میں اداسی اور مایوسی تھی لیکن یہ وہ خوش باش لوگ تھے جو اپنے دکھوں کے باوجود دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے، جو کبیر کے دوہے اور انیس کے شعر پڑھتے پڑھتے عمر بتا دیتے اور مرتے وقت بھی ضلع جگت سے باز نہ آتے۔ مختلف استادی گھرانوں کی گائیکی کا تقابل، یا مشاعروں کا معرکہ ان کے لیے گویا زندگی و موت کا سوال تھا۔ فسانۂ عجائب کا طلسم ابھی باقی تھا۔ بیگمات مٹی اور حنا کا عطر استعمال کرتی تھیں سکندر باغ اور حضرت گنج کی ٹھنڈی سڑکوں پر انگریز اب بھی گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے ——— پہلی جنگ عظیم کے بعد سے نئے لکھنؤ نے نہایت اطمینان اور آسائش کے ساتھ جنم لیا تھا۔ ادبی ہنگامے، سیاسی زور آزمائیاں،

مذہبی جھگڑے اسی سرزمین سے شروع ہوتے یا یہاں آکر دم توڑتے۔ ادبی حلقوں میں میرانیس کا بول بالا تھا۔ اقبال پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ ترقی پسندی کی تحریک نے وہیں سے بھُس میں چنگاری دکھائی ——— اودے شنکر کی وجہ سے ہندوستانی رقص کی تجدید کا چرچا بھی شروع ہو گیا تھا۔ میرس کالج، جنوبی ہند سے قطع نظر، ملک کا سب سے بڑا موسیقی کا مرکز تھا۔ چند گنے چُنے خاندان تھے، جو اوپری طبقے کی سوسائٹی کے منظر پر حاوی تھے۔ ان کے لڑکے ولایت جاتے تھے اور اکثر جرمن یا فرنچ بیویاں لے کر واپس آتے تھے۔ امریکہ کوئی نہ جاتا تھا۔ صرف ڈاکٹر سید حسین گئے تھے۔ ایک آدھ لبرل قسم کی لڑکی لیڈز جاکر تعلیم کا ڈپلوما لے آتی تھی اور اس کی تصویر السٹریٹڈ ویکلی میں چھپتی تھی۔ چھتر منزل کلب کی ممبرشپ خاصے کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ انگریز گورنر اور اس کی بیوی کے سروں کے گرد نور کے ہالے تھے۔ آئی سی ایس اور انڈین پولیس میں گلیمر ہی گلیمر تھا۔ خصوصاً انڈین پولس کی زندگی نہایت رومینٹک سمجھی جاتی تھی۔ گھوڑے۔ شکار۔ ڈاکو۔ ہندو مسلم بلوے۔ فوج میں ڈیرہ دون اور سینڈ ہرسٹ کے تربیت یافتہ گنے چنے ہندوستانی نوجوان تھے۔ ایکٹرسوں میں گریٹا گاربو اور ملیسی جینز کو پسند کیا جاتا تھا۔ ہریندر ناتھ چٹو پادھیا کی انگریزی نظمیں شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ تعلیم کا معیار بے حد اعلیٰ تھا۔ ازابلا تھوبرن کالج کے سربفلک یونانی ستونوں والے ایوانوں میں نہایت منتخب اور مخصوص لڑکیاں داخل ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی میں گنتی کی لڑکیاں پڑھتی تھیں لیکن سب بہت قابل تھیں۔ لڑکے اور پروفیسران سے تھر تھر کانپتے تھے ———

یہ زندگی کے اس پھیلے ہوئے منظر کا محض ایک رُخ تھا۔ صرف وہ سطح جہاں قدیم و مسلم

اس شام۔ اپنے باپ کے گھر کی اونچی سفید سیڑھیوں پر کاہلی سے بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں
کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہر چیز اس کے لئے بیک وقت شخصی تھی اور غیر شخصی بھی۔ ہر
چیز بہر حال اس کی اپنی تھی۔ یہ اس کی مخصوص دنیا، جس میں وہ ہمیشہ اسی طرح جیتے
جائے گا۔ اس کے باپ کا گھر۔ اس کا باغ۔ اس کا کیمبرج۔ اس کی مصوری۔ اس کے
دوست۔ ہر چیز اس سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ نہ غیر مبہم تھی۔

لیکن مصیبت یہ تھی۔ سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے اس کو احساس ہوا کہ جو چیزیں اس کی
اپنی ہیں وہ اس قدر ذاتی ہیں اور بے حد واضح ہیں اور اسی لئے تکلیف دہ ہیں۔ یہ جو
چیزیں اس کے اس پس منظر سے تعلق نہیں رکھتیں ایسی دوسری دنیا کی ہیں، جس کا وہ باشندہ
نہیں۔ جو محض پیش منظر کی حیثیت سے اس کے قدموں میں بکھری ہوئی ہے ملال کو، اس
اندھیرے کے پردے، غیر مبہم رہنا چاہئے۔ لیکن وہ بھی بے حد واضح بے حد عیاں ہیں اور
اس لئے بے انتہا تکلیف دہ ہیں۔

اس وقت اس نے خیال کیا۔ میں جو اب تک معاشیات، اور پولٹیکس کا طالب علم
رہا ہیں حرکت اور حیات، عمل اور رد عمل، کے ان دھاروں سے کس طرح الگ ہو جاؤں
اور غالباً رہوں گا۔ اسے یاد آیا، گویا یہ ایک بھولا ہوا خیال تھا حالانکہ جو اسے ہر وقت
یاد رہتا تھا کہ معاشرے کی طبقاتی سیڑھیاں جو نیچے کی طرف اترتی تھیں، وہاں اس
سے کیسی ہیبت ناک بے روزگاری اور مصیبت اور پریشانی کا دور دورہ تھا۔ ہزاروں
کی تعداد میں اس ہی کی طرح کے دل و دماغ والے لیکن کم خوش نصیب نوجوان درسگاہوں
سے نکل رہے تھے اور مغرب کے فلسفوں نے ان کو جس یوٹوپیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہاں

سے سینے نیل، مرام ان کو واپس لوٹنا پڑ رہا تھا۔ جس یورپ میں انہوں نے ریاض سے ساتھ انتہائی اطمینان بخش اور فیشن ایبل بوہیمین زندگی گذاری تھی، وہاں پر اب ہٹلر کے عروج نے خوف اور ذہنی بے اطمینانی کا دھندلکا سا سایہ میں بکھیر دیا تھا۔ اس کے پیارے دوست آئیر لکیشن کی قوم پریشان تھی۔ کیونکہ ایمپائر خطرے میں تھی۔ ڈپریشن نے ہمتیں اور استقلال شکستہ کر دیے تھے۔ عوامی محاذ قائم کیے جا رہے تھے۔

یورپ کی ان انٹلکچویل اور سیاسی تحریکوں کا ہلکا سا اثر رفتہ رفتہ یہاں بھی آ رہا تھا۔ جن میں فواد نے اپنے کیمبرج کے زمانے میں حصہ لیا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی جنم لے چکی تھی۔ لیکن وہ سارے افراد جو انتہائی جوش و خروش یا انتہائی ذہنی سکون کے ساتھ اپنے آپ کو انقلابی کہتے تھے، اس وقت کانگریس میں شامل رہتے اور اسی کے پنڈالوں میں بیٹھے بیٹھے لمبے بازو کو کوستے تھے۔ ان کی اپنی کوئی انفرادیت نہ تھی لیکن ملک کے سارے عظیم ترین انٹلکچوئیل اس نئی اجتماعی آئیڈیالوجی کی طرف کھنچتے چلے جا رہے تھے۔ اس میں جو نئی امید، نیا پیغام تھا، دنیا کے سارے بڑے انٹلکچوئیلز کی طرح انھوں نے اس کی کشش کو محسوس کر لیا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ ملک کے ایک عام انقلابی کا سیاسی شعور ابھی تک بہت پیچیدہ تھا۔ ہر نکتے کی وضاحت کے لیے وہ ماسکو کی طرف دیکھتا۔ اس کو یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے اپنے ملک کی ضروریات اور دکھ کیا ہیں۔ اس کے برخلاف یورپ کے ہر سوچنے والے انسان نے محسوس کر لیا تھا کہ فاشزم کا خطرہ کیا ہے ——— نہرو جی بھی بڑے پکے اینٹی فاشسٹ تھے۔ مسولینی سے ملنے سے انکار کر چکے تھے۔ ملک کے اٹھتے ہوئے نوجوان طبقے کے محبوب گرو اور آئیڈیل تھے۔

ان تحریکوں، ان محاذوں اور ان تصورات کا آنے والے برسوں میں کیسا دلخراش انجام ہونے والا تھا اس کی اس وقت کسی کو اطلاع نہ تھی۔

کیا ہوچکا ـــــ کیا ہوگا ـــــ ہم کدھر جائیں گے ـــــ باغ کے اندھیرے کو بے چینی سے دیکھتے ہوئے اس نے ہزارویں بار اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر وہ پیر جھٹک کر کاہی سے کھڑا ہو گیا۔ اور ٹہلتا ہوا باغ کی سڑک پر آ گیا۔

پھاٹک پر اسے اپنی امی مل گئیں جو اسی وقت قیصر باغ سے لوٹ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ وہ مکان کی طرف واپس لوٹا۔

گیلری کی میز پر اسے ریاض کا خط رکھا ملا جو شام کی ڈاک سے آیا تھا۔

۷

آل انڈیا ویمنز کانفرنس کے سیشن کی اس نشست میں آج فواد کی امی بیگم نسیم احمد نے چند نہایت اہم تجاویز پاس کروائی تھیں۔ دن ان کا آج سارا نہایت مصروفیت کا گزرا تھا اور ابھی چند روز اس گہما گہمی کے باقی تھے۔ مہاراشٹر، مدراس، بنگال اور حیدر آباد دکن کی خواتین شہر میں آئی ہوئی تھیں۔ لیڈی کیلاش سری واستوا، مسز لکشمی مینن، ایم ایل اے اور ایم ایل سی خواتین۔ اگلے اتوار کو وہ کانفرنس کی مندوبین کی دعوت کر رہی تھیں اس کے لئے ابھی انہیں بہت سے فون کرنے تھے۔ خط لکھنے تھے۔ پھر انہیں اپنی وارڈ راحیل کے نئے اُستاد کا انٹرویو لینا تھا اور طے کرنا تھا کہ اس ٹرم میں اسے کیا کیا پڑھایا جائے اور اس کے لئے انہیں کئی ماہرِ تعلیم خواتین و حضرات سے تبادلہ خیالات کرنا تھا۔

بیگم نسیم احمد، ہماری امی، رانی بلبیر سنگھ اور مسز سوشیلا دیوی راج ونش، ہماری ممی، اس طبقے کی مثالی نمائندگان تھیں، جس نے اپنے فیوڈل اور ڈمی جنٹری ہونے پر ذرا قطعاً نادم ہونا تو سیکھ لیا تھا۔ لیکن دراصل اپنے اُوپر سخت نازاں تھا۔ سرسید کی تحریک کے بعد سے ہی اس طبقے کی خواتین کے دلوں میں اللہ تعالٰے نے سوشل اور قومی ریفارم کی سچی لگن پیدا کر دی تھی۔ وقتاً فوقتاً نہایت الف لیلوی انداز کی لیڈیز کانفرنسیں منعقد کرنے کے علاوہ پچھلے تیس پینتیس سالوں میں انہوں نے واقعتاً حیرت انگیز حصّہ اُردو لٹریچر کی ترویج و ترقی میں لیا تھا۔ ان کا پریس اتنا طاقتور اور با اثر تھا کہ اکثر اپنی نظموں، ناولوں اور مضامین

کے ذریعے رجعت پسند مردوں کے بخیے ادھیڑتا رہتا تھا۔ امی نے چودہ سال کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند اصلاحی ناول لکھا جس کی ہیروئن اختر النساء بیگم نے مردوں کے معاشرے کے مظالم کا نہایت عقلمندی سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتحمند ہوئی۔ عموماً مرد امی کے ان ناولوں میں نہایت دغاباز، ریاکار اور بیہودہ دکھائے جاتے تھے۔ ہیرو بے حد فرشتہ سیرت ہوتا تھا۔ امی کے یہ سارے ناول اس طبقے کے ایسے منظر کی بہت ہی عمدہ عکاسی کرتے تھے جس نے پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں سلطنتِ عثمانیہ کے اونچے طبقے کی طرح یورپین تہذیب اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ لڑکیاں پردے میں تھیں لیکن یورپین گورنسیں انہیں انگریزی پڑھاتی اور پیانو سکھاتی تھیں۔ امی اپنی شادی سے پہلے شہنشاہ ایڈورڈ کے زمانے میں رائج الوقت ایڈورڈین وضع کے سائے پہنتی تھیں اور اپنے والد کے انتہائی مرصع قسم کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر دوسری تہذیبی بہنوں سے خط و کتابت کرتی تھیں۔ ز۔ خ۔ ش۔ اسی دنیا کی ایک فرد تھیں۔ اکبر الہ آبادی بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور زیادہ دلچسپیاں اور مسائل پیدا ہوئے۔ مثلاً قومی تحریک، عدم تعاون وغیرہ۔ ان بیگمات نے اپنے اطلسی فرشی پائجامے اور بنارسی ساریاں ترک کر کے کھدر پہننا شروع کیا۔ گو اس کھدر میں بھی ساری نفاستیں اور تازہ ترین فیشن ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ امی نے خود کھدر پہننے کے علاوہ ہماری گورنس مس کیتھلین چینوک کے لئے کھدر کے فراک بنوائے تھے۔ خواتین کی سرگرمیوں کے مرکز لکھنؤ، علی گڑھ، دہلی، الہ آباد اور حیدر آباد دکن تھے۔ آج سے تیس سال پہلے پردہ ترک کرنے میں انہی لوگوں نے پہل کی۔ ہندو مسلم سوال پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ رانی بلبیر سنگھ، لیڈی سریواستو اور بیگم نسیم احمد کی زندگیوں کے مسائل بالکل یکساں تھے

سیاسی کشمکش اور انتشار اور روزمرہ کی زندگی کی تکالیف اور معاشی مجبوریوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اوپر کا طبقہ ان مصیبتوں سے محفوظ اور بہت بلند تھا۔ لہٰذا وہاں پر مکمل امن تھا اور مکمل مفاہمت۔

ان خواتین کی مختلف اور متنوع مصروفیات تھیں۔ انکی سیاست اور ادب میں دلچسپی لینے کے علاوہ برج میکنگ میں ماہر فن تسلیم کی جاتی تھیں۔ مسز شیری میوزک کلب سے لوٹنے کے بعد جہاں انہوں نے ایک آدھ بار رام رام کرنے کے بعد ناک بند کرکے الحمد بھی پڑھ ہی لی تھی، برابر پوجا کرتی تھیں، صوفی آدمی تھیں، انہیں قوالی۔ نعتیں اور بھجن یکساں آنکھ بند کرکے سنتی تھیں۔ میاں بیویوں کے جھگڑے چکانے میں بیگم نسیم احمد کا کوئی ثانی نہ تھا۔ رانی طاہر سنگھ کو اتنا ہی ملکہ جھگڑے کروانے میں حاصل تھا۔ لیڈی مترا نے ایک روز جاکر بھرے روشن آرا کلب میں ایک کرنل صاحب کی پٹائی کردی تھی جو اپنی بیوی سے بہانہ کرکے وہاں پہنچے ہوئے کسی انگریز خاتون کے ساتھ محوِ رقص تھے۔ سیاسی طور پر یہ سب نہایت انٹی مرد تھیں یعنی یہ کہ مرد بڑے ظلم کرتے ہیں۔ ہندو عورتوں کو حقِ طلاق ملنا چاہیے۔ مسلمان عورتوں کو خلع میں زیادہ آسانی ہونی چاہیے۔ پنجاب میں مسلمان لڑکیوں کو وراثت سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

عملی طور پر ان سے زیادہ شوہر پرست بیویاں کہیں نہ رہی ہوں گی۔

خطوط لکھتے لکھتے بیگم نسیم احمد کو خیال آیا کہ راحیل کا کوٹ اور شرٹ ابھی درزی تیار کرکے نہیں لایا اور خانساماں نے آج گوشت کی قیمت میں پھر چیٹنگ کی ہے اور جھاڑو پیٹے ملو نے خان بہادر صاحب کا پیچوان اب تک تازہ نہیں کیا۔ آل انڈیا کانفرنس کو یکسر فراموش کرکے وہ باورچی خانے کی طرف لپکیں۔

۸

بیگم نسیم احمد کے کمرے سے باہر چلے جانے کے بعد راحیل پیچھے سے اندر آئی اور میز پر رکھے ہوئے خطوں اور پھولوں کو خوشی سے دیکھنے لگی۔ (اکثر وہ خالی کمروں میں جاکر بیٹھ جاتی اور چیزوں کے خاموش وجود کو محسوس کرتی رہتی) ایک خط لندن سے آیا ہے۔ اس نے سمندر کے اتھاہ پانی اور بادبانی جہازوں اور بحری قزاقوں کا تصور کیا (حالانکہ اس کی جغرافیہ بہت خراب تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا آجکل بادبانی جہاز اور قزاق دونوں ڈھونڈے سے نہ ملیں گے) وہ ریاض کا خط تھا۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ ریاض کون ہے اور کس کا خط ہے۔ پھر کھڑکی کے پاس جاکر اس نے ایک میز کی بلور کو چھوا جس پر ناشپاتیاں رکھی تھیں۔ جن پر نیلگوں سایہ پڑ رہا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ وہ اپنا گلابی پارٹی فراک پہنے برف پر چل رہی ہے۔ بیگم نسیم احمد کی لکھنے کی میز پر اُس کی ممی کی تصویر رکھی تھی۔ اس نے اس تصویر پر کوئی فوری توجہ نہ کی اور برف پر چلنے میں مصروف رہی۔

کچھ عرصہ قبل اس کے بابا کا انتقال ہوا تھا۔ وہ صوبے کا ایک مشرقی ضلع تھا جہاں پر وہ سب رہتے تھے۔ اس کی ساری سہیلیوں کے باباؤں کی طرح اس کے بابا بھی بڑے زوروں کی عدالت کا اجلاس لگاتے تھے۔ اُن کے مرنے کے بعد اُسے علی گڑھ بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں وہ چار مہینے ہی رہ پائی تھی کہ اُسے ممتاز آپا نے اپنے پاس بلاکر رسان سے بتلایا تھا کہ اُس کی ممی بھی ختم ہو گئی ہیں۔ پھر اُسے اُس کے ایک ماموں جو ماموں کم اور نائٹ زیادہ

تھے، اسے اپنے ہمراہ لکھنؤ واپس لے آئے تھے، اور مسلم اسکول میں انہیں داخل کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس سنبھالے ذمہ داری کے شدید احساس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی مس مانیٹر کے پاس گئی تھی، جو مسلم اسکول کی سنہری بالوں والی گلیمرس پرنسپل تھیں۔ کچھ دنوں بعد اس کی خالہ زاد بہن طلعت باجی کی شادی ہز ہائی نس آف ماتا بھوم سے ہو گئی اور ایک روز اس کا سامان ایک اسٹیشن ویگن میں رکھا گیا اور وہ مسلم اسکول کے ہوسٹل سے ماتا بھوم پیلس آ گئی۔ جو ڈالی باغ کے ایک کونے پر تھا۔ اور اب اسے لورٹیو میں داخل کر دیا گیا جہاں اسٹیلا اور ربیرا پڑھتی تھیں۔ پیلس میں بھانت بھانت کی مخلوق تھی۔ سنہری منقش چھتوں میں جھولنے والے صوفے لٹکتے تھے جن میں دن بھر طرح طرح کے انسان جھولا جھولتے اور گڑگڑی پیا کرتے۔ ہز ہائی نس کی پہلی دو سینئر مہارانیاں تھیں۔ مصاحبین۔ لیموں نچوڑ مسخرے۔ راحیل کو اس سارے ماحول سے دلی نفرت تھی۔ لیکن اس کو وہیں رہے جانا تھا۔ پھر ایک دن اس نے اخبار میں دیکھا کہ اس کے ناٹے ماموں نے جو حیدرآباد دکن میں رہتے تھے حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک مہری نے اسے بتایا کہ رات کو چھوٹی مہارانی کی ہز ہائی نس سے خوب ٹھن چکی ہے اور اب وہ مقدمہ لڑنے کے لئے جاتی ہیں۔ دوسرے روز راحیل کے بابا کے دوست خان بہادر نسیم احمد سلور گرے بالوں والے اتنے ہینڈسم بیرسٹر سراج حسین صاحب کے ہمراہ پیلس آئے۔ اور اسے اپنے گھر نجم الدولہ ہاؤس لے آئے۔

”ہاؤس“ پہنچنے کے ساتھ ہی اسے نادرہ سے ملوایا گیا جو اسی روز کالج کی لڑکیوں کے ساتھ اٹلی سے لوٹی تھی اور ملازموں کو ڈانٹتی تھی۔ پھر اوپر سے فواد اترا تھا جو نادرہ

کا بڑا بھائی تھا۔ اس نے جمین پر جھک کر تیزی سے منہ پر چھپکے مارے۔ اور اُسی بزرگانہ شفقت سے اس کی خیریت دریافت کی اور نہایت مصروفیت سے جا بیٹھنے بیٹھ گیا۔ حالانکہ صبح سے شام تک اُسے فرصت ہی فرصت تھی۔ کیونکہ وہ کیمبرج سے واپس آچکا تھا۔ اور دن بھر ڈریسنگ گاؤن پہنے پہنے جارج گرشون کے ریکارڈ بجا بجا کر سنا کرتا تھا۔

پھر ایک روز اپنا گلابی پارٹی فراک پہن کے میرآ کے ہاں گئی تھی۔ بیگم نسیم نے اس کے لئے بڑے اہتمام سے نیلے رنگ کا کوٹ بنوایا۔ "تمہاری بیچاری ممی تمہارے لئے سارا سامان اس طرح رکھ گئی ہیں جیسے وہ کسی سفر پر جا رہی ہوں۔"

"اہم ـــــ اہم ـــــ" خان بہادر صاحب نے [illegible] "تم کو ہرگز ہرگز راحیل بیٹیا کے سامنے ایسی غمگین باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کی ممی مر چکی ہیں ـــــ"

"اچھا ـــــ" بیگم نسیم ذرا سٹ پٹا کر چپ ہو گئی تھیں۔ (وہ لوگ بے انتہا پُر خلوص تھے) "بیٹا وہاں پہنچ کر تم مسز راج بخش سے کہنا نمسکار سیو شیوری موسی ـــــ" اور ان کو بھی خود سلام کرنا۔ وہ تم سب سے بڑا ہے۔

فواد ایک کونے میں ناقدانہ نگاہوں سے یہ سب دیکھتا تھا۔ مستقل تعلیم و تربیت ـــــ اس سے بور ہو کر کہا تھا۔

فیض آباد روڈ پر ان گنت بچے راحیل سے بے حد گرمجوشی سے ملے۔ ان گنت لڑکے اور لڑکیاں سیلر سوٹ۔ یونیفارم۔ کاغذی ٹوپیاں۔ غبارے۔ بلبل ہنگامہ۔ "میں تمہیں ایک ٹرین دوں گا۔ جس پر بیٹھ کر تم گرین لینڈ جانا۔" علی نے اس سے کہا۔ "یہ میرے چچا

میاں ہیں۔ یہ خالو ابا۔ ممانی۔ زینب خالہ۔ تمہارے بھی بہت سارے اس طرح کے رشتہ دار ہیں نا ——؟"

"وہ دراصل میرے رشتہ دار نہیں ہیں۔" راحیل نے بے حد رازدارانہ طریقے سے اُسے بتلایا۔ "وہ میرے بنے ہوئے رشتہ دار ہیں۔"

"بنے ہوئے —— ؟ اچھا تم سب Let's Pretend کھیلتے ہو۔ اخوہ کس قدر کا مزا آتا ہو گا۔" میرا نے خوش ہو کر کہا تھا۔ "یعنی یہ کہ فرض کرو فواد تمہارا کزن ہے۔ جبکہ وہ نہیں ہے۔ اور یہ فرض کرو ہاؤس تمہارا گھر ہے (نجم الدولہ ہاؤس محض "ہاؤس" کہلاتا تھا) جبکہ وہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ ہاؤ نائس —— اسٹیلا سنو راحیل کے کیسے مزے ہیں۔ ہاؤس میں وہ مستقل Let's Pretend کھیلتی ہے ——!!"

کمرے کی تنہائی میں وہ مسرت کے ساتھ بھولا الوں کو ادھر اُدھر اٹھا کر رکھتی رہی۔ اب بیگم نسیم باورچی خانے کا ٹرپ کر کے واپس آرہی تھیں۔ پانچ بج چکے تھے۔ جو اُن کے ریاضی سیکھنے کا وقت تھا۔ اپنے کمرے سے کتابیں لے کر وہ پچھلے برآمدے میں آگئی جہاں ماسٹر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔

ماسٹر صاحب دراصل یونیورسٹی کے ایک بہت ہی Bitter قسم کے ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ نازرہ کیننگ کالج میں ان سے دو سال جونیئر تھی۔ وہ اُس سے بھی نفرت کرتے تھے۔ فواد کی صورت سے بیزار تھے۔ پورا نجم الدولہ ہاؤس اُن کی برداشت سے باہر تھا۔

راحیل کو دیکھ کر انہیں اور غصہ آتا تھا۔ عجیب خوفناک لڑکی ہے۔ یہ سب لوگ انتہائی

خوفناک اور فضول ہیں۔ ان کے زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے۔ تمہارا کیا فائدہ ہے ؟ وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھ کر دل میں سوال کرتے۔ وہ چپکی بیٹھی جیومیٹری سے الجھتی رہتی۔

برآمدے کی پہلی طرف سفید ستونوں کے سائے میں سے گزر کر بیگم نسیم اور مسز شیوری موسی اور امی باغ میں اتر گئیں۔

بیگم نسیم ان سے راحیل کے نئے استاد کے متعلق تبادلہ خیالات کر رہی تھیں جو کل سے ستار سکھلانے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔

"بچوں کی تربیت —— کافی ناکامیاب ہو رہی ہے۔" مسز شیوری موسی نے ایک اینٹ گرائی۔

"کیوں نہ راحیل کو بھی میرس کالج میں داخل کر دیا جائے اگلے سال سے" بیگم نسیم نے مطالبہ کیا۔

امی یہ سوچ کر ایک سیڑھی پر ٹھٹک گئیں۔ وہ دھوپ میں پیراسول لگائے لگائے ابھی ساری داستان سننی ہے کہ نادرہ اور فواد کی تربیت کس طرح کی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے بچوں کا تذکرہ اور مس کتھلین بیوی کی شکایتیں کریں گی۔ "فواد —— بھی تہلکہ مچانے میں ماہر معلوم ہوتا ہے۔" بالآخر امی نے باواز بلند سوچنا شروع کر دیا۔

"ہیں نا —— ؟ یعنی بات ای ہے کہ ہم سب گم میں ہیں ——" بیگم نسیم نے کہا۔

"ہم سب گم گیا ہیں ——" امی نے بھی خالص جونپوری لہجے میں اتفاق رائے کیا۔

راحیل ستون کے پیچھے سے ان سب کو باغ میں اترتا دیکھتی رہی۔ یہ ہجوم تھا اور ہجوم اس سے مستقل خفا رہتا تھا۔ اور اُسے بہت زیادہ approve نہیں کرتا تھا۔ دنیا بہت سے فرقوں اور گروہوں میں منقسم تھی۔ مثلاً تربیت دینے والوں کا گروہ۔ بیگمات کا گروہ، فولیو، اور تیرا اور علی اور ارغوان کی دہشت پسند پارٹی۔ یہ سب اس کے خاموش مخالف تھے۔ مخالفین میں بام کے گملے اور برساتی کی ٹھنڈک اور خان بہادر صاحب کی کار بھی شامل تھی۔ حتیٰ کہ اسٹیلا کا ڈیلیسی بھی اکثر اسے اس طرح دیکھتا جیسے راحیل نے اس کی بڑی دل آزاری کی ہے۔

"ریاض لندن سے واپس آ گیا ـــــ" گیلری میں آ کر ہوا میں ایک لفافہ ہلاتے ہوئے فولیو نے دہاڑ کر غالباً نادرہ کو اطلاع دی۔

یہ ریاض بھی، وہ جو کوئی بھی ہے۔ فوراً مخالفین کے اس گروہ میں شامل ہو گیا۔ ہجوم کا ایک اور فرد۔

۹

بھاری پانی کے ایک موڑ پر موٹر جھٹکے سے رُک گئی۔ "فتال! سٹشس ـــــ" اردون نے گرج کر کہا ـــ "پیچھے ایک اور موٹر رکی کھڑی ہے۔ ذرا جھانک کر دیکھو کون لوگ ہیں اپنے پرانے مسوری آئیٹس یا غیر ملکی۔"

"غیر ملکی" میں نے ناک اُٹھا کر ہوا میں سونگھتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید انہیں پٹرول کی ضرورت ہے۔" چند لمحے قبل ایک اور کار گذاری تھی۔ جس میں برجیس عبداللہ، گیتا تھاپڑ اور مس عزیز تھیں۔ پیچھے سے نادرہ آ رہی تھی۔ "کدھر بھاگے جاتے ہو ـــ؟" اس نے چلا کر پوچھا۔

"اردون کو جانا ہے۔ رات کو اس کی ملٹری اکیڈمی میں وائسرائے بہادر آ رہے ہیں۔" تیرا نے جواب دیا۔

"مبارک ہو ـــ" نادرہ نے چلا کر کہا۔

علی جو اب تک نچلی سڑک پر گھوڑا دوڑا رہا تھا منڈیر پر چھلانگ کر اوپر آ گیا۔ "بیٹیا۔ اسٹیلا کے گھوڑے کو ٹکر لگا لے گا! ـــــ" کار کے شیشے سے ناک چپکا کر اس نے جلدی جلدی چند اور ضروری اطلاعات دیں اور پھر تندہی سے اردون کے ساتھ کار کے انجن میں مصروف ہو گیا۔

موٹر چل پڑی۔ نیلے درختوں پہ بادلوں کی دھند تیر رہی تھی۔ جب ہم لوگ آگے بڑھے

تو ہم نے دیکھا کہ 'غیر ملکی' موٹر سفید دھواں چھوڑتی بارلو گنج کی سمت نکل گئی۔

بادل تھے لیکن آسمان دفعتاً سونے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ ریاض نے ہوا کی خنکی اور نرمی کو محسوس کیا (جو موٹر اوپر کی سڑک پر سے گذری تھی اس میں چند کم عمر لڑکیاں اور لڑکے بیٹھے تھے۔ لڑکیوں نے گہرے نیلے اسکرٹ اور نیلی فرنچ 'بیرے' ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ لڑکے کسی انگریزی کالج کے یونیفارم میں تھے۔ یہ لوگ بے انتہا انہماک سے کار کا انجن ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ اور پاس سے گذرنے والوں کو ایسی بے اعتنائی اور بشاش قسم کی بے نیازی سے دیکھ رہے تھے گویا ساری کائنات کے مالک ہیں۔ ریاض کو ان کا یہ رویہ بے حد دلچسپ معلوم ہوا جس وقت یہ لوگ ہاتھ ہلا کر پاس سے گذرنے والی ایک موٹر میں بیٹھی کسی اور لڑکی سے چلا کر بات کر رہے تھے اس وقت ایک سیاہ آنکھوں اور بہت سفید رنگت والا خوبصورت لڑکا اپنا گھوڑا نیچے کھڑا کر کے ان کے قریب آیا اور پورب کے لہجے میں اس نے چند باتیں کیں اور پھر وہ بھی انجن میں مشغول ہو گیا۔ پورب کی یہ زبان بھی ریاض کو بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ لاہور میں اس نے صرف گوالوں اور دھوبیوں کو جو 'بھیا' کہلاتے تھے، اس زبان میں بات کرتے سنا تھا اور کیمبرج میں اسے اودھ کے جو لوگ ملے تھے وہ نہایت نستعلیق اردو میں اس سے گفتگو کرتے تھے کچھ دیر بعد اس کی کار سوائے پہنچ گئی۔

صبح کو فوراً نسیم احمد کا فون آیا۔ میں آرک سے بول رہا ہوں سمجھے میاں۔ آرک یعنی کشتیِ نوح ہے۔ جو ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر رکی ہوئی ہے (اور جس وقت تک انقلاب نہ آئے گا یونہی رکی رہے گی) اور اس کشتیِ نوح میں وہ سب جمع ہیں جنہوں نے کل تمہیں پٹرول نہ دیا تھا۔

کیونکہ اُن کو پتہ نہ تھا کہ تمہیں پیٹرول کی ضرورت ہے، اور تم، تم ہو۔ اور اس پیٹرول نہ دینے کے سلسلے میں وہ انتہائی معذرت خواہ اور شرم سے پانی پانی ہیں ـــ

لیسپور رہ گئی وہ پھر بار پہ آن بیٹھا۔ آرگ۔ اُس نے یہ نام دل میں دہرایا۔ چنانچہ اس صوبے کا ایک اور خاندان جس کی بیگمات فارسی میں شعر کہتی ہوں گی، ناول لکھتی ہوں گی اور لیجسلیٹو اسمبلی کی اسپیکر ہوں گی ـ

قریب کی ایک میز پہ الہ آباد کا ایک مشہور کنبہ بیٹھا تھا۔

"بھابی دلہن نے یہ بیلٹیں اب کی مرتبہ پیرس سے خریدی ہیں ـــــ" ایک لڑکی تفریحی لہجے میں دوسری کو بتا رہی تھی۔

"ارے میاں سعید" دوسری میز پر سے آفاق نے پکارا۔ "ابھی شاردا نگل میں لیلا ڈیسائی کو کافی پلاکر آرہا ہوں۔ خورشید تمہارے متعلق پوچھ رہی تھی" ـــــ

بار کے اسٹول پہ بیٹھے بیٹھے اُس نے اتنی وہسکی پی لی تھی کہ باہر چمکتی ہوئی خنک نقرئی دھوپ اس کی آنکھوں کو نہایت درد معلوم ہوئی۔ ایک مرتبہ اُس نے تمنا کی تھی کہ وہ خود کسی کونے میں چھپ کر اپنے آپ کو چلتا پھرتا، باتیں کرتا، وہسکی پیتا، ستار دیکھے) لاؤنج میں لوگ اپنے اپنے وجودیں گھل کر بے حد آرام سے بیٹھے تھے۔ باتیں۔ اور جنبش۔ قطرے، جو ادھر اُدھر پھسل رہے ہیں۔ ڈرپ۔ ڈرپ۔ ڈرپ۔

"ـــــ چنانچہ میں نے سر ہیری کو جواب دیا" برابر کی میز پہ آفاق نے اپنی بات ختم کی اور نہایت طمانیت سے اپنے جوتوں کو دیکھتا رہا۔

ریاض پہلی مرتبہ مسوری آیا تھا۔ اسٹول پر سے اُتر کے وہ کاہلی سے قدم رکھتا ہال کے ایک ستون کے قریب گیا۔ اس نے دیکھا کہ نواب کورٹ یارڈ کو عبور کرتا زینہ

پر آ رہا ہے۔ کھانے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور خود کو دیکھ کر خاموشی سے مسکرایا۔ اس صوبے اور اس مجمع سے اسے نسبتاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر پدما یہاں آئی ہوتی۔ اس نے خیال کیا۔ لیکن پدما حسبِ معمول اپنے سیٹ کے ساتھ شملہ گئی ہوئی تھی۔ اس مجمع کی بیگانگی میں اس نے اپنے کیمبرج کے ساتھی فواد نسیم احمد کو عظمت اور قدرے یگانگت کی نظروں سے دیکھا اور دوبارہ ہنسا۔

۱۰

سوا سمہ کے زینے کی نچلی سیڑھی پر علی ایک قدم اوپر رکھے چونٹوں کی طرح چپکا کھڑا تھا۔ فواد نے اس سے کہا کہ وہ اپنی سسٹم میں سے رات کے سحر کا اثر دور کرنے کی خاطر کھلانے کے کمرے کی طرف جانے کی صعوبت برداشت کرنے والا ہے جہاں وہ اپنے ایک عزیز دوست ریاض الدین احمد کے ساتھ بیٹھ کر گذشتہ زمانوں کی یاد کرے گا۔ لیکن زندگی کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ ہر گذرنے والا لمحہ گذشتہ زمانوں میں تبدیل ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ بیئر کا بل بھی بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن طے شدہ دستور یہی ہے کہ جب دو پرانے دوست مدت کے بعد ملتے ہیں تو جن کے گلاس پر ۔۔۔

علی نے جھنجھلا کر فواد کی مطمئن گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا چاہا۔ کیونکہ اس وقت اس کی خواہش تھی کہ وہ اوپر جا کر ہال کے عین وسط میں قلابازیاں کھائے۔ یا چھت سے اُلٹا لٹک جائے۔ فواد نے اس ارادے کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

علی اور ارجن سیڑھیوں پر کھڑے کورٹ یارڈ کی نیم تاریکی میں قرونِ وسطیٰ کے دو پراسرار کرداروں کی طرح اس اہم تبادلۂ خیالات میں مشغول تھے کہ ارجن راج دنش ان کے قریب آیا۔ وہ ہال پر ٹہلنے نکلا تھا اور اب آرک واپس جا رہا تھا۔ اس نے علی سے کہا کہ کیا تم بھول گئے ہو کہ آج پورنماشی کی رات ہے اور میرا رگھوناتھ کی مورت کے آگے نو دیوتوں کا ناچ ناچے گی۔ علی نے اُسے بتایا کہ وہ اپنے دیوداروں کے پیچھے چھپے ہوئے

کالج میں سے چند گھنٹوں کے لئے بھاگ آیا ہے۔ اور ابھی سینٹ جوزف کے مقدس سلسلے کے افغانی لبادے والے۔ راہب شمعدان لے کر ساری عمارت میں تالے لگانے کے لئے اپنے حجرے سے نکلیں گے۔

جب فواد اپنے اس دوست کی طرف چلا گیا جو اوپر ہال کے ایک ستون کے پاس کھڑا جھلملاتی آنکھوں سے سارے منظر کو دیکھ رہا تھا تو اردون دوبارہ سڑک کی جانب مڑ گیا اور اس کا سایہ چاندنی میں بھیگی بجری پر طویل ہوتا چلا گیا۔ علی نے اس سائے کو دیکھا اور قرون وسطیٰ کے کسی اور اداس اور سنجیدہ کردار کی طرح اپنے بالوں کو اس نے پیشانی پر سے ہٹایا اور آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

اوپر کھانے کے وقت کی موسیقی بھی شروع ہو گئی تھی اور سائے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔

"علی بہادر ——" ایک پیلے بالوں والے متبسم جرمن نے اس کے نزدیک آ کر کہا۔

"ہلو ——" علی نے جواب دیا۔

"آج پورن ماشی کی رات ہے ——" پیلے بالوں والے جرمن نے چہرہ اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھتے ہوئے مسرت کے ساتھ کہا۔ "آج کی رات ہم کو صرف ناچتے رہنا چاہئے۔ دیکھو! ہوا کی چال میں کیسا شانت کا بھاؤ ہے ——" اس نے ہاتھ پھیلائے۔

دو انگریز، جن میں سے ایک ضلع کا کلکٹر تھا، سامنے سے گزرے۔ "ایک جرمن اور ایک ہندوستانی۔ اس وقت دونوں یقیناً سیاست پر بحث کر رہے ہوں گے۔ ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔" موٹے انگریز نے دُبلے انگریز سے کہا۔

"میاں بہترین سیاست تاش ہے ——— اوپر آؤ ———" کسی نے لاؤنج میں سے پکارا۔

سیاہ رنگ کی ساری پہنے، جس کا کنارہ نقرئی تھا، آزوری کھل کھلا کر ہنستی ہوئی پہلو کے ڈرائنگ کے برآمدے میں سے گذر رہی تھی۔ چاندنی کے اس سناٹے میں اس کی ہنسی کی آواز گونجی۔ اس گونج میں مالابار اور کیوبین کے سامنے جھریوں کی خوبصورتی اور زندگی اور آزادی کا احساس مضمر ہوا تھا:

"زندگی ——— دراصل اس قدر ——— زندہ رہنے کے لائق ہے ——— کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تم زندہ ہو ———" جرمن نے اپنے ہٹالے پیلے بالوں کو ہاتھ سے سہلایا۔

علی نے اسے اُنسیت کے ساتھ دیکھا۔ اس وقت، وہ خود، فواد جو اندر جا چکا تھا۔ الدوان، جو اس وقت لمبے لمبے بے پرواہ قدم رکھتا آرکٹ کی سمت جا رہا ہوگا۔ وہ سب اس خنک، مدھم چاندنی میں زندہ تھے۔ اس کا یہ دوست ابھی زندہ تھا، دنیا قائم تھی۔ اس کے پیلے بالوں اور معصوم متبسم چہرے پر چاندنی کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔

"ہیر رو ملی ———" اس نے بوڑھے تکلف سے اسے مخاطب کیا۔ اور "تم بمبئی کب لوٹ رہے ہو ———" اس نے پوچھا۔

ارنسٹ ہیوملی اب تک بمبئی ٹاکیز کے لئے تین فلم ڈائرکٹ کر چکا تھا۔ ان دنوں وہ آزوری کا ٹیچر تھا۔ خالدہ ادیب خانم نے اپنی نئی کتاب میں جس جگہ آزوری کا تذکرہ کیا تھا۔ وہاں پر اس کو امریکن لکھ دیا تھا۔ اس بات سے وہ سخت خفا تھا اور بہت دیر تک بچوں کی طرح منہ پھلائے بیٹھا رہا تھا۔ لاؤنج میں اس وقت یہ کتاب زیر بحث

گفتگو ہی ہو رہی تھی جب وہ یہاں رہی بھی نہ سکے مت سے اڑ کر نیچے اتر آیا۔

"ہونہہ۔ امریکن ——" پھر ارنسٹ کو یاد آیا کہ چاندنی تو سخت گنوار ہے لیکن اس کے باوجود اس ملک کی ساری دنیا کی سیاست کتنی تکلیف دہ ہے۔" اسے جناب آپ بہت نامی گرامی آرٹسٹ ہیں ——" اڈون اسمتھ کا تعارف دوسروں سے کراتا —— اچھا —— لیکن آپ ناقص تو نہیں ہیں" ایک خاتون نے اخلاق سے پوچھا —— "جی نہیں ——" اس نے جواب دیا۔ "تو پھر آپ یقیناً فاسسٹ ہوں گے یا کم از کم کمیونسٹ ——" یہ دونوں خواتین برج میں متواتر ہار چکنے کے بعد کسی زیادہ دلچسپ مشغلے کی خواہش مند تھیں۔

"لیکن اگر آپ کو امریکن سمجھ لیا جائے تو آپ اس قدر ناراض کیوں ہو سکتے مولانا ——" اڈون نے کہا تھا۔

"اور یہ جو تم کو ہندوستانی تہذیب سے اس قدر شدید ہمدردی اور عشق وغیرہ ہے اس نقطے کو خالدہ ادیب خانم نے غلطی سے بہت سراہا ہوگا ——" علی نے دلاسہ دیا تھا۔

"اور بھی اس کا مطلب یہی رہا ہوگا کہ بہر حال، تم سفید فام غیر ملکی ہو جو ہم ایشیائیوں سے یعنی کہ روحانی لگاؤ رکھتے ہو ایک قسم کا ——" اڈون نے کہا تھا۔

"آپ جہنم میں جائیے اور آپ کا روحانی لگاؤ ——" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"پھر سیاست شروع ہوئی" لولو نے ڈپٹ کر کہا تھا یعنی ارنسٹ بروملی پھر تم ڈیپریس ہونا شروع ہوگئے

سیاست اس کا کسی کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ سیاست نے زندگی کو ختم کر ڈالا

ہے۔

حالانکہ میں بہت نامی گرامی فنکار ہوں بحضور والا۔ میں اپنی جان دے کر زندگی کی پرستش کرتا رہوں گا۔

دن بھر وہ لاؤنج کے نصف دائرے میں بیٹھے اس طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ اور اب چاندنی سارے میں پھیل گئی تھی۔ بالآخر یہ ایرن ماشی کی رات تھی۔

علی نے سیڑھیوں کے ٹھنڈے پتھر پر سے ہاتھ اٹھایا "ان صاحب کو جانتے ہو جو ابھی فرانو کے ساتھ اوپر گئے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"بالکل نہیں ——" ارنسٹ نے جواباً کہا۔

اس وقت کتنی پیاری روشنی پھیلی ہے۔ علی نے دوسرے پتھر پر ہاتھ رکھ لیے۔ خنکی جو اس کی انگلیوں میں پہنچ رہی تھی اسے بے حد آرام دہ معلوم ہوئی۔ آ اور آ میرے دل میں ساتھ لے کر چاندنی —— اس نے جی میں کہا۔

"میاں صاحبزادے آج کیا تم انیس سال کے ہو گئے؟" ارنسٹ نے خوشدلی سے سوال کیا۔

علی نے آنکھیں بند کر لیں اس وقت ہفتے کی رات، دس بجکر پچیس منٹ پر، خدا کے متعلق اس کے بڑے عمدہ اور صحیح خیالات تھے۔ مذہب کا تصور نہایت ناقابلِ بیان سکون پہنچاتا تھا۔ گو لیتن بھی بہت خوب تھا۔ یہ انکشاف بھی ہو چکا تھا کہ خدا سے قرب کیبرے دیکھ کر بھی حاصل ہوتا ہے۔ شمپین کیا نفیس شے تھی۔ گو ابھی اس نے شروع نہیں کی تھی۔

"ہاں" اُس نے ارنسٹ کی بات کا بہت دیر بعد جواب دیا۔ "کیونکہ آج نور آتا ہے۔ اور لڑکیاں دیے جلائیں گی اور گربا ناچیں گی ——— آؤ آرک چلیں ———"

وہ احاطہ عبور کر کے مال پر آ گئے۔ اور آرک کی طرف چلنے لگے۔ ان سے ذرا فاصلے پر ارجن تھا جو بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آرک کی چڑھائی طے کر رہا تھا۔ راستے کے سبز اور نیلے پتھروں پر ان تینوں کے سائے بہت لرزہ خیز معلوم ہوئے۔

آرک چھوٹی سی پہاڑی وضع کی کاٹیج تھی۔ جس کے جنگلے سبز لکڑی کے تھے۔ سرخ چھت تھی۔ اس کے برابر میں ایک بہت اونچی چوٹی تھی جس کے دوسری جانب آبشار گرتا تھا۔ آرک کے چاروں طرف نیلے اور کاسنی پھول کھلے تھے۔ برفباری کے زمانے میں جب سڑک سے لیکر پھاٹک تک کا راستہ برف سے مسدود ہو جاتا تو ہم اس پہاڑی پر سے باورچی خانے کی چھت تک ایک پُل کے ذریعے پہنچتے۔ سن اٹھارہ سو بارہ سے یہ مکان اباجان کا بہت عزیز رفیق تھا۔ اب اسکے آس پاس زیادہ بڑے بڑے اور جدید قسم کے مکانات بن گئے تھے۔ لیکن ہم لوگوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ اس کے "اولڈ ورلڈ" وضع میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ لہٰذا نشست کے کمرے کے آتشدان پر اکثر شام کو بے حد اہتمام سے شمعیں جلائی جاتیں۔ فرنیچر سب انتہائی پرانے فیشن کا تھا۔ آشیانے اور راج محل کے ساتھ ساتھ ہم سب کو آرک سے بھی عشق تھا۔ اس کے بدلے میں اگر ہم کو کبھو تھلہ ہاؤس بخش دیا جاتا تو ہم اسے ہرگز قبول نہ کرتے۔

اس سمے ہم سب آگ کے قریب بیٹھے حسبِ معمول اِدھر اُدھر کی "کھینچ" رہے تھے۔

ابا جان دوسرے کمرے میں ایک جلاوطن افغان شہزادے کے ساتھ حسب معمولی شطرنج میں مصروف تھے۔ نادرہ کے ساتھ راحیل بھی لکھنؤ سے آئی ہوئی تھی عالیہ باجی ایک کونے میں کرسی پر اکڑوں بیٹھی مجاز کی آہنگ کی ورق گردانی کر رہی تھیں جو ابھی ابھی پہلی بار چھپ کر آئی تھی۔ برآمدے کے ایک کونے میں لیمپ کی روشنی میں ادیا ماما بھی ایک کینوس مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن نشست کے کمرے میں اتنا شور مچ رہا تھا کہ انہیں بار بار دوسری طرف دیکھنا پڑتا تھا۔

"علی اور ارجن اور ارنسٹ آتے ہیں ——" اسٹیلا نے کھڑکی کے پاس جا کر کہا۔

"ریاض ——؟" عطیہ نے پوچھا۔

"ریاض ؟ —— کون؟" راحیل نے آنکھیں نیم وا کر کے سوال کیا۔ وہ آگ کے پاس نٹنگ میں مصروف تھی۔

آدھی رات پر جب درگشن دیکھنے بوناجی کا ٹیرا —— کمرے کے دوسرے کونے میں میرا نے آہستہ سے گھنگرو فرش پر پٹخے۔ وقت —— اس نے پھر خوف کے احساس کے ساتھ سوچا۔ وقت جو رواں تھا جس طرح آرگ کے پیچھے آبشار تیزی سے گر رہا تھا اور وقت —— جو منجمد تھا جیسے سامنے چوٹیوں پر ہما چاندنی میں جھلملا رہی تھی۔ "ڈیئر، باہر جا رہی ہوں ——" اس نے سب کو مخاطب کیا۔ "چاندنی میں میں نور آترا کا ناچ ناچوں گی جس طرح ہماری پاروتی ناچتی تھیں ——" وہ گھنگرو اٹھا کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔

ازوؔن راج ونشس لمبے لمبے قدم رکھتا برآمدے میں داخل ہوا اور جنگلے پر جھک گیا۔ ظاہراً زندگی سے زیادہ گہری کوئی چیز تھی جو سارے میں رواں تھی۔ بچپن سے بہت سی باتیں تھیں جو وہ خود ہی خود محسوس کرتا آیا تھا اور کسی کو نہ بتا پاتا تھا۔ اب وہ بھی اس نے اندازہ لگایا کہ بڑا ہو گیا ہے۔ جس طرح بنفشے کے پودے کے بڑھنے کا خیال صرف اس پودے کو ہی آتا ہوگا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ میرے چاروں طرف مکمل سکوت ہے، اور مکمل حسن، اور اس سکوت میں حیات کی مختلف آوازیں ادھر اُدھر بہتی جا رہی ہیں، جھرنوں کا شور ہے۔ پھول کھل رہے ہیں، لوگ باتیں کر رہے ہیں، سوچ رہے ہیں۔ آفاق کے اس گہرے سرود کی گونج میں مسلسل سن رہا ہوں۔ اس نے جھنجھلا کر جنگلے کی سبز لکڑی کو ناخنوں سے کریدا۔ میں مقید کر دیا گیا ہوں۔ میں قید ہوتا جا رہا ہوں فطرتاً اسٹکس۔ اس نے ایک طویل فقرہ حسب عادت دل میں دہرایا۔ اس نے میرا کو دیکھا جو نالے کے قریب پتھر پر بیٹھی تھی۔ آبشار کا پانی جو کاشت کے آرکڈ کے پھولوں کی آبیاری کے لئے ادھر لایا گیا تھا، مسلسل روتا رہتا۔ یہ میرا بچپن ہے۔ ازوؔن نے خود کو بتایا۔ اور پھر یہ سب کے سب یہ سارا کا سارا! کمبخت مشہور و معروف حیدر خاندان —— خدا ان سب پر، اور مجھ پر رحم کرے۔

میرا نے وہ پھول جو رات کی ہوا سے خود بخود نیچے آن گرے تھے بالوں میں ٹھونس لیے۔ اور گڑیا کی طرح ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ گویا اب میری پرستش کرو۔

"اُف —— تمہیں اپنے حسن کا کس قدر احساس ہے۔" علی نے ذرا جل کر کہا۔ "آہ یہ لڑکیوں کی افسوسناک ذہنیت ——!!"

"میں آرٹسٹ ہوں —" میرا نے بڑے انکسار سے مطلع کیا۔

"ای ای ای — ذرا اپنی شکل تو ملاحظہ فرماؤ —" اروَن نے بے حد فراخدلی سے اُس کا منہ چڑایا۔ علی نے اروَن کا ساتھ دیا۔

"میں بیلرینا بنوں گی" میرا نے لڑکوں کی بات سُنی اَن سُنی کر کے گھاس پر پریوں کی طرح آسمان کی طرف بازو پھیلائے اور پنجوں کے بل اوپر کو اٹھی — "پھر تم لوگ دنیا کے بڑے بڑے دارالسلطنتوں میں میرا ناچ دیکھنے آیا کرنا۔ اور میں، کبھی کبھی، اگر زیادہ مصروف نہ ہوئی۔ تم لوگوں سے گرین روم میں مختصراً انٹرویو بھی کر لیا کروں گی۔ یہ میرے چھیتے بھائی اروَن اور علی ہیں — دی۔ دی۔ مادموزیل —" اس نے جھک کر چاروں طرف کرنسی کی — "مرسی موسیو"

"ای ای —" اروَن اور علی منہ چڑانے میں مشغول رہے "افسوس کا مقام ہے بھائی لوگو۔ کہ جانے کب تک تم ساری کائنات کو اپنا اونیس بھتی رہو گی —" اروَن نے منہ لٹکا کر کہا۔

برآمدے میں سے لڑکیوں کی قطاریں اترنا شروع ہوئیں۔ سارا کنبہ آرگ میں جمع تھا۔ عالیہ باجی، زہرا، فریدہ، صوفیہ، ناہید، نشو، رعنا۔ علی نے بے دلی سے گننا شروع کیا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ سب تم کو خاندان کا ونڈر بوائے سمجھتے ہیں۔ ڈوب مرو۔ آخر آپ ہیں کیا؟" اروَن نے ملامت آمیز آواز میں اس سے کہا۔

"لیکن کم از کم میرا اور اسٹیلا تو مجھے ونڈر بوائے نہیں سمجھتیں۔ اور مجھے ان دونوں کی رائے سب سے زیادہ عزیز ہے۔" علی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے ان کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا ہے۔ لڑکی بس ایسی ہونی چاہیئے جیسی میرا ہے، لیکن سوچو تو اگر ہر لڑکی میرا جیسی ہو گئی تو دنیا میں کتنا اندھیر مچ جائے گا۔ اے جناب بیڑا لوٹ جائے گا ہر چیز کا۔" اروِن نے عقلمندی سے کہا۔

"پھر راحیل کو آئیڈیل بنا لوں ـــــ" علی نے منہ لٹکا کر پوچھا۔ "راحیل کتنی پیاری لڑکی ہے۔"

"میاں کسی لڑکی کو آئیڈیل نہ بنانا۔ خصوصاً ان لوگوں کو ـــــ اس طرح تمہاری سائیکولوجی خراب ہو جائے گی ـــــ" اروِن نے مطلع کیا۔ علی مرعوب ہو کر چپ ہو گیا۔ "سائیکولوجی خراب ہو جانا" اروِن کا خاص جملہ تھا۔ ٹوپسی نے پُسی کو اتنا ڈرایا کہ اُس کی سائیکولوجی خراب ہو گئی۔ کبھی کبھی بھگوان شیو کی سائیکولوجی بھی خراب ہو جاتی تھی۔ اسی لئے ان کی زیادہ پوجا نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ اپنی اماں سے کہتا۔

"تمہارے نام لینے پر یاد آیا کہ راحیل کہاں ہے ـــــ" اروِن نے مڑ کر راحیل کو آواز دی۔

ارنسٹ برآمدے میں اوباما سے آرٹ کے کسی انتہائی مبہم نکتے پہ الجھنے میں مصروف تھا۔ علی ان دونوں کو لیمپ کی روشنی میں سنجیدگی سے لڑتا دیکھ کر مسکرایا۔

کیسے کیسے لوگ تھے۔ جن سے علی کی دوستی خود بخود ہو جاتی۔ نیک طبیعت بچوں کی طرح معصوم طبیعتوں والے آرٹسٹ، بُرے لوگ، داڑھی والے علماء، کارڈ شارپ، مشہور ایکٹر یا ادیب، فلسفی، بوڑھے پروفیسر، مطلقہ سوسائٹی کی خواتین، پرانے بیچلرز، یہ سب لوگ علی پہ جان دیتے تھے۔ علی اتنا کم عمر تھا۔ لیکن وہ سب کا رفیق، سب کا ہیرو

تھا۔ یہ سب لوگ جو تقی سے ملتے تھے، زندگی کی طرف سے دکھی تھے۔ کسی کو کسی بات پر یقین نہ تھا۔ اکثر میں شرافت اور نیک طینتی کا مادہ دنیا نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ بیگم زاہد تھیں جو ہمیشہ اپنے ڈیڑھ لاکھ روپئے کا ذکر کرتی تھیں جو جنوبی افریقہ کے کسی بنک میں ڈوب گئے تھے۔ راجن تھا، چند رنڈیوں کا عاشق تھا۔ اور علی کے کمرے کے منقش پیپیس پر چڑھ کر وہ تقریریں کرتا تھا جو اگر وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہو سکتا تو کیا کرتا۔ ارنسٹ بروملی کبھی کبھی کو بتاتا کہ جرمنی سے کتنی شدید ذہنی تکالیف اٹھا کر چھوڑنی پڑی اور یہاں اُس کے دکھوں کو سمجھنے والا کوئی بھی نہیں۔

ہمارے مصائب کتنے ہیں۔ ہمارے جرم۔ ہماری غلطیاں، ہماری مجبوریاں، میرے پیارے مجرمو ——— بالڈن سب کو بڑی محبت سے دیکھتا۔ مسوری میں وہ نہایت زور شور کا میزبان تھا مگر عقل جذباتی راجکمار ہنس سے اپنے دکھ بیان کر کے وہسکی کے بلبلوں پہ آنسو بہاتے۔ مشہور انگریز بیلی اسے اپنا رازدار بنانے کی خواہاں ہو گئیں۔ ظاہراً کامیاب، بیکلر زان سے ہمدردی چاہتے۔

اُس نے دوبارہ راحیل کو آواز دی۔

راحیل نشست کے کمرے میں سے نکل آئی تھی اور نالے کے دوسرے کنارے پر بیٹھی موسیقی کی آواز کو سننا چاہتی تھی۔ جو نیچے کے کسی مکان سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔

اس نے دیکھا کہ بیربہوٹیاں جو گھاس پہ چل رہی ہیں۔ کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ چند سرخ پتے گھاس پہ بکھر گئے۔

ابھی ان پتّوں میں آگ نہیں لگی ہے۔ پھر آگ لگے گی، اور بجھ جائے گی۔ زندگیاں ختم ہو جائیں گی۔ زندگی صرف ایک بار ہی زندہ رہنے کے لئے ملتی ہے۔

روشن آرکِت میں سے نکل کر لڑکے اور لڑکیاں گھاس پر آ گئے۔ اندرا اور رمایا اور میرا، پوجا کے لئے تھالیوں میں چراغ جلانے میں مصروف تھیں۔

ایک دیا ہے جو اپنی لَو سے سارے دیے روشن کر دیتا ہے یا بجھا دیتا ہے۔ یا پھر سارے دیے جل اُٹھتے ہیں اور جھلملانے لگتے ہیں۔ کتنی دیر تک ان کی روشنی رہے گی۔ پھر اماوس کی گھور کالی رات سارے میں چھا جاتی ہے۔ ارُون خالی کمروں کا ایک چکر لگا کر پھر برآمدے کے جنگلے پر آ گیا۔ اور جھک کر اس نے ایک دیوٹ اٹھایا۔

"راحیل بیگم اندر آ جاؤ۔ مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ڈنر کے بعد میرا ناچے گی۔ پھر شاید ہم پوکر کھیلیں جو تمہیں نہیں آتا۔" ارُون نے پکار کر کہا۔

اندھیرے میں بیٹھے ہوئے، کیا کبھی راحیل کو مرے ہوئے ماں باپ کا خیال آتا ہوگا۔ میں نے دیوٹوں کی روشنی میں سیڑھیوں پر آ کر ارُون کے پیچھے سے جھانک کر راحیل کو دیکھا۔ اندھیرا اور روشنی۔ اور راحیل۔ ان تینوں چیزوں کا ایک دوسرے سے اس قدر گہرا رشتہ ہے۔ اس مٹی میں کسی جگہ پر دو پیارے انسان دفن ہیں جنہوں نے اسے جنم دیا۔ اور راحیل زندہ ہے۔ سرخ پھولدار اسکرٹ پہنے وہ گھاس پر بیٹھی ہے اور پتوں کو چھو رہی ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ اگر باپ مر جائے تو بیٹیاں کس طرح زندہ رہتی ہیں —— اگر ابّا جان مر گئے —— اگر ابّا جانی مر گئے۔

میرے دل میں چوروں کی طرح ایک دہشت ناک خیال آیا۔ اور میں سہم کر الرون کے نیچے چھپ گئی ——— ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کبھی ابا جان ختم ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس دن دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ رات کی ہوا کا ایک جھونکا تیزی سے پاس سے گزرا۔ میں نے اس قدر بے وقوفی کی بات، کیوں سوچی۔ ابا جان نہیں مر سکتے۔ لیکن دل دہتا رہا۔ پہلی بار مجھے موت کا خیال آیا۔ ابا جان کی موت ——— میں نے انتہائی شدید جھنجھلاہٹ اور غصے کے ساتھ اس خیال کو پرے ہٹانا چاہا ——— لیکن اندھیرا ہے اور تخلیق کا ابدی سناٹا۔ راحیل مٹی پر بیٹھی ہے اور اس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا باپ بھی مر سکتا ہے۔ مر جائیگا ——— اروتن ——— میں نے چھوٹے بچوں کی طرح چیخ کر اروتن کو سیڑھیوں کے اوپر کھینچا۔ کیونکہ مجھے پہلی بار اپنے خیالات سے ڈر معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا ہے ——— ؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "راحیل!" اس نے پھر آواز دی۔

گھونگٹ کا پٹ کھول رے، تجھے ہری ملیں گے۔ اندر کسی نے ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے تھے۔

"ہلو ——— اس وقت تم لوگ کیا کر رہے ہو ———؟" فواد نے سیڑھیوں پر پہنچتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ———" اروتن نے اس کے ہاتھ میں دوسرا دیوٹ دے دیا۔ "لو اسے تم بھی جلا لو ——— چراغاں کرتے کرتے تم کائنات کے آخری سرے تک پہنچ جاؤ گے۔" اس نے اداس لیکن یقین کے لہجے میں کہا۔

"کیوں ———؟" فواد نے تمسخر آمیز آواز میں پوچھا۔ وہ اپنے دوست ریاض کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد سوائے کی گالا نائٹ رنگ پر آنے سے پہلے ہی بھاگ آیا

تھا۔ بے دھیانی سے اس نے جنگلے کی لکڑی بجائی۔

اروّن نے روشنی میں اسے غور سے دیکھا۔

مجھے چراغ کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو اندھیرے میں چلتا ہوں اور چلتا رہوں گا۔ وسعت اور تاریکی ـــــ اس نے ستون پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"میں راحیل کو آواز دینے باہر آیا تھا" اروّن نے آہستہ سے کہا "اس کے ہاتھ میں بھی چراغ ہونا چاہیئے۔ پھر ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"ابھی کارڈ روم میں مجھے لیڈی متر ملیں۔ انہوں نے مجھے غصیلی نگاہوں سے دیکھنے کے بعد سوال کیا۔ فواد نسیم احمد تم جو آوارہ روحوں کی طرح بے مقصد ادھر ادھر گھومتے ہو۔ تم نے اپنی روح کو بچا لیا ہے جو تم اس قدر مطمئن نظر آتے ہو ـــــ؟ کیا تم کو اپنے خدا اور اپنے ضمیر کی طرف سے مکمل اطمینان حاصل ہے ـــــ؟"

"خدا تو مجھے ابھی ملا تھا آنٹ ایولین ـــــ" میں نے مستعدی سے ان کو بتایا۔ "وہ مجھے اکثر کسی سنسان بار پر، اکیلی نیم روشن سڑکوں پہ ٹہلتا مل جاتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ میں اپنی بنائی ہوئی دنیا کی خاطر بہت رنجیدہ اِدھر اُدھر گھومتا ہوں۔ فواد نسیم احمد لیکن میں تم سے خوش ہوں۔ کیونکہ تم نے زندگی سے کوئی توقعات نہیں رکھیں۔ اور اسی لیے کبھی مجھے یاد نہیں کیا۔" لیڈی متر مجھ سے بے حد خفا ہو کر آگے چلی گئیں اور کارڈ روم سے نکلتے ہوئے انہوں نے رانی بلہیر سنگھ سے افسوس کے ساتھ کہا۔ کہ فواد بھی بالکل دہریہ ہو چکا ہے۔ تم کس باپ کے بیٹے ہو۔ تم کو اس وقت ہائی کورٹ میں ہونا چاہیئے تھا۔ انہوں نے کہا۔ اگلی ورلڈ چرچ کانفرنس اور وائی ڈبلیو سی اے کے اجلاس میں غالباً وہ بڑے رنج سے اس نکتے کا انکشاف کریں گی کہ انسان مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔"

فؤاد نے ستون سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔

مت ڈول۔ مت ڈول رے۔ تجھے ہری ملیں گے۔ اندر کسی نے درباری چھیڑ رکھی تھی۔

(سوائے تہمینہ کے سب نے کھانا کھایا۔ پھر فؤاد کے چلے جانے کے بعد رات گئے تک امو در کوٹ پہن کر ہال کی ریلنگ پر جھکا کھڑا رہا۔ اور چند روز بعد ناگپور چلا گیا۔ جہاں ان ہی دنوں اس کا تقرر ہوا تھا)

۱۱

میرا نے بڑے اہتمام سے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ۔
"ذرا ہمارا پرس اٹھا دینا۔" عطیہ نے اس کے خیالات کی ترتیب منتشر کر دی۔
وہ ہیڈی لیمار کی طرح حسین بیٹی پر دونوں ٹانگیں رکھے ناخن سنوار رہی تھی۔
—— کہ فواد نسیم احمد —— میرا نے خیالات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔
"شگفتلا برلین واپس پہنچ گئی۔" عطیہ نے پھر دخل اندازی کی شگفتلا شانتارام کی فلم "دنیا نہ مانے" میں حصہ لینے کے لئے پونا گئی تھی اور اب وہاں سے پھر یورپ لوٹ گئی تھی۔

شگفتلا — میرا نے اس نام کو دل میں دہرایا۔ اس قدر محدود ذلیل دنیا ہے کمبخت منحوس۔ وہاں سارے ایک سے شہر۔ وہی سارے ایک سے انسان۔ کیا دنیا میں ان تین انتہی منحوس جگہوں لکھنؤ، دہرہ اور مسوری کے علاوہ اور کوئی جگہ باقی ہی نہیں ہے۔ مثلاً ٹری وینڈرم۔ یا کوالالمپور۔ وقت کا آبشار سر سراتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر عطیہ کو دیکھا۔ یہ کس قدر بے تحاشا خوبصورت عورت ہے۔ ہیڈی —— ! میرا نے اس پر نظر ڈال کر پیار سے دل میں کہا اور دوسری مختلف اجنبی جگہوں کے نام سوچنے میں مصروف ہو گئی۔

ملتان — اس نے ایک اور اجنبی نام سوچا۔

ناگپور ـــــ عطیہ نے مختصراً کہا۔ گویا وہ والٹ ڈزنی کی اسنو وائٹ ہے۔ اور جادو کے زور سے دوسروں کے دل کی باتیں سُن لینے کے بعد کبھی کبھی اپنے سُرخ ہونٹ وا کر کے خود بھی بول لیتی ہے۔

"ناگپور ـــــ!! وہاں کیا ہے ـــــ؟" میرا نے خوشی سے پوچھا۔

"ریاض احمد ـــــ" عطیہ نے اسی طرح مختصراً کہا۔

اب اگر اس عطیہ کا کوئی اور سُوپر انٹلکچوئیل دوست یہاں آیا تو وہ سنیاس لے لیگی۔ ایک سے ایک کریک الزماں پہلے ہی موجود تھے۔ جو "نیو لائف" کے لئے عطیہ کے پاس بیٹھ کر مضمون لکھتے تھے۔ عطیہ ان سب کی پیٹرن اِن چیف تھی۔ میرا نے اسے غصے کی نظروں سے دیکھا۔

"ایک نہایت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ فوآد کے دوست ہیں دراصل" عطیہ نے کیوٹکس کی دوسری شیشی اٹھائی۔

فوآد ـــــ خیال کی پرکار پھر اپنے نقطے پر واپس آئی۔

"ہوہ ـــــ ہلو ـــــ" دوسرے لمحے فوآد گرجتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور پھر منہ لٹکا کر سیٹی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے فیم کے دوسرے افراد چلے آ رہے تھے۔ نادرہ۔ عالیہ باجی۔ املا کھنہ۔ علی۔ یہ سب افسردگی سے اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا ـــــ" عطیہ نے پریشانی سے سوال کیا۔

"ہتنے بھائی ـــــ" علی نے کہا لیکن آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔

"کیا ہوا ـــــ" عطیہ نے گھبرا کر دریافت کیا۔

"بنے بھائی کو قید کر لیا گیا۔ آنریبل پالمر رکیسٹن نے عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر اُنہیں نینی جیل بھیج دیا ———" عالیہ باجی نے آہستہ سے کہا۔

کمرے میں سکوت طاری ہے۔

کچھ عرصہ قبل بنے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔ وزیر منزل میں ساری دنیا کی رونق سمٹ آئی تھی۔

اب کیا ہوگا ——— فواد نے اپنے آپ سے دُہرایا۔

سب خاموشی سے باہر نوگرے کے پھولوں پر برستی ہوئی چاندنی کو دیکھتے رہے۔

یہ کتنے سہانے زمانے تھے۔ ابھی خواب دیکھے جا رہے تھے۔ جدو جہد کی جا رہی تھی۔ اصولوں کے پیکر تراشے جا رہے تھے۔ عزائم اس قدر بلند، ولولے اس قدر جوان تھے کہ آنے والے برسوں میں پیچھے کی طرف نگاہ کرتے تکلیف ہوگی کہ کس طرح دنیا نے ان خوابوں کو خاک و خون میں روندا۔ کس طرح زندگی کی توہین کی گئی۔

۱۲

آنریبل ایبرد الفرڈ ریگنٹس نے بی بی سی کا فل ہارمونیک آرکیسٹرا سنتے سنتے دفعتاً ریڈیوگرام کو بند کر دیا۔ میں اس وقت کوئی ایسا اداس سا پرانا گیت سننا چاہتا ہوں جو میں لڑکپن میں گایا کرتا تھا۔ مثلاً "ہماری گلی کی کیتھلین" یا "برنگ بیک مائی بونی ٹو می۔"

اس نے سوچا۔ کاؤچ سے چلتا ہوا دریچے میں آ کھڑا ہوا۔ باہر موگرا کھل رہا تھا اور چاند سکندر باغ کے کنجوں پر جھکا کھڑا تھا۔ لیکن اب تک جو ٹھنڈی ٹھنڈی پروائی چل رہی تھی وہ تھم سی گئی تھی۔

لیکن مجھے اپنی جذباتی کیفیتوں پہ زیادہ اختیار ہونا چاہیے۔ اس نے طے کیا، فی الحال اس تنہائی پر جھٹک کے، میں اپنے ایک آدھ دوستوں کو خط لکھوں گا۔ ارنسٹ غالباً خود ہی آ جائے۔ شاید میں ریاض کو خط لکھوں گا۔ وہ واپس آ کر صوفے پر لیٹ گیا۔ ریاض خاصا گدھا ہے۔ اس نے سوچا۔ اور ارنسٹ بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ (اس نے بے حد تفصیل سے اپنی انگلیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے سگرٹ جلایا) کہ سب ہی گدھے ہیں۔ ارنسٹ ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ اور دیویکا رانی کے فلم ڈائرکٹ کرتا ہے۔ یہ ایک نئی دنیا تھی جو اسے سن تیتیس کے بعد کے ہندوستان میں نظر آ رہی تھی۔ اس میں مدراسی رقاص تھے، اور بنگالی ایکٹریسیں اور باقی کے یہ سب لوگ جو بات بات پر "ہندوستانی آرٹ کی عظمت" کا تذکرہ کرتے رہتے تھے ——

اس نے خود امیجسٹ طرز کی نظمیں ایک زمانے میں لکھی تھیں، جب وہ بنارس میں تھا اور اپنی ممّا اور مس کیتھلین جیُو کو پریشان کیا کرتا تھا۔ اور اوڈن کو اپنا کلام بھیجا کرتا تھا۔ اوڈن کو اس زمانے میں لندن میں اُس کی خالہ نے اپنے لڑکے کو پڑھانے کے لئے ملازم رکھا ہوا تھا۔ اور ایمبر کو اپنی شدید ڈیموکریٹک جذبات کے باوجود غیر شعوری طور پر یہ سوچ کر فخر کا احساس ہوتا تھا کہ اس کا انتہائی اِرسٹوکریٹک خاندان بے حد فیاضی اور دریادلی کے ساتھ بیچارے ادیبوں کی سرپرستی بھی کرتا ہے۔ لیکن بائیس سال کی عمر تک پہنچکر اس نے یکلخت نظمیں لکھنی چھوڑ دیں اور کیمبرج جاکر ادبیات کے بجائے اس نے تواریخ میں ٹرائپوز لیا۔ اور اپنے خاندان کی معمارِ سلطنت روایات کے مطابق بخیر و خوبی انڈین سول سروس میں داخل ہوا —— گو میں کافی ہندوستان پرست ہوں۔ دوسرا سگرٹ جلاتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ ننگے پاؤں وہ بارہا سارناتھ کے مندر اور کاشی کے مقدس شوالوں میں گیا۔ کیمپ بڑودہ میں کچّے مٹی کے فرش پر بیٹھ کر اس نے مہاتما گاندھی کی باتیں سنیں۔ نہایت خلوصِ نیت کے ساتھ گیتوں اور بھجنوں کی دُھن سے اپنی رُوح کو ہم آہنگ کرنے کی شدید کوشش کی۔ اپنے مالیوں، حتٰے کہ اپنے اصل نسلی نجیب الطرفین معمارِ سلطنت، بیرے عبدل تک سے اس نے کبھی 'کوئی ہائے' کے لہجے میں بات نہیں کی۔ اپنی ممّا کی دوست بیگم زینب عباسی کے یہاں جاکر، جن کے شوہر انڈین پولس میں تھے، اس نے اکثر پان کھائے۔ اس کا ہندوستان پرستی کا یہ جذبہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ جب اس کو کیمبرج بھیجدیا گیا۔ کیمبرج کے بعد وہ لکھنؤ کا جوائنٹ مجسٹریٹ بنا اور اس کی ہندوستان پرستی اور گیتا گووندا کے عشق اور راگنیوں کے سحر کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

"تم نہایت زبردست گدھے ہو اور رات گرم ہوتی جا رہی ہے۔" اُس نے ریاض کو لکھنا شروع کیا۔ لیمپ کھڑکی میں رکھا تھا اور اس کی روشنی باہر پھولوں پر پڑ رہی تھی۔ تم الّو ـــــ اس نے چند نفیس گالیاں اور لکھیں۔ اس کو غصہ تھا کہ بی بی سی سے پانچویں سمفنی کیوں بج رہی ہے اور وہ اِس وقت ہماری گلی کی سیٹی کیوں نہیں سُن سکتا۔ اور اس گدھے کے بچے ارنسٹ نے ایک دفعہ اس سے کہا تھا کہ تم کمبخت انگریز بیتھووِن بجا ہی نہیں سکتے۔ تم کسی طرح ہماری روح میں داخل ہو ہی نہیں سکتے۔ یہی بات اس اُلّو کے بھائی نے رتنا اور شکنتلا اور ان ساری لڑکیوں سے کہی تھی۔ کسی جرمن پیانسٹ سے بیتھووِن سنیے! اور وہ کمبخت منحوس ارنسٹ بردمیل یہ بھی کہتا تھا۔ کہ شوپاں اور ڈاگز چونکہ کلاسیکل نہیں۔ لہٰذا منحوس ہیں۔ جبکہ وہ خود ایلبر والفرڈ رکسٹن کم از کم شوپاں پر جان دیتا تھا۔ اُسے اور زیادہ غصہ آیا۔ یہ ساری ہندوستان پرستی، یہ فنکار لڑکیاں اور ان کے بالوں کے پھول اور ارنسٹ کی لن ترانیاں بھارت ناٹیم۔ ویویکا رانی۔

ارنسٹ کو خط لکھنے کا ارادہ ملتوی کر کے اس نے طے کیا کیوں نہ ریاض کو لکھوں اُس کو ذہن سے ہٹا کر اس نے ریاض کی شخصیت کے تصور کی تعمیر شروع کی۔ ریاض ایک سیاہ آنکھوں، گھنگریالے بالوں، کھلتی ہوئی رنگت اور ذہین چہرے والا ہندوستانی ہے۔ جو چند سال قبل پہلی بار مجھے اسٹریتھ مور کے عرشے پر ملا۔ جبکہ ہم دونوں بحیرۂ عرب میں محصور تھے۔ ریاض کو بھی میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بے حد قابل سمجھتا ہے اور دوسروں کو نہایت خوبصورتی سے اُن کی کم عقلی کا یقین دلاتا رہتا ہے۔ اُس نے اور میں نے کافی عرصہ اکٹھا گذارا

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ہندو لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ اور میں نے اُسے بتایا کہ میں نے اب تک اپنے آپ سے بھی عشق کرنا شروع نہیں کیا۔ کیمبرج میں ہم اتنے دنوں ساتھ رہے اور اکٹھے امتحانوں میں کامیاب ہوئے، لیکن ریاض میں اپنے اندر جو اعتماد اور دنیا سے بے نیازی تھی وہ مجھ میں پیدا نہ ہو سکی۔ اور جب ارنسٹ کہتا ہے کہ میں انگریز ہوں اور اس وجہ سے ہندوستان کی رُوح میں کبھی نہیں گھس سکتا ——— ہلو ——— اس نے چونک کر سر اٹھایا اور آنکھیں کھولیں۔

ہلو ——— ارنسٹ نے اطمینان سے کہا اور کرسی کے پائے کے سہارے قالین پر بیٹھ گیا۔

"دیویکا کی نئی پکچر "نرملا" کا افتتاح تھا۔ ٹیکنیکل لحاظ سے سوپرب بنائی ہے" اس نے میٹر آف فیکٹ طریقے سے اطلاع دی تاکہ ایمر اور چڑے۔

"نہایت کمینے انسان ہو ———" ایمر کو ہنسی آگئی۔

"آؤ باہر چل کر ٹہلیں ——— یہاں سخت گرمی ہے ——— ارنسٹ نے کہا۔

وہ دونوں پھولوں میں اُتر آئے۔ سکندر باغ کی سڑکیں خاموش تھیں۔ دُور دُور زیرِ منزل میں مدھم سی روشنی جھلملا رہی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے دریا کے کنارے والی سڑک پر چلتے رہے۔ ارنسٹ کے ہلکے پیلے بال دھندلی چاندنی میں اور زیادہ پیلے معلوم ہو رہے تھے۔ ہم دوستی کی اس اسٹیج پر ہیں جہاں گفتگو جاری رکھنا بالکل غیر ضروری ہے۔ ایمر نے سوچا ——— اور اپنے گھر سے چاکلیٹ بالوں کی لٹوں کو پروائی کے ایک غیر متوقع جھونکے کی زد سے بچانے کے لئے ان پر ہاتھ رکھا۔

یہ میں ہوں۔ بالوں پر سے ہاتھ ہٹا کر سامنے لاتے ہوئے اس نے خیال کیا اور غور سے چاندنی میں اپنی انگوٹھی کے مدھم نیلے پتھر کو دیکھا۔ پندرھویں صدی سے یہ انگوٹھی اس کے خاندان میں تھی۔ اور اس کے پتھر پر اس کے خاندان کا کوٹ آف آرمز اور لاطینی میں اس کا جملہ Not blown by every wind منقش تھا۔ میں ایلیٹ الفرڈ ڈرگسٹن ہوں۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔ وہ ارنسٹ بروڈیل کے ساتھ لکھنؤ کی خاموش سڑک پر جس کے دو رویہ یوکلپٹس کے درخت تھے، ٹہل رہا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ چلتے چلتے کافی دور نکل آئے تھے۔ یہ ایک اور خاموش سڑک تھی جس پر ایک طرف ازابلا تھوبرن کالج کی بلند عمارات تھیں، دوسری جانب گومتی بہتی تھی۔ آم کے جھنڈ تھے۔ خوبصورت کوٹھیاں تھیں۔ نمبر اکیس، نمبر بائیس، نمبر تئیس، یہ سڑک مانوس تھی۔ یہ سارا منظر مانوس تھا۔ پس منظر بھی۔ جہاں گنجان محلے تھے عدالتیں تھیں۔ جیل تھے۔

شیشے کی طرح کی خاموشی سارے میں پھیلی تھی۔ ایک آریائی اور ایک انگلو سیکسن دونوں اس سکوت میں آہستہ آہستہ چلتے رہے۔

آج ہم نے نرگس کے بہت سارے پھول جمع کیے۔ میرا نے کہا اور سارا دن خفا بیٹھا رہا ـــــ علی نے برآمدے میں بیٹھ کر اسکیٹس پہن لیے ہیں۔ لیکن میں یہیں بیٹھوں گی۔ دن بھر۔ رات بھر۔ ہمیشہ۔ ہمیشہ۔ ممی سے کہنا میرا کھانا یہیں بھجوا دیا کریں۔ میں ان کو باغ کے راستے پر سے اپنے لیے کھانا لاتے دیکھا کروں گی۔

کل ہم نے جاناماں کو جوتے کہا تھا۔ پرسوں گنے چرائے تھے اور شفا لو جو موٹے انگریز کے باغ میں لگے ہیں۔ علی نے کہا۔ طویل کمروں میں روشنیاں جل رہی

ہیں۔ جہاں شاہ بلوط کا فرنیچر ہے۔

گھاس پر ہم نے پری کنڈل بھی ڈھونڈے۔ سٹیلا نے کہا۔ اور ہوا ٹھنڈے فرشوں پر سے گذر رہی ہے۔

چاند کے ویرانوں کو خدا حافظ کہکر میں پھر ان طویل کمروں میں آگیا ہوں۔ جہاں بیٹھ کر مجھے فنون جنگ سیکھنے ہیں۔ فنون جنگ۔ مجھے تم لوگوں نے سپاہی بننے کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ مجھ سے بھی محبت کرو۔ مجھے بھی جانو۔ ارجن نے کہا۔

کیا میں ڈاکٹر آف فلاسفی بنوں گی اور سفید ساری پہنکر اندرا کی طرح لائبریری کے پل پر سے گذرا کروں گی ——— اور جاڑوں میں ہم سب روم جائیں گے اور لیکچر دیں گے۔ میں ایک نظم بناؤں گی جس میں شروع سے آخر تک ناچ ہی ناچ ہوگا۔ میر آپ نے کہا۔ لیکن یہ سب کئی سال پہلے کی باتیں ہیں۔ گھاس پر چلتی ہوئی وہ پھاٹک پر آگئی اور پھاٹک کے ستون کو ناخنوں سے چھوا اور اور بہادر مہندر رکما رراج ونش پی سی ایس نمبر بائیس فیض آباد روڈ۔ اس نے چاند کی روشنی میں اپنے باپ کا نام پڑھا۔ چنانچہ میں میرا نلنی ہوں اس نے کچھ مایوسی سے خیال کیا

ہلو ——— اس نے سامنے سے گذرتے ہوئے ایمبر رکمیسٹن کو دیکھا۔

"مزاج بخیر مس راج ونش ———" ایمبر نے ٹھٹک کر کہا۔

بتیرا باغ کی دیوار پر سے اُتر کر پھاٹک کی پلیا پر آگئی۔

"ہلو مسٹر رکمیسٹن ——— کس قدر گرم رات ہے۔ اور کوئی چڑیاں نہیں گا رہی ہیں ———" پلیا پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتے ہوئے اس نے بشاشت سے کہا۔

مجھے کیٹس سے بھی نفرت ہے ——— ایمبر نے جھنجھلا کر دل ہی کہا۔

"ابھی ایک بہت پرانے گیت کی آواز ہوا میں بہتی ہوئی آئی تھی ———" اس

نے میرا سے کہا۔

"میں گا رہی تھی ـــــ" میرا نے پھاٹک پر جھک کر سادگی سے اُسے بتایا۔
"بونگ بیک ہائی بونی ٹومی ـــــ بہت دنوں بعد مجھے یہ گیت یاد آیا ابھی مجھے لگ رہا تھا کہ ہم سب دسہرہ ددن میں ہیں۔ اور اسٹرابری چرا رہے ہیں۔ اور راج محل کی گھاس پر بیٹھے ہیں۔ اور ارون ملٹری اکیڈمی سے چھٹی پر آیا ہوا ہے ـــــ لیکن یہ سب بہت پرانی باتیں ہیں ـــــ اب وقت بدلتا جاتا ہے۔"

برابر کے پھاٹک پر آکر ٹیپسی بھونکا۔ "رات زیادہ گرم ہوتی جا رہی ہے" ارنسٹ نے راتے ظاہر کی۔

"آپ کا نیا فلم کب ریلیز ہو رہا ہے ہر برڈمیل۔ ہم اسے ضرور دیکھیں گے" میرا نے کہا۔ اور ممیا پہ سے اُتر آئی۔ "اچھا شب بخیر ہر برڈمیل۔ شب بخیر مسٹر رکیسٹن ـــــ"

وہ دیوار پر بیٹھ کر باغ کو دیکھتی رہی۔

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

نجات بھولوں میں سرسرا رہے ہیں شفقت کے قطرے اس وسعت میں گرتے جاتے ہیں آہستہ آہستہ۔ آہستہ۔ اور ان پھولوں پر چلتی ہوئی وہ اس طرف آ رہی ہے۔ میرابل ـــــ تم میرے لئے بانسری بجاؤ گے۔ میری دنیا میں تم کو سکھ مل سکیں گے۔ میں تمہارے لئے ہر ہیپیر کے ناچ ناچوں گی ـــــ ایمبر کے ذہن میں میرا نے اُس سے کہا۔

"مجھے ایسے ہی ایک خیال آیا ـــــ کہ تمہاری انگوٹھی کے EN SIGN کا جملہ نہایت مسخرے پن کا ہے ـــــ" ہر ارنسٹ برڈمیل نے ساتھ ساتھ قدم رکھتے ہوئے بشاشت سے کہا۔

فصل دوم

۱۳

اور اب میں لکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے کچھ نہیں آتا۔ الفاظ بہت ہیں۔ دنیا کی زبانوں میں اتنی وسعت ہے۔ ہم لوگ، جو بڑے ہو رہے ہیں، بہت سی چیزوں کو جاننا چاہتے ہیں۔ بہت سی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ٹیگور کی ساری موسیقی۔ شوپین کی تخلیقات جن میں پھولوں کے کھلنے کا احساس ہے۔ بہار کے پرندوں کی خوشی، اور آزادی۔ باغوں کی مہک۔ کسانوں کے کالجوں میں سے نکلتے ہوئے ہشاش بشاش دھوئیں کی مسرت۔ ماہ مئی کے گیت۔ شوپین۔ شوپین۔ اس کے علاوہ کتابیں ہیں۔ ناچ ہے۔ ساری زندگی ہے۔

ارون ملٹری اکیڈمی سے آچکا ہے۔ اپنے خوبصورت یونیفارم میں وہ خاموشی سے مسکراتا ہے۔ وہ اور علی احمد اصطبلا گھوڑوں پہ دور دور نکل جاتے ہیں اور سہ پہر کو تھکے ہارے واپس آکر چاء کے لئے غل مچاتے ہیں۔

خانقاہوں اور درسگاہوں میں پڑھائی ہو رہی ہے۔ لورینٹو کی مریم کی راہبات سایوں کی طرح گھاس پر سے گذرتی ہیں۔ کالج کے فارسٹ آف آرڈن میں "کوالٹی اسٹریٹ" کی ریہرسل کی جا رہی ہے۔

لیکن میں ضرور کچھ لکھوں گی۔ میں چپکے سے ابا جان کے کمرے کے دریچے کے نیچے جا کر جھانک کر اندر دیکھ آتی ہوں۔ ابا جان آرام کرسی پہ نیم دراز کچھ گنگناتے جا

رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان کی ساری کتابوں کو ادھر ادھر سے دیکھا ہے
لیکن کچھ زیادہ میرے پلّے نہیں پڑا۔ گو "جلال الدین خوارزم شاہ" پڑھ کر میں کئی بار رو
چکی ہوں اور "آسیبِ الفت" پڑھ کر مجھ پر عجیب سا خوف طاری ہو جاتا ہے اور
پھر یہ ابّا جان کے بے انتہا قابل قسم کے دوست ہیں۔ جو اکثر ابّا جان کے پاس آتے
رہتے ہیں اور ڈرائنگ روم میں، یا شیشوں والے برآمدے میں، یا گھاس پر، گھنٹوں لمبی
بحثوں میں محو رہتے ہیں۔

کس قدر مجھ پر، ہم سب پر، ان بڑی عمر والے انسانوں کا رعب طاری ہے۔
"بیٹا علم دریا ہے ——" ہرمزی خانم سر ہلا کر کہتی ہیں۔ "کیا سینٹ آگسٹن کو حل مل گیا تھا —؟"
ارون فواد سے پوچھتا ہے۔ فواد آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ "کیا ضرور ہے کہ حل ملے"
وہ کہتا ہے۔

"صحیح خیال کیا ہے عالیہ باجی ——" علی بچوں کی طرح جھنجھلا کر سوال کرتا ہے۔ راحیل
محض نٹنگ میں مصروف ہے۔

"میں نے ایک کویتا لکھی ہے ——" نیرا اطلاع کرتی ہے۔ "میں منیکا ہوں۔"
"لیکن میں لکھوں گی ——" میں جو اس وقت سیڑھیوں پر بیٹھی ہوں۔ "درختوں پر چڑھ
رہی ہوں۔" راؤ بہادر مہندر راج ونش سے کہہ رہی ہوں۔ "آپ کا زکام اب کیسا ہے
چاچا ڈارلنگ ——" میں ابّا میاں کے موزے الماری میں سے نکال کر آرام کرسی پر رکھتی
جا رہی ہوں۔ میں نے ابھی "ناولٹ اِن بی مائینر" بجایا ہے۔ ایک ہرا پتا چوکھٹ پر آن
گرا ہے۔

"تم کیا جانتے ہو ——" میں نے ایک آدمی سے پوچھا۔ مگر اس نے میری بات نہیں

تھی۔ کیونکہ دل میں میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ وہ مجھ سے کہتا رہا۔ ”آپ نے جو آخری گھنٹی بجائی —— تو ہم لوگ سمجھے کہ —— آپ نے جو آخری ——“ یہ کسی ڈرامے کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جو کل یوکلپٹس کے نیچے ہوا تھا۔ اس آدمی کو میں عمر بھر سے جانتی ہوں۔ گو عمریں ابھی بہت طویل نہیں ہیں۔ کل یہ کہیں چلا جائے گا۔ پندرہ سال بعد میری ملاقات اس سے مدراس یا دارجیلنگ یا کراچی کے کسی کلب یا دوکان میں ہو گی اور یہ مجھ سے کہے گا۔ وہ ڈرامہ جو آپ نے کیا تھا۔ اس کا وہ واقعہ مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری گھنٹی جو آپ نے بجائی —— ازل سے اب تک الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ ہم اگر ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر باتیں کریں تو بالکل باتیں نہ کریں۔ کیونکہ یہ مجھے جانتا ہے۔ کل میں نے اسے فارسٹ آف آرڈن میں دیکھا تھا جو ہمارے طلسماتی کالج کا طلسماتی جنگل ہے۔ میں نے اسے کل دیکھا ہے اور کل کے بعد سے یہ بھی اسی گروہ میں شامل ہو گیا جو ان ہرے پتوں، درختوں اور ایلمر، الفرڈ ڈکنسن اور راحیل بلگرامی کے سمیت! میرے خلاف سازش میں شریک ہے۔ اب میں اسے اور بہت سے انسانوں کو پندرہ سال بعد دیکھوں گی۔ یا شاید کبھی بھی نہ دیکھوں۔ میں اس انسان کے نام سے بھی واقف نہیں اور شاید عمر بھر اس سے واقف نہ ہو سکوں۔

اور تم کو نہیں معلوم کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ میں اس سے کہتی ہوں۔ زرد رنگ کی یہ لکیر جو کلینڈرس پر سے بہتی جا رہی ہے، یہ تمہارا راستہ ہے۔ زرد رنگ، اتنے سارے رنگ، فضائیں، خوشبوئیں، آوازیں تم اپنے وجود میں سمیٹے ہو۔ تم زندہ ہو۔ اب تک کہیں الگ کسی اور جگہ اپنی زندگی بتانے آئے ہو۔ اور غالباً خوش ہو۔ لیکن تم میرا کو نہیں جانتے راحیل کو نہیں جانتے۔ تم انکل راج ونش کو بھی نہیں جانتے۔ وہ اس اندھیری

رات کی کسی گلی میں چھپے کھڑے ہیں۔ اور میں نے ان سے پوچھا ہے کہ آپ کا ذکام اب کیسا ہے چاچا ڈارلنگ۔ انکل راج بنش پچاس سال سے زندہ ہیں۔ اور اپنے چہیتے بچوں ہیرا، مایا، اندرا اور ارون کے لئے ان کی یونیورسٹیوں اور کلبوں کی فیسوں کے بھاری چیک کاٹنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کو کچھ پتہ نہیں۔ ابا جان کو بھی پتہ نہیں کہ یہ زرد لکیر کینوس پر سے بہتی نیچے گر رہی ہے۔ اور تم بہت سے انسانوں کو جانے بغیر مر جاؤ گے۔ کتنے دکھ کی بات ہے۔

وہ آدمی سیڑھیوں پر سے اتر کر پھر گھاس کے قطعے کی سمت آہستہ آہستہ بے مقصد طریقے سے واپس جا رہا ہے۔ جدھر فارسٹ آف آرڈن ہے۔ گہما گہمی جاری ہے۔ آٹھ بجے سے "کوالٹی اسٹریٹ" اسٹیج کیا جائے گا۔

میں خرگوش کی طرح جھاڑی کے پیچھے چھپی بیٹھی ہوں۔ ایک دن آئے گا جب مجھے ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری ملے گی۔ میں ڈائس پر بڑی گریس کے ساتھ چڑھوں گی اور مسکرا کر وی سی سے کہوں گی آپ کا بہت بہت شکریہ راجہ صاحب۔ ساری دنیا میری آڈینس ہے۔ حالانکہ یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری ایک دن میں بون فائر میں جلاؤں گی۔ اس بون فائر کے گرد مجھے بہت سے چہرے نظر آ رہے ہیں جو شعلوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ان سب کو میں پہچانتی ہوں اور پیچھے آرڈن کے تاریک جنگل میں ہوا سیٹیاں بجا رہی ہے۔

دماغ میں جو تصویریں محفوظ ہو گئی ہیں وہ علیحدہ سے دیکھنے میں در اصل اس قدر معمولی اور غیر اہم ہیں۔ پورٹ بلیئر کا کولونیل وضع کا سفید دو منزلہ مکان، غازی پور کے گلاب کے تختے، مس کینتھلین جیوؔ کی سرخ فراک اور اس انسان کا گرے سوٹ،

جس نے کل یوکلپٹس کے نیچے بیٹھ کر فارسٹ آف آرڈن کی مہک اپنی ناک میں داخل کی۔ فارسٹ آف آرڈن ہمارے کالج کے اس جھنڈ کا نام ہے۔ رومینٹک ——! ؟ اس انسان نے کہا۔ یہ انسان پونا سے آیا ہے۔ یا لاہور سے۔ یا شاید ناگپور سے۔ جہاں یہ لیبر کے اعداد و شمار جمع کرتا ہے۔ اس نے اپنی —— اپنی آنکھوں سے آرڈن کے جنگل کو دیکھا —— لیکن تم کیا جانتے ہو؟

اب وہ انسان گھاس پہ بید کی کرسی پر بیٹھا ہے۔ ابھی ابا جان آکر اس سے سرکاری اور غیر سرکاری باتیں کریں گے۔

چاند پنڈت —— ؟ جی ہاں۔ پروگرام کے کاغذوں کو آگے رکھ کر سب متوقع نگاہوں سے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ حسب معمول آرگن بجتا ہے حسب معمول پردے کھینچے جائیں گے۔ "ڈبلیو اینڈ وائٹ روم" ہے۔

مجمع نے دیکھا ہے کہ یہ جیمس بیری کا کھیل ہے۔ یہ جیمس بیری کا کھیل نہیں ہے۔ آدھی آدھی رات تک اس آڈیٹوریم میں ریہرسل کی گئی۔ خالی کرسیوں کی علاوہ پوش قطاروں اور روشندانوں میں سے اترتی ہوئی مدھم دھوپ کی لکیروں کا جوان کرسیوں پر بے مقصد تیرتی پھریں، اس آدمی نے تصور کیا۔ محفوظ۔ وہ بے حد محفوظ تھا۔ یہ سارے لوگ آس پاس چھپے بیٹھے تھے۔ اس کے قریب۔ اس کے دور۔ اس سے بہت دور۔ پردے کے پیچھے نیم تاریک کوریڈورز اور مرمریں ہالوں میں کوسٹیوموں کی الماریاں ہیں جن میں جھالر دار بھاری بروکیڈ کے ملبوسات، پروں والی ٹوپیاں اور سپاہیوں کے سرخ اور سنہری یونیفارم سب اوپر تلے گڈمڈ پڑے ہوں گے اس نے اس خوشبو کی مہک کے احساس کا خیال کیا۔ جو ان کپڑوں میں سے نکلتی ہوگی جو ہر

سال ان تقریبات پر پہنچے جاتے ہیں ـــــ کو سینٹ مینز۔ کوالٹی اسٹریٹ۔ چاند پنڈت ـ؟
شکر ہے آج بارش نہیں ہوئی۔ یاد ہے پچھلے سال اس موقع پر کیا بوریت ہوئی
تھی ؟ پورچ تک پہنچتے پہنچتے میں شرابور ہو گیا۔ بچاری مسز جورڈن ـــــ ایک شخص
نے دوسرے سے سرگوشی میں تبادلہ خیالات کیا ـــــ
یہ راجہ بہادر مسٹر راج ونش کی سب سے چھوٹی لڑکی ہے جو ابھی ابھی آکاڈانس
کرتی اسٹیج پر آئی ـــــ یہ مشہور 'بال' کا سین ہے۔ یہی کھیل ایک بار میں نے
ڈرری لین میں دیکھا تھا ـــــ اس کے کان میں کسی نے کہا۔
ڈرپ۔ ڈرپ۔ ڈرپ۔
دھارے سب طرف بہہ رہے ہیں۔ اور میں ایک ستون کے پیچھے چھپی کھڑی ہوں۔
میرے ہاتھوں میں سرخ گلاب کا ایک شگوفہ ہے جو میں ابھی دبلنٹائن براؤن کو پیش کروں گی۔
مجھے اپنا پارٹ یاد ہے۔
میں عمر بھر کنتنی رہوں گی۔ لیکن الفاظ نہیں ہیں۔ اظہار نہیں ہے۔ اظہار میں اثر نہیں
ہے۔ مجمع بہ مجمع ہے۔
آخری الفاظ کیا ہوں گے۔ آخری الفاظ کیا ہوں گے۔
اب ایلین رالف سامنے جائے گی۔ جو بہرا الو ہے۔ مجمع دراصل ہمیں احمق بنانے
آیا ہے۔ مجمع کی ایک اکیلی آنکھ فٹ لائٹس اور پام کے پتوں میں سے مجھے دیکھ رہی
ہے۔ یہ آنکھ کبھی بند نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ اسے انتظار ہے
کہ میں سو جاؤں۔
" پھول بہت پرانے ہو چکے ہیں " چاند نے کہا۔ سفید روشنی اس پر پھینکی گئی۔ پروگرام

کے کاغذات میں جنبش ہوئی۔ مجمع بھی کھیل میں داخل ہو چکا ہے۔ کھیل کی جنبشوں کے ساتھ زندہ ہے۔

آخری لفظ کیا ہوگا۔

اب میں نیچے آگئی ہوں۔ ہز ایکسیلنسی کو پرس کے پیش کرنے کے وقت لیڈی ہیملٹ کا بھی شکریہ ادا کرنا ——— مس بک گالے نے آہستہ سے کہا۔

ہز ایکسیلنسی بے حد محبت اور مشفقانہ نگاہوں سے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ میں تمہارے ہاتھوں سے یہ پھول لوں گا جو ان باغوں میں سے جمع کئے گئے۔ تم نے مجھے اس جال میں شامل کر لیا۔ یوکلپٹس کے پتوں کی مہک مجھ تک پہنچی ہے لیکن میں اپنے سٹیل کوٹ میں محفوظ ہوں۔ آخری لفظ میں بھی نہیں جانتا۔

اگر اس وقت آپ یہ تصور کر لیجئے کہ ہم واقعی اٹھارویں صدی میں زندہ ہیں اور اس سڑک پر موجود ہیں۔ جہاں فی بی چل پھر رہی ہے ——— ایک اونا ... نے پہلی قطار میں کہنا شروع کیا۔

اور اگر یہ باور کیجئے کہ ہم ڈری لین میں یہ کھیل دیکھ رہے ہیں ——— دوسرے نے ناصحانہ انداز میں بات کی ———

میں کچھ نہیں باور کرنا چاہتا۔ میرے عزیز دوست ——— اس گرے سوٹ والے آدمی نے جو اڑیسہ یا ناگپور یا لاہور سے آیا ہے، پہلو بدل کر ناگوار لہجے میں جواب دیا۔

عزیز دوست نے اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

واقعی مسٹر چیلیشور دشاریہ ——— دوسرے نے کہا۔

مسٹر وشاریہ نے دوسری قطار میں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سر ہلایا۔

"یہ میرا آراج ونش ہے جو ابھی حالمتس کرتی سامنے آئی۔" تیسرے نے موضوع بدل کر مسٹر وشاریہ کو مخاطب کیا۔ جنھوں نے ناقدانہ نگاہوں سے سامنے دیکھا۔

گرے سوٹ والا آدمی خاموش ہے۔

میں کیا لکھوں گی ——— میرے سامنے صرف زرد لکیریں ہیں جو نیچے بہہ رہی ہیں۔

ابھی وقت ہے۔ زندگی ہے۔ دنیا کا انتظار ہے۔ حالانکہ کل تک لوگ لمحات کی اس شدت کو بھول جائیں گے۔ جو اس اوڈی ٹوریم میں، ان پیڑوں کے نیچے۔ ان باغوں میں ہر ایک نے بے لبسی سے اپنی اپنی جگہ محسوس کی۔

۱۴

وقت کے اس دیوانے کھیل میں، صرف بھول جانے کی ضرورت ہے۔ اس شیشے کی طرح کی خاموشی کے پرے، ان تاریک راستوں پر آندھیاں چلتی ہیں جہاں خیال رہتا ہے۔ اور یہ اندھیرا زمانہ جس میں ہمارا ماضی اور ہمارا مستقبل محض تشریحی نوٹس کے ذریعے کتب خانوں میں محفوظ کر دیا جائے گا۔ ایسی ہی کسی زمستاں کی رات ہمیں بالآخر فیصلہ کرنا ہو گا۔

کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ عرصے سے سوسائٹی میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ زینب خالہ نے آتشدان کے سامنے بیٹھے ہوئے سوچا ——— سوائے اس کے کہ جمیل نے شیاما نہرو سے شادی کر لی۔ زہرہ شاہ نے کرو تیلے سے، اور عذرا و زہرہ نے رقص کو پیشہ بنا لیا۔ عرصہ سے کوئی زوردار سکینڈل کا قصہ سننے میں نہیں آیا۔ زندگی انتہائی یکسانیت سے گذر رہی ہے۔ اخباروں میں ایک سی خبریں ہوتیں۔ انگریزی فلموں کے ریویو۔ کتابوں پر تبصرے۔ چند مصور مضامین۔ قالینوں کے اشتہار۔ ایک خاتون کا فوکس ٹیریر کھو گیا ہے۔ منگنیوں، پیدائشوں اور اموات کی اطلاعات۔ سکنڈ ہینڈ پیانو کے پتے۔ انگریزی باتصویر رسالے تھے۔ جن کے انبار گیلری کی میزوں پر لگے تھے۔ لیڈیز ہوم جرنل اور سیٹر ڈے ایوننگ پوسٹ۔ سفید پورچ والے وکٹورین مکانوں میں رہنے والی طویل القامت ہیروئنوں کے رومان قسطوں

ہیں ــــ دہشتیں۔ قتل۔ پراسرار شادیاں۔ پرنس چارمنگ۔ پھر خوابوں کی تعبیریں اور آپ کے ذاتی مسائل کا حل جو آپ فوراً شیریں کو خط لکھ کر پوچھ سکتی ہیں ــــ)

یہ نیا زاویہ ہے ــــ زینب خالہ نے جل کر سوچا۔ کہیں پر کم از کم ایک آدھ خودکشی ہی ہو جاتی۔ یا کوئی کسی کو زناٹے سے کار میں بٹھا کر کورٹ پہنچ کے سول میرج ہی کر لیتا ــ آخر یہ سب لوگ کیا کر رہے ہیں۔

صبح کو میں نے دیکھا کہ باغ میں ان گنت زرد اور سفید گلاب کھلے ہوئے تھے "یہ کس نے فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت مجھ کو ــــ" اسٹیلا زور زور سے گاتی کمرے میں آ گئی۔ حسبِ معمول اس کے جوتے کیچڑ میں لت پت تھے اور وہ گھوڑے کی سواری کے بعد آ رہی تھی۔

"ــــ تمنا رقص کرتی ہے، تخیل گنگناتا ہے" میں نے گرج کر شعر پورا کر دیا۔

علی سردار جعفری کی یہ تازہ ترین نظم مستقل ایک "کریز" بن چکی تھی۔

"مسرت کے جواں ملاح کشتی لے کے نکلے ہیں۔ غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے ــ سفینہ ڈگمگاتا ہے ــ" علی نے غسلخانے میں دھاڑنا شروع کیا۔

چنانچہ ہم ایک نئے ڈی کیڈ میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں نے احتیاط سے سوچا۔ نیا ڈی کیڈ۔ یہ صحیح ہے کہ ایک جنگ چھڑ چکی ہے! ورنہ غالباً اس سال ہم فیملی اولڈز موبیل تبدیل نہ کر سکیں گے۔ لیکن بہت سی دلچسپ باتیں ہیں۔ ریڈیو پہ ہم نے کئی نئے پروگرام شروع کر رکھے تھے۔ امانت کی اندر سبھا۔ مور کی لالہ رخ۔ زہرِ عشق۔ "واٹرلو برج" کا اثر ذہنوں پہ طاری تھا۔ فیض بے حد نیا، بے حد انوکھا معلوم ہوتا تھا۔ علی سردار نے یہ نظم لکھی تھی۔ اسکول کے میوزک روم میں رات گئے تک کلاسیکل اوپیرا

کی کوشش کی جا رہی تھی۔

گھاس کہرے کی وجہ سے نئی تھی۔ لان پر ایسی دھوپ تھی گویا ڈرامے کی اسٹیج پر زرد روشنی کے اثر سے پیدا کی گئی ہو۔ کمروں کا فرنیچر صبح کے ہلکے گلابی اجالے میں آہستہ آہستہ ابھرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ "یہ سالِ نو کی صبح ہے"۔ اسٹیلا نے خوشی سے کہا۔

برآمدے میں ممی قناعت سے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہیں۔ ٹوپسی نہایت پیغمبرانہ شان سے پاس سے گذرا۔ ہونہہ۔ غیر مہذب، کتا کہیں کا۔ ممی نے دل میں کہا۔ خود پسند، مغرور عورت۔ کچھ دور جا کر ٹوپسی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اور راتب کے انتظار میں باورچی خانے کی سمت چلا گیا۔

باغوں میں کیا ہو رہا ہے۔ میں گھاس پر آ گئی۔ سناٹا۔ اور اس سناٹے میں ہوائیں ادھر ادھر پھر رہی ہیں۔ ہوائیں کیا کر رہی ہیں۔ سفید پھول ——— جو بیری اسکرٹ پر گر رہے تھے ———

"مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو ———" چھوٹے سے جعفر نے ہولی ہوک کے پودوں کے پاس سے آواز دی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ جاؤ جا کر اولیٹین پڑھو۔" میں نے گرج کر ڈانٹا۔

"——— تم سوچ رہی ہو کہ زندگی کتنی عمدہ شے ہے ———" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور گھاس پر لوٹ لگانے میں مصروف رہا۔

ابا جان بزبانِ انگریزی ایک کوتاہی ہوئی ہے ——— رات کو میں نے نہایت مظلومیت کے ساتھ ابا جان سے عرض کی۔ وہ کلب جانے کے لئے تیار ہو رہے

تھے۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور ہنس پڑے۔

"ابا جان یہ نظم میں نے پرسوں لکھی تھی۔" میں نے بے انتہا باوقار انداز میں مطلع کیا۔

انہوں نے بھی کپڑوں کی ایک الماری سے دوسری الماری تک جاتے جاتے ٹھٹک کر ظاہر کیا کہ ان پر خاطر خواہ رعب پڑ گیا ہے۔ ان کو میری ان ادبی outbursts کی عادت ہو چکی تھی ——— ابا میاں۔ بزبانِ افرنگ ایک قطعہ عرض کیا ہے۔ ابا میاں آجکل Racine کے اسٹائل میں ایک ڈرامہ تالیف کر رہی ہوں ——— ابا میاں ——— ابا میاں Racine کے اس انجام پر آہ بھر کر چپ ہو جاتے۔

پھر آئینے کے سامنے پہنچ کر بالوں پر برش کرتے کرتے وہ رک گئے۔ "علی کہاں ہے۔ ابھی تک تیار نہیں ہوا ———" میں ان کے پیچھے کرسی پر چڑھی ان کے ڈریس سوٹ پر برش کرنے میں مصروف تھی ——— "علی ———" میں خاموش ہو گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ اب تک اپنی کسی میٹنگ سے واپس نہیں آیا تھا۔

"جس وقت علی لوٹے اس سے کہنا سیدھا چھتر منزل آ جائے ———" ابا میاں نے کہا اور برساتی میں اتر گئے۔

میں گیلری میں آ گئی۔ "میرا بیٹا کا فون آیا ہے ———" ہرمزی خانم نے آواز دی۔

"علی آئے تو اس سے کہہ دینا۔ ایم این رائے کو لینے کے لئے ہم اسٹیشن نہیں جا رہے ہیں ———" میرا نلینی دوسرے سرے پر بول رہی تھی۔

ہیں نے اکتا کر ریسیور رکھ دیا۔ علی سارا سیزن مسوری ہیں ہیکٹ ملینز کی فلور اور گھوڑے کی پشت پہ گذارنے کے بعد گھر واپس آتا تو آ کر نہایت سرگرمی سے یونیورسٹی کی سیاست ہیں جٹ جاتا (وہ یہی، ان دنوں اندرا نہرو کے گروہ کے ساتھ شدید قسم کی سیاسی اور ذہنی مصروفیات ہیں وقت گذارنے کے علاوہ وہ اکثر ایم اے کا امتحان دیا کرتا تھا)

"مسرت کے جواں ملاح کشتی لے کے نکلے ہیں ———— کشتی لے کے نکلے ہیں ————" اسٹیلا زور زور سے گاتی ہوئی گیلری ہیں سے گذر گئی۔

علی اپنی میٹنگ سے تھکا ہارا واپس آیا اور اپنے کمرے ہیں جا کر پلنگ کے کنارے منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"ہا ————" اس نے زیرِ لب کہا۔

"تم کو بھی ہا ————" ہیں نے جل کر جواب دیا۔ ہیں اس کی کتابوں کی الماری ہیں کوئی کتاب تلاش کر رہی تھی۔

فاڈل اسٹکس۔ اس نے پھر کہا۔

"کیا بات ہے ————" ہیں نے اس سے پوچھا۔

وہ چپ رہا۔

"تم ہیں اتنی تمیز باقی نہیں رہی ہے کہ وقت پہ آ کر ابا جان کے ساتھ ڈنر ہی ہیں بیٹھے جاتے ———— اور للّٰلہ اپنی ان کمبخت مصروفیات کا ذکر نہ کرنا۔ تمہارے جیسے نکمّے ذہن پرست بہت دیکھے ہیں۔ خدا کے لئے اب کوئی اسٹیج کے تاثر والی

گفتگو نہ شروع کرو ـــــ" میں نے غصے سے کہا۔

وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"پیا و بکلی کہاں ہے ـــــ" میں نے چڑ کر اس سے پوچھا۔

"علی ـــــ" دروازہ کھلا اور اسٹیلا اندر آئی۔ وہ اب تک سردار جعفری کی نظم گنگنا رہی تھی۔ "علی ـــــ" اس نے فرش پر بیٹھ کر بات شروع کی ـــــ "تم کو اگلے ہفتے گوپال پور بھیجا جا رہا ہے۔"

علی نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اسٹیلا کو غور سے دیکھا اور اس اطلاع کے معنی سمجھنے کی کوشش کی۔

"کس نے کہا ہے ـــــ؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"خالو میاں نے۔ ابھی وہ ڈنر سے واپس آئے ہیں۔ نانا ابا کا گوپال پور سے خط آیا ہے۔" اسٹیلا نے سادگی سے جواب دیا۔

علی نے پھر اسے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"جس کا مطلب ہے ـــــ" اسٹیلا نے کہنا شروع کیا۔ "کہ آیندہ آپ یونیورسٹی کے الیکشن نہیں لڑیں گے۔ الہ آباد کے چکر نہ لگائیں گے امتحانات دینے کا سلسلہ ختم کیجیے۔ گوپال پور جا کر سیر کیجیے۔ اور زمینوں کا کام سنبھال لیجیے۔"

"بے حد ہزاروں ایکڑ زمینیں ہیں۔ جن کے ذکر سے آپ کو اتنی شدید طمانیت محسوس ہو رہی ہے ـــــ" علی نے کہا۔

"بہر حال۔ مجھ کو اس خیال سے ضرور طمانیت محسوس ہو رہی ہے کہ آپ اس وقت خود کو شہید اور مظلوم و مجبور محسوس کر رہے ہیں۔ تم تو ان لوگوں میں سے ہو

جن کی نفسیات ٹھیک کرنے کے لئے انہیں ریفارم اسکولوں میں بھیجنا چاہیئے ۔۔۔"
اسٹیلا نے جواب دیا۔
علی خاموش رہا۔
"کس قدر شدید اینٹی کلائمکس ۔۔۔۔" میں نے انتہائی کمینے پن سے کہا ۔۔۔
"دو تین سال آپ گوپال پور میں رہیئے۔ مقدمے لڑئیے، اکوں پر بیٹھ کر دوسرے زمینداروں کے یہاں آیئے جایئے۔ مہینے میں ایک آدھ بار کسی تیتریا کا ناچ بھی منعقد کروا لیا کیجئے گا ۔۔۔۔ اور ہم سب سے مستقل خفا رہیئے گا۔"
"بکواس بند کرو ۔۔۔۔" اس نے غصے سے جھنجھلا کر کہا۔
"دو تین سال آپ گوپال پور میں تشریف رکھیئے اور گنگا کے کنوئیں والے مکان کو رہن سے چھڑانے کی کوشش کیجئے۔ صرف پچاس ہزار۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہر سیزن میں آپ مسوری میں کئی ہزار خرچ کرتے ہیں۔" اسٹیلا نے اسی آواز میں کہا۔
"مجھے کب روانہ ہونا ہے؟" علی نے سکون کے ساتھ پوچھا۔
"خالو میاں کہہ رہے تھے کہ اگر آپ کل یا پرسوں ہی تشریف لے جائیں تو بہتر ہے۔ گوپال پور کوئی کلکتے کے قریب نہیں ہے۔ یہاں سے صرف پچیس کوس کا فاصلہ ہے جو آپ شکار وغیرہ کے سلسلے میں اکثر طے کرتے رہتے ہیں۔" اسٹیلا نے جواب دیا۔
علی پلنگ پر سے اٹھا اور لمبے لمبے قدم رکھتا باہر چلا گیا۔ میں اور اسٹیلا اسے درختوں کے اندھیرے میں اوجھل ہوتا دیکھتے رہے۔
کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ ہمارے خاندان کے متعلق ایک نہایت غرسٹ کلاس

رسوشل، فلم تیار ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارا انتہائی دردناک، شاعرانہ، اور خیال آفریں پس منظر۔ اللہ کی قسم اگر میں لکھنا جانتی تو ایک نہایت رقت انگیز Best seller تصنیف کر ڈالتی ——— !!" کچھ دیر بعد میں نے اسٹیلا سے کہا۔

"——— ہیرو ایک ذہین، خیال پرست نوجوان جس سے خاندان کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں ——— اور لڑکیاں۔ یعنی ہم سب کی سب، پیشانیوں پر ٹیکے اور جھپکے لگائے، جھکا جھول کامدانی کے دوپٹے اوڑھے چھم چھم کرتی پھر رہی ہیں پردۂ سیمیں پر میں ان سب مناظر کا تصور کر سکتی ہوں ———" اسٹیلا نے بشاشت سے کہا۔ "مگر اللہ قسم ہم لوگ کیسے خشک سالی کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں کہ علی سے بات کرو تو وہ میلوڈرمیٹک بننے کے بجائے خاموشی سے باہر چلا جاتا ہے۔ ورنہ موقع کی اہمیت کا تقاضہ یہ تھا کہ ہوا میں ہاتھ ہلا کر وہ ایک تقریر کرتا۔"

"اور جھکا جھول کامدانی کے بجائے ہم لوگ میرمیٔ لنن کے اسکرٹ پہنے بیٹھے ہیں ———" میں نے اداسی سے اپنے اسکرٹ کو دیکھا۔

۱۵

گوپال پور رام گنگا کے کنارے آباد ہے۔ اس میں زیادہ تر اکھ اور خربوزوں کی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں کے سفیدے اور لنگڑے بہت مشہور ہیں۔ قصبے کی کچی سڑک بازار سے ہٹ کر پرانی سرائے کی طرف جاتی ہے۔ پرانی سرائے ہمارے آبائی مکانات کے مجموعے کا نام ہے جو ایک فصیل کے اندر بنے ہوئے ہیں۔ یہ فصیل کہیں کہیں منہدم ہو چکی ہے۔ گو اس کے چاروں پھاٹک اب تک باقی ہیں۔ ایک پھاٹک میں ڈاک خانہ ہے جس میں منشی جی بیٹھے پی۔ او گوپال پور کی مہریں خطوں پر لگاتے رہتے ہیں۔ سامنے کے پھاٹک میں ایک سکھ پال، ایک گھوڑا گاڑی ایک ادھا اور دو تین بان کی چارپائیاں موجود رہتی ہیں۔ باقی کے دونوں پھاٹکوں میں اندر کام کرنے والے آباد ہیں۔ باہر کے باغ میں گھنٹہ لٹک رہا ہے۔ اس سے آگے بڑا چبوترہ ہے۔ پھر صحنچیاں اور بارہ دری۔ جب ضلع کا کلکٹر دورے پر آتا ہے تو اس کی کشتی سیدھی لا کر رام گنگا کے اس گھاٹ سے لگا دی جاتی ہے جو پرانی سرائے کے پھاٹک سے ملا ہوا ہے۔ اور کلکٹر فوں فوں کرتا نواب صاحب سے ملنے کے لئے بارہ دری کی طرف جاتا ہے۔

گوپال پور کئی پشتوں سے مقروض ہے اور اگر ایک مقررہ میعاد کے بعد تک اس کا قرضہ ادا نہ ہو سکا تو اسے کورٹ آف وارڈز کے سپرد کر دیا جائے گا۔

نواب صاحب یعنی نانا ابا اسی طرح بارہ دری میں بیچارے گڑگڑاتے رہیں گے۔ لیکن اس شکستہ فصیل کے باہر ان کا کوئی دخل نہ رہے گا۔

علی اپنے کمرے کے آگے کی چھجی میں ڈریسنگ گاؤن پہنے کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا ہے۔ شام کی تاریکی پھیلتی جا رہی ہے۔ دور رام گنگا کی سطح پر چلنے والی کشتیوں میں روشنیاں ٹمٹما رہی ہیں۔ اس کے آس پاس ساری خدا کی زمین پھیلی ہوئی ہے۔ تین چوتھائی لگان جو وہ اپنے کسانوں سے لے گا۔ اس کا پینتالیس فی صدی حصہ اگر وہ سرکاری خزانے میں داخل نہ کرتا رہا تو بہت جلد یہ زمین کورٹ میں چلی جائیگی۔ زندگی کا کس قدر طے شدہ مکمل پیٹرن ہے۔ اس کو اسی پیٹرن میں رہنا ہے۔ بہت خوب۔ چھجی کے در میں سے پیر ہٹا کر وہ اندر کی طرف مڑا۔ برابر کے دالان میں امیر مینائی کے اشعار پڑھے جا رہے تھے۔ پرانی سرائے میں اس کی آمد سے خاصی گہما گہمی تھی۔ " علی میاں گوپال پور میں رہنے خاطر آئے ہیں " وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

بھیا آویں علی علی۔ چھول کھیو دل گلی گلی۔ ایک مہری نے فوراً مناسبت سے اس کے لئے شعر پڑھا۔ علی نے نظر اٹھا کر اسے پیار سے دیکھا۔ یہ سب کتنے پیارے انسان تھے۔ وہ ان کے لئے کیا کرے گا ——————

وہ ڈیوڑھی کے اندر گیا۔ مختلف آنگنوں میں بچے اونچا نیچا ٹیلہ کھیل رہے تھے۔ ایک طرف چکی چل رہی تھی۔ پچھلے دالانوں میں کھانا پکایا جا رہا تھا۔ بیگمات اپنی پلنگڑیوں پر بیٹھی ڈلی کاٹ رہی تھیں۔ کچھ عشار کی نماز کی تیاریوں میں صحن میں ادھر ادھر آجا رہی تھیں۔ بیشتر کہ خاندان کے رہن سہن کے یہ مناظر تصویر کی طرح اس کے چاروں

اور پھیلے ہوئے تھے۔ اناروں کے نیچے گھوم پھر کے، اور ساری فصیل کا ایک چکر کاٹ کر وہ پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔

رفتہ رفتہ سارے میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد باغ کا گھنٹہ بج اٹھتا۔ وہ صحنچی کے در کے قریب لیٹا دریا کی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔

دفعتاً ڈیوڑھی کے اندر سے مدھم سا شور بلند ہوا اور پھر بہت سی آوازیں چاروں طرف پھیل گئیں۔ دوڑ بھاگ بھی شروع ہو گئی۔

اچانک ایک لڑکی صحنچی کے ایک در میں سے چھلانگ لگا کر اس کے پلنگ کے قریب آن گری۔

بھیا ——— اللہ آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے یہاں چھپ جانے دیجئے ——— اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

"کیا ہے ——— کون ہے تو ———؟" علی نے لیمپ جلا کر حیرت سے اُسے دیکھا۔

"بھیا ———" وہ کانپ رہی تھی ——— "از برائے خدا کسی کو نہ بتلائیے گا کہ میں یہاں ہوں ———"

صحنچی کے دروازوں کے اوپر کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ علی نے جلدی سے ساری چٹخنیاں لگائیں اور لیمپ کونے میں رکھ دیا۔ پیادے باہر سے گزرے۔ "بھیا رہے ہیں ———" انہوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہا۔ اور آگے چلے گئے ——— لڑکی سہمی ہوئی ایک کونے میں بیٹھی رہی ——— علی نے جھک کر اُسے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی "تو کبھی شہر آئی ہے ———؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ہاں بھیا ۔۔۔۔ میں تب بھی آئی تھی جب آپ نے بی اے پاس کیا تھا اور کوٹھی پر رت جگا ہوا تھا۔ گنگر کے گنویں بھی جا کر رہتی ہوں ۔۔۔۔" اس نے جواب دیا۔ علی کو یاد آیا۔ ساری رات اس سانولی، خوش شکل لڑکی نے ڈھولک پر علی کے پسندیدہ گیت گائے تھے۔

"تو ہمیشہ رہے نا ۔۔۔۔" علی نے پوچھا۔

"جی ہاں ۔۔۔۔ بھیا۔ میں لنگر کے گنویں پر تھی۔ پھر مجھے یہاں لا کر بند کر دیا گیا کہ یہاں سے نکل کر کہیں نہ جا سکوں ۔۔۔۔" اب اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"کیوں ۔۔۔۔" علی نے تعجب سے پوچھا۔

"رعنا بھیا کا حکم ۔۔۔۔" اس نے کہا۔

"اچھا ۔۔۔۔" علی خاموش ہو گیا۔

"رعنا بھیا نے میرے بچپن سے میرا نکاح پڑھوا دیا تاکہ میں کبھی ان کے گھر سے نہ نکل سکوں ۔۔۔۔ میں اس ٹوٹے انجیے بڈھے کی بیوی بن کر ہرگز نہ رہوں گی ۔۔۔۔ بھیا میں گنگا میا میں جا کر ڈوب مروں گی۔ رام گنگا میں کود جاؤں گی ۔۔۔۔" اس نے دوپٹے میں منہ چھپا کر سسکیاں لینی شروع کیں۔

"اچھا ۔۔۔۔ تو آج تیرا بھاگ نکلنے کا پروگرام تھا ۔۔۔۔" علی نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

وہ روتی رہی۔

"کس کے ساتھ بھاگ رہی ہے ۔۔۔۔ بتا ۔۔۔۔" علی نے خوش مزاجی سے مطالبہ کیا۔

"کسی کے ساتھ نہیں ——— اکیلی ———" لڑکی نے گویا اعترافِ جرم کیا۔
علی کو اس کی ہمت پر تعجب ہوا اور اپنے گھرانے کے اس ماحول سے شدید تکلیف اس نے محسوس کی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس طرح کے واقعات وہاں آئے دن ہوتے رہتے تھے۔

"بھیا میں بھاگ کر کسی دور کے گاؤں چلی جاؤں گی ——— ٹھہر گئی تو رضا میاں پھر پکڑ والائیں گے ———" اس نے کہا۔

پھاٹک پر پھر آہٹ ہوئی۔ لوگ اسے تلاش کرتے ہوئے غالباً دوسرے پھاٹکوں کی طرف نکل گئے تھے ——— علی نے جلدی سے دروازہ کھولا ——— "اچھا تو نکل جا ——— ٹھہر، میں تجھے خود باہر تک پہنچا کے آتا ہوں ———" وہ کھینچ کے باہر آیا ——— رات کی ہوائیں خنکی اچھلی تھی اور آنگن میں بیلا پھول رہا تھا۔

"بھیا ———" بختاور نے سہم کر کہا ——— "اگر اس وقت کسی نے مجھے آپ کے کمرے سے نکلتا دیکھ لیا تو میں بن موت ماری جاؤں گی۔ للہ آپ اندر چلے جائیے ———"

"یہ تو اکیلی بھاگے گی کیسے ———" علی نے پریشانی سے کہا ——— بختاور نے ٹوٹی پھوٹی فصیل کی طرف قدم بڑھائے ——— "اور سن تو ——— تیرا تو نکاح ہو چکا ہے۔ تو بھاگ بھی کس طرح سکتی ہے۔ وہ تجھے پھر پکڑ لائیں گے۔" علی نے کہا۔

"للہ بھیا مجھے جانے دیجئے ——— میں چلی جاؤں گی۔" اس نے گڑگڑا کر کہا۔
علی نے احتیاط سے اس کو اٹھایا اور فصیل کے ٹوٹے ہوئے حصے پر چڑھا کر دوسری طرف اتار دیا۔

صبح کو وہ نواب صاحب کو سلام کرنے کے لئے بارہ دری میں گیا۔ اُن کی تیوری پر بل تھے۔ انہوں نے ایک زوردار ہونہہ کی اور ابرو کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ علی کو یقین ہو گیا کہ رات کے واقعے کی خبر ان کے کانوں تک پہنچ چکی ہے کہ بختاور نے علی کی پناہ میں رات گذاری اور اُس نے بختاور کو بھاگنے میں مدد کی۔

"ہم جانتے تھے میاں صاحبزادے کہ تم کو ان قصیوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی ——" نواب صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

"جی نانا ابا ——" علی نے گلا صاف کیا۔

"تم کو احساس ہونا چاہیئے کہ یہ اس طرح کے جھگڑے کیسے ہوتے ہیں۔ رضا میاں تمہارے خالہ زاد بھائی ہیں۔ اس واقعے سے وہ بہت جزبز ہوئے ہیں —— آئندہ احتیاط رکھنا ——" نواب صاحب نے کہا۔

"جی نانا ابا ——" علی نے کہا۔

دوپہر کو وہ اناروں والی روش پر سے گذرتا اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ جب رضا میاں سے اس کی ملاقات ہوئی۔

"میں نے کہا۔ بندگی عرض کرتا ہوں میاں شہزادے ——" انہوں نے جھک کر کہا —— علی نے ان کو غور سے دیکھا۔ باریک مونچھیں۔ سفید رنگت۔ پتلی کمر۔ سرگیں آنکھیں۔ جامدانی کے انگرکھے میں خاصے چھیلا نظر آتے تھے۔

"تسلیمات ——" علی نے ان کو مختصراً جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ فصیل کے پچھلے پھاٹک کے نزدیک پہنچکر وہ دلارے چچا کے مکان کی طرف مڑ گیا۔

دلارے چچا ایک اور رشتے دار تھے جو کیننگ کالج سے بی اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد اب شاعری کرتے تھے۔ ٹبر کے زمانے کے عیش دیکھے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ اپنے چبوترے پر مونڈھے پہ بیٹھے پائنیر کا مطالعہ کر رہے تھے۔

کس قدر طمانیت اور سکون سے دلارے چچا زندہ ہیں۔ علی نے خیال کیا۔ آخر کچھ نہ کچھ تو انہوں نے کر ہی لیا تھا۔ مثلاً ٹاؤن ہال کے باغ میں بنچیں رکھوانے کے ریزولیوشن میں زیادہ تر ان کا ہی ہاتھ تھا۔ گرلز اسکول کی لاری پہ نیا رنگ کرانے کے لیے چندہ بھی انہوں ہی نے جمع کروایا تھا۔ آم کے باغات کی نگہداشت کے سلسلے میں ایک کتابچہ انہوں نے تصنیف کیا تھا جو نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا۔ چار آنے انہوں نے اس کی قیمت رکھی تھی۔ ایک اور نو صفحات کی کتاب انگریزی میں انہوں نے ہارووڈ صاحب سابق کلکٹر کے ان ریمارکوں کے بارے میں لکھی تھی جو انہوں نے کورٹ اوف وارڈز میں کیے۔ پائنیر کے اڈیٹر کو وہ اکثر خطوط لکھتے رہتے تھے جو اکثر چھپتے بھی تھے۔

علی نے ان کو بڑی محبت سے دیکھا ــــ مجھے دلارے چچا کو بھی زندگی کا راستہ دکھانا ہے ــــ اس نے خیال کیا۔

بہت دیر تک دلارے چچا اس سے ادھر ادھر کی مزیدار باتیں کرتے رہے ــــ دفعتاً انہوں نے رک کر حقّے کی نے کو دیکھا ــــ "علی میاں ــــ" انہوں نے بالکل ایک دوسری آواز میں کہنا شروع کیا۔ "ہم لوگ زندہ نہیں ہیں اور زندگی ہمارے لئے بڑی دشوار گذار ہے ــــ دل و دماغ کا سکون کہیں کھو گیا ہے۔ خدا ایک نہیں رہا ہے۔ خدا کئی ہو گئے ہیں۔"

علی خاموشی سے سنتا رہا ——

"نعوذ باللہ ——" انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مجھے اس طرح کی باتیں شاید نہیں کہنی چاہئیں ——"

"سنا تم نے اسٹیلا بی بی ——" علی نے اپنے کمرے میں آ کر رات کو لکھنا شروع کیا —— "خدا ایک نہیں رہا ہے۔ —— یعنی گویا لپور میں بھی —— !

یہاں ہیں ان کے لئے اور اپنے لئے ایک راستہ تلاش کروں گا ——"

لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اسٹیلا اس خط کو بھی انتہائی رومینٹک حرکت سمجھ کر ہنسے گی۔ اس نے خط پھاڑ دیا۔ پھر اس نے میرا کو خط لکھنا چاہا۔ "میرا رانی جب تم انتہائی پولشڈ اور انٹیلکچوئیل انداز سے لوگوں سے ہلکا ہلکا فلرٹ کرتی ہو اور دوسروں کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے خوش ہوتی ہو۔ اس وقت اس لڑکی کا خیال کر لینا جس نے کل رات میرے پاس آ کر پناہ لی تھی۔ وہ بھی تمہاری طرح دلکش ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح گا اور ناچ سکتی تھی۔ وہ بھی تمہاری طرح فلسفوں کی باتیں کر سکتی تھی۔ لیکن رضا میاں نے میرے چپن سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ جب تک چاہیں اسے اپنے تصرف میں رکھ سکیں اور —— میری اب تک امپریشن ایبل عمر ہے —— یہ سب لکھتے لکھتے اسے خیال آیا۔ اور اس نے یہ خط بھی پھاڑ کر پھینک دیا۔

اور یہ اس خط کی نقل ہے جو تحصیلدار گوپال پور کی طرف سے صاحب کلکٹر بہادر مسٹر روڈرک کیمپبل حاکم ضلع کی خدمت میں پندرہ نومبر سن بیالیس عیسوی کو بھیجی گئی ۔

حضور فیض گنجور والا تبار سرکار عالی مدار جناب ٹامس روڈرک کیمپبل صاحب بہادر۔
فدوی بعد ادائے آداب خادمانہ کے عرض پرداز ہے کہ بموجب حکم حضور والا کے ناچیز نے اپنے عملے کے اور نیز خان صاحب سعادت اللہ خاں انچارج تھانہ گوپال پور تحصیل ہذا کی کڑی نگرانی نقل و حرکت پر صاحبزادہ صاحب بہادر کے گزشتہ ڈیڑھ سال تک رکھی۔ اس دوران میں انہوں نے مختلف موضعجات تحصیل ہذا میں فتنہ پیدا کرنے کی بہت کوشش کی۔ رعیت کو متعدد مواقع پر لگان کی رقم میں کمی کر دینے پر اکسایا۔ ایک فوجداری ان کے گوپال پور آنے کے تیسرے دن ہی وقوع پذیر ہوئی جبکہ انہوں نے یہاں آتے ہی مسماۃ بختاور کو جو ایک شادی شدہ عورت ہے راتوں رات یہاں سے نکلوایا۔ بوجہ اس کے پچھلے سال میں کئی فوجداریاں نواب زادہ رضا قاسم کے ساتھ ہوئیں۔ حضور کے علم کے مطابق بذریعہ ڈپٹی صاحب بہادر حاکم پرگنہ ثبوت مہیا ہوا کہ صاحبزادہ صاحب کی تحریک اور ایما سے اعظم نگر میں غلے کے گودام لوٹے گئے۔ چونکہ قرضے کی ادائیگی کی اب تک تحریک نہیں ہوئی ہے جو گوپال پور پر واجب آتا

ہے، اس لئے اس کے سلسلے میں کمترین حضور پر نور کی ہدایات کا منتظر ہے۔

فقط

سید زوار حسین رضوی

(علیگ)

تحصیلدار

تحصیل ہذا

پچیس مئی سن بیالیس عیسوی کو گوپال پور کورٹ اوف وارڈز میں دے دیا گیا۔

۱۷

ہر دلچسپ اور آرام دہ دن ختم ہوتا ہے اور اپنے پیچھے خوف اور تکلیف کا احساس چھوڑ جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ میری اپنی گلیاں اور سڑکیں، میرے اپنے باغات، میرے لئے اجنبی ہیں۔ کہر آلود شاموں میں اس خوف کو میں نے تنہا محسوس کیا۔ کیا میں پچھلے برسوں کے موسم ہائے گل کو بھول چکی ہوں۔

کیا ان سب چیزوں کو دوام مل سکے گا۔ راستے کے سرے پر کسی کار نے گیئر تبدیل کیا۔ ڈلیسی پھاٹک کے سامنے سے اچھلتا ہوا بھاگا۔

لمحہ۔ اور اس کے بعد لمحہ۔ اور اس کے بعد لمحہ۔ ہفتہ کے گھنٹے۔ ان گنت ابوالہول وقت، سال بیتتے چلے جا رہے ہیں (یہ سن بیالیس ہے ——— لمحات کے تسلسل کا ایک اور واقعہ۔ اور مس جیو، مس کیتھلین پرسوں رات مر چکی ہیں۔ پرسوں، اتوار کی رات کو، انہوں نے خود کو، اپنے نام، اپنے وجود کو اس بڑے، پھیلے ہوئے سوچتے ہوئے ماضی میں داخل کر دیا، ہاتھ ——— ان کے سفید ہاتھ جو جین آسٹن کے ناولوں کے ورق پلٹتے تھے، باجے کے سفید اور سیاہ پردوں پر "لیے اف ڈبلن" بجاتے تھے، ہاتھ، ایک سیاہ بکس میں برابر برابر رکھ دیئے گئے ہیں) میں نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ باغ میں پانی کی جو مشین چل رہی ہے۔ گھاس میں جس طرح

پانی جذب ہو رہا ہے۔ باڑ کی دوسری جانب جس طرح زرتی کی مشق کی جا رہی ہے۔ میرے پاس یہ بہت معمولی چیزیں ہیں۔ بہت معمولی واقعات۔ اور میرے گھر، میرے باپ کے گھر کے چاروں طرف، زرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ اور موگرے کے پہلے پھول کھل رہے ہیں۔

راستے کے کنارے ایک اندھا اینگلو انڈین سپاہی اپنے سارے تمغے اور ربن لگائے آنے جانے والوں کو صبح بخیر کر کے ان کے سامنے اپنی ٹوپی پیش کر دیتا ہے۔ (میں نے دیکھا ہے کہ اس کی ٹوپی میں چار آنے الگ الگ بکھرے پڑے ہیں)

امن۔ امنِ کامل۔ کیا میرا یہ غرور ختم کر دیا جائے گا۔

اگست کی بارش نے چھتوں پر جلترنگ بجانی شروع کر دی ہے اور سرخ چھتوں کے نیچے سے ایک ٹرین آہستہ آہستہ گزر رہی ہے۔

میں اور میرے ساتھ میرا دشمن، میرا دوست، جو ازل سے میرے ساتھ ہے اس دریچے کے نیچے موجود ہے۔ سڑک پر سے گزر رہا ہے۔ کسی انجانی سرزمین کی طرف سے سفر کرتا ہوا میری سمت آرہا ہے۔

میری سمت آرہا ہے

میری سمت آرہا ہے

۱۸

جنگل کے سرے پر انھوں نے ایک ویران ریسٹ ہاؤس کے شاگرد پیشے میں آخری مرتبہ پر چھپنے کا ارادہ کیا تھا۔ بلیا کے اس دور افتادہ گاؤں پر رات نہایت بے اعتنائی سے جھکی ہوئی تھی۔ شاگرد پیشے کے پچھلے برآمدے میں تین طرف سے تیز ہوائیں آرہی تھیں، جس سے آگ کی چنگاریاں بھڑک جاتی تھیں۔ گیلی لکڑیاں کے الاؤ کی مدھم روشنی میں وہ صبح کے منتظر تھے۔

"ہمارے پاس ایک مشین گن بھی ہے ——" سجاتا رائے نے بے حد خوشی سے کہا۔

"تم کیوں ہو۔" اتل سنہا نے اسے غور سے دیکھا —— "تم کو واپس جانا چاہیے تھا۔ اس قدر رومینٹک بننے کی مطلق ضرورت نہیں۔"

سجاتا رائے نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ آرام سے آگ کو دیکھتی رہی۔ "اس کمبخت نیلی آنکھوں والے ڈپٹی کمشنر کا اگر ہم آج رات خاتمہ کر سکتے ——" اس نے پھر سوچتے ہوئے کہا۔

نیلی آنکھوں والا ڈپٹی کمشنر۔ اتل سنہا نے جھنجھلا کر دل میں دہرایا —— ان بدمعاش راج دلاریوں کو کس حکیم نے رائے دی ہے کہ کسی موقع پر بھی پیچھے نہ رہ جائیں۔ رومان مگر ہر جگہ دماغ میں گھسا ہوا ہے —— نیلی آنکھوں والا ڈپٹی کمشنر ——!!

چنانچہ یہ صحیح ہے کہ فیض آباد روڈ کی اس کوٹھی کے موٹر گیرج میں سے خفیہ پریس برآمد ہُوا ـــــ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے سعید الزماں نے سوچا ـــــ خدا کی قسم ـــــ انقلاب بالآخر آن پہنچا ـــــ بالآخر آن پہنچا۔

"کیا بجا ہوگا ـــــ پارٹنر ـــــ" پرال پر لیٹے لیٹے علی نے کروٹ بدل کر سوتی سوتی آواز میں پوچھا ـــــ جہنم میں جائے یہ سعید الزمان انصاری ـــــ علی نے شعلوں کی دھندلی روشنی میں ایک آنکھ کھول کر سعید الزماں کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس وقت بھی یہ مجھے دیکھ کر یہی سوچ رہا ہوگا کہ میں کسی روسی ناول کا ہیرو ہوں ـــــ لاحول ولا قوۃ ـــــ اسے اسی طرح پرال پر لیٹے لیٹے خیال آیا ـــــ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ پورے دو مہینے سے خالص جرائم پیشہ لوگوں کی طرح ان گاؤں میں چھپا پھر رہا ہوں۔ کہ آنریبل ایلمر رکسٹن کو میری گرفتاری کا وارنٹ جاری کیئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ کہ آنریبل ایلمر رکسٹن اس وقت میرے گھر والوں کے ساتھ، نرکلوں کے جھنڈ کے اس پار، میرے خالو کے کیمپ میں ڈنر کے بعد برج کھیل رہا ہوگا۔

شاگرد پیشے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں میں سے انہوں نے دیکھا کہ جنگل کے افق پر صبح کا اجالا پھیل چکا ہے۔

زینب خالہ گارڈن چیئر پر بیٹھی صبح کی کافی پی رہی تھیں۔ نرکلوں کے پرے سے کبھی کبھی گولیوں کے چلنے کی آواز آ جاتی تھی۔ اسٹیلا اور راحیل ایک درخت کی شاخ پر نیم دراز باتوں میں مصروف تھیں۔ میں درخت کی جڑ پر اکڑوں بیٹھی جلدی

جلدی اکنومکس کا ایک باب ختم کرنے کی کوشش میں مصروف تھی (یہ درست تھا کہ ہم ایک ہفتے کے لیے خالو میاں کے ساتھ ان کے کیمپ پر آ گئے تھے اور مزید تفریح کے خیال سے نجم الدولہ ہاؤس سے راحیل کو بھی ہمراہ لیتے آئے تھے، لیکن یہ بھی ایک واقعہ تھا کہ یہاں سے واپس جاتے ہی سہ ماہی امتحانات کی تیاری کرنی تھی)

"بارش آنے والی ہے۔ اندر چلو ——" زینب خالہ نے آسمان کو دیکھ کر کہا۔

دوسرے لمحے ہم نے خالو میاں کو سرپٹ گھوڑا دوڑاتے خیموں کی طرف آتے دیکھا۔ "تم لوگ فوراً اندر جاؤ ——" انہوں نے پریشان آواز میں کہا۔ "کل رات بھر میں تین اور بکیوں کا صفایا کر دیا گیا —— جیرلڈ کدھر ہے —— ؟" انہوں نے اپنے انگریز اے۔ ایس۔ پی کو آواز دی جو کچھ فاصلے پر ایلمر کیتھ کے خیمے میں بیٹھا دم پینے میں مشغول تھا۔

کینوس کی کرسیاں خیمے کے سامنے کھینچ کر وہ تینوں ضلع کی حفاظت کے مزید انتظامات کی اسکیمیں تیار کرنے میں منہمک ہو گئے۔ ہمارے خیمے کے سامنے گارد دوہری کر دی گئی۔

"اگر بکیوں کا صفایا ہو گیا تو اللہ کے فضل سے بیٹا لوگ اب سڑک سڑک بھی لکھنؤ واپس نہ جا پائیں گی۔ ریل کی پٹریوں پہ تو اللہ ماروں نے پہلے ہی جھاڑو پھیر دی۔" ہرمزی خانم نے ہاتھ ہلا کر کہا اور باورچی خانے کے خیمے کی طرف چلی گئیں۔

راحیل اور اسٹیلا نشست کے خیمے میں آ گئیں۔ میں نے کتاب بند کر دی،

اور ایک کرسی سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ راحیل اور آسٹیلا خاموشی سے سامنے ٹیلوں کو دیکھتی رہیں (ہم علی کا ذکر ایک دوسرے سے کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ ایک پُر اسرار، کافی مقدس سے اور مقدس موضوع گفتگو میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس وقت اگر ہم جان سکتے کہ علی کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے)

اور کھانے کے بعد زینب خالہ البرٹ اور جیرالڈ کے ساتھ تاش کھیلیں گی۔

البیر کیستین اپنے خیمے میں آرام کرسی پر اکتایا ہوا بیٹھا تھا۔ میں بدھ ہوں۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔ میں سینٹ آگسٹین ہوں۔ وہ خوشی سے اپنے ناخنوں کو دیکھتا رہا۔ جنگل کے پتوں کی یہ مہک سخت تکلیف دہ ہے۔

"این —" اس نے دفعتاً مجھے بے حد غور سے دیکھتے ہوئے اپنی پرانی آواز میں کہا۔ "سینٹ این —— تم کو ہمیشہ اتنا ہی حسین نظر آنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے سینٹ این کی رنگت بالکل یہی تھی۔"

"لگ بھگ میرا اپنا مریا ——" اس نے میز پر جھک کر یکلخت اپنی گہری انسانی آواز میں کہا —— "علی کہاں ہے ——؟"

علی —— میں نے لحظہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں کو دیکھا —— البیر کیستین سوال کر رہا ہے۔ علی کہاں ہے۔

میں دفعتاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اگر تم بتا دیتیں کہ علی یہیں کہیں موجود ہے تو میں آج شام کو جالن پور کے جنگل میں فائرنگ نہ کرواتا ——" اس نے مدھم، گونجتی ہوئی، آواز میں سوچتے ہوئے کہا۔

ہم خیمے سے نکل کر پگڈنڈی پر آ گئے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ چلیندے کے درخت کے نیچے، گھاس پر بیٹھی ہوئی استھیلا نے ریکارڈ بجانے شروع کر دیئے تھے۔ دفعتاً وہ چلتے چلتے رک کر کھڑا ہو گیا۔ اور غیر یقینی سے انداز کے ساتھ موگرے کے پھولوں کو دیکھنے لگا جو پگڈنڈی کے نیچے کھل رہے تھے۔ درخت کے پتوں میں سے جھیل کا پانی نظر آ رہا تھا۔ کنارے پر ایک بطخ سو رہی تھی۔ نشست کے خیمے کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے پگڈنڈی پر سے نیچے اترنے میں اپنے پرانے ایلیگنٹ انداز میں مدد دی۔ اس کی چھوٹی انگلی میں جو بھاری سی سونے کی انگوٹھی تھی اس کا نیلا، مدھم سا گھسا ہوا پتھر بے حد برساتی ہوا کی وجہ سے بے حد خنک تھا۔ مجھے نیچے اتار کے اس نے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیا اور انگوٹھی کی اس خنکی کو محسوس کرتا رہا (Not blown by every wind

———— اس نے دل میں دہرایا)

اسٹیشن ویگن جس کے ساتھ مسلح گارد تھی، ایک ندی کے کنارے رکی کھڑی تھی۔ اگلی صبح ہم لوگ لکھنؤ واپس جانے کے لئے اپنا آدھا سفر ختم کر چکے تھے۔ جب جیرلڈ نے کار روک کر بتایا کہ اگلا پل بھی اڑا دیا گیا ہے۔

"صوبے کے یہ سارے اضلاع اس گرینڈ ڈیمیڈ دیوانگی کا شکار ہو رہے ہیں جس کو دیسی پریس نہایت رومینٹک انداز میں کرانتی کے شاعرانہ نام سے یاد کر رہا ہے۔" ایمر رگبیشن نے اسٹیشن ویگن کے قریب آ کر اپنی کار روکتے ہوئے ریاض سے کہا۔ جو کسی ہنگامی سرکاری کانفرنس میں شرکت کے لئے دلی سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے،

اور اپنے دوسرے رفقائے کار کے ساتھ، حالات کا اندازہ لگانے کے لئے دورہ کرتے کراتے اس جنگل تک آ گئے تھے۔ صبح سے وہ ایلمر رگسٹن کی معیت میں تھے۔

اسٹیشن ویگن کے نزدیک کار کھڑی کرتے ہوئے ایلمر رگسٹن نے جھک کر ریاض کا سگریٹ جلایا اور جیرلڈ کو آواز دی جو اسٹیشن ویگن کے قریب کھڑا آسمان پر اڑتی ہوئی مرغابیوں کو دیکھتا تھا۔

میں اور راحیل تھک کر موٹر کے فٹ بورڈ پر بیٹھ گئے۔ اسٹیلا اور زینب خالہ پچھلی سیٹوں پر نیم دراز تھیں۔ دوسرے لمحے ایک اور کار جو پیچھے آ رہی تھی۔ قریب آ کر ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور ایلمر رگسٹن ایک اور انسان کے ساتھ اس میں سے اتر کر ہماری جانب آتا دکھائی دیا۔ جیرلڈ ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر فوراً اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

" غالباً ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں ——— " ایلمر نے ریاض کو دیکھتے ہوئے غیر یقینی سے انداز میں ہم سے کہا۔ ریاض مڈگارڈ پر ہاتھ رکھے کھڑے رہے۔

شام کو انہوں نے جالن پور کے جنگل پر چھاپہ مارا۔ " اٹھو ——— بالآخر اب تمہیں جنت تک پہنچانا ہے ———" ایلمر رگسٹن نے پرالی کے ڈھیر پر جھک کر آہستہ سے کہا۔ " سگریٹ ——— " میں سینٹ آگسٹین ہوں۔ اس نے دل میں دہرایا ———
" شام بخیر ایلمر رگسٹن، " علی نے ایک آنکھ کھول کر کہا ——— " سگریٹ کا شکریہ، تم

جانتے ہو کریون اسے میرا برانڈ نہیں۔ لیکن کل رات نرکلوں کے جھنڈ میں سے تم نے جو گولیاں چلائی تھیں ان کی وجہ سے میں خود نہیں اٹھ سکتا۔ کیا ٹرک تک پیدل جانا ہوگا؟ اس نے گھاس پر ہاتھ رکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ایلمر نے ٹارچ جلا کر چاروں اور دیکھا۔ بھوسے کے ڈھیر میں سے سلگتا ہوا دھواں اوپر اٹھ رہا تھا۔ منڈیر کے نیچے انل سنہا اور سعید الزماں انصاری مرے ہوئے پڑے تھے۔ اس نے سپاہیوں کو آواز دی —— موگرے کے پھول —— علی نے پتوں پر سے ہاتھ اٹھا کر جھاڑی کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا —— "مس جیرڈ کہا کرتی تھیں کہ تمہیں موگرے کے پھول بے حد پسند ہیں" —— وقت گزارنے کے لئے کچھ نہ کچھ باتیں کرنے کی غرض سے اس نے ایلمر سے کہا۔ اسے اپنے متعلق علم تھا کہ وہ سوسائٹی میں بہترین Conversationalist کی حیثیت سے مشہور ہے۔ وہ ایلمر کو بے خیالی سے دیکھتا رہا۔ ٹرک آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ لاحول ولا قوۃ — اس نے جھنجھلا کر دل میں سوچا — میری ٹانگ میں اس قدر شدید تکلیف کیوں ہو رہی ہے)

۱۹

"غالباً ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں"۔ ریاض نے ایلمر ریکسٹن کے الفاظ کچھ تعجب اور جھنجھلاہٹ سے دل میں دہرائے۔

"جھیل پار کرکے اس طرف تشریف لے آئیے۔ ڈاک بنگلے کا راستہ ادھر سے ہے"۔ پانی کی سطح پر سے ایک آواز آئی۔ ریاض نے چونک کر ادھر دیکھا اور رنٹ بورڈ پر سے پاؤں اتارا۔ مہوے کے جھنڈ میں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ایلمر ریکسٹن کی محافظت میں جو خاندان ادھر سے گذر رہا تھا اسے آگے گئے کچھ وقفہ ہو چکا تھا۔ اس نے پھر چاروں اور نظر ڈالی کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے۔

"اس طرف سے ---" آواز آئی۔ ایک لڑکی کشتی میں بیٹھی اطمینان سے کوئی گیت نیچے سُروں میں الاپ رہی تھی۔ "آداب عرض ہے"۔ لڑکی نے کہا۔

"اوہ --- ہاؤ ڈو یو ڈو ---" وہ غیر یقینی انداز سے قدم رکھتا کشتی کے قریب گیا۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں یہ چوتھی سیاہ آنکھوں والی لڑکی تھی جس کا عکس اس نے اس جھیل کی لہروں پر لرزتے دیکھا۔ راحیل اور اسٹیلا جن سے ابھی ایلمر نے اس کا تعارف کرایا تھا جا چکی تھیں۔ شیشم کا گھنا جنگل دور دور تک بالکل خاموش کھڑا تھا۔

اس قیامت کے زمانے میں معلوم ہوتا ہے سارا صوبہ پکنک پر نکل کھڑا ہوا ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔ اس نے سوچا۔

"معاف کیجئے گا" — اس نے کنارے پر بندھی ہوئی ڈونگی میں بیٹھی لڑکی کو شام کے اندھیرے میں پہچاننے کی کوشش کی — "آپ کوالٹی اسٹریٹ میں ٹی بی بی تھیں؟"

"جی نہیں" — لڑکی نے احتیاط سے اپنی ناک چھوئی — "ٹی بی، چاند بی بی تھی چاند پنڈت — میں مس سوزن تھی — اس کے علاوہ ہم نے ہر ڈرامہ بے حد عمدہ کیا ہے۔ اوپیرا میں بوہیمین گرل ہمیشہ سب سے اچھا رہتا ہے۔ گو ہم نے میلوڈرامہ تک کافی کامیابی سے پیش کیا ہے — لیکن واقعہ یہ ہے کہ ارایل کارٹر بے حد ناکام قسم کی سپرانو ہے۔ اور نیچی آواز میں ایلین رانٹف اچھی ہے — میں میرا تلنی ہوں —" اس نے اسی رو میں سادگی سے کہا۔

"مس راجونس؟"

"جی ہاں۔"

"لیکن آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں — ؟ ابھی میں نے آپ کی طرح کی چند اور خواتین دیکھیں جو ابھی ابھی اس راستے سے لکھنو واپس گئی ہیں۔ ایسے مخدوش زمانے میں آپ لوگ جنگل میں منگل منانے نکلی ہیں — !؟"

"ہم لوگ یاترا پر جا رہے ہیں" میرا نے اسی سادگی سے جواب دیا۔ "ہر سال جنم اشٹمی کے بعد ہم یاترا کے لئے جاتی ہیں اور ابھی اسٹیلا وغیرہ جو ادھر سے گذریں وہ سب لوگ یہاں اپنے کیمپ پر آئے ہوئے تھے۔ علی کے ماموں اس ضلع کے ایس پی ہیں یعنی اسٹیلا کے والد — ابھی ابھی ڈاک بنگلے سے میں نے ان لوگوں سے ٹیلیفون پر باتیں کی ہیں۔ وہ سب خیریت سے اگلے پڑاؤ پر پہنچ چکے ہیں — کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس طرح گڑبڑ شروع ہو جائے گی — آپ علی سے کبھی ملے ہیں — ؟" اس

نے رک کر سوال کیا۔

"جی نہیں ——" ریاض نے مختصراً جواب دیا۔ "لیکن فواد سے میں نے آپ کا ذکر اکثر سنا ہے۔"

وہ خاموشی سے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے کشتی میں بیٹھی رہی ——

"یاترا کے لئے آپ کدھر جا رہی ہیں ——؟" ریاض نے کشتی کے قریب آ کر پوچھا۔

"ہم گوپال پور جائیں گے۔"

"گوپال پور؟"

"جی ہاں —— وہاں کیشو کا مندر ہے۔ کچھوے کی شکل والے خدا کیشو کا مندر۔"

"گوپال پور کوئی گاؤں ہے؟"

"علی کا گوپال پور ——" میرا نے مختصراً جواب دیا اور دونوں ہاتھوں کو الگ رکھ کے پھر چپکی ہو گئی۔ تم مغرور غیر ملکی۔ تم کیوں ہمارے قصبوں میں اس قدر مہذب اور پراخلاق دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو —— اس نے دل میں کہا۔

ریاض خاموش رہا۔

"علی کا گوپال پور ——" میرا نے زیرِ لب دہرایا —— "علی کو شاید ابھی ابھی ایلمر ٹکسن نے ختم کر دیا —— میں نے گولیوں کی سنسناتی ہوئی گونج سنی ہے ——" اس نے چونک کر کہا اور پھر چپ ہو کر پانی کی سطح کو دیکھتی رہی۔

میں نے پہلے پہروں والی اندر بالاؤں کو دیکھا ہے جو جھیل کی سطح پر جھکی رو رہی تھیں —— ریاض نے اپنے آپ سے کہا۔

"آئیے آپ کے ڈاک بنگلے کی طرف چلیں۔ کیونکہ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے ——" اس

نے باوازِ بلند میرا کو مخاطب کیا۔

میرا ڈونگی میں سے پیر نکال کر گھاس پر آ گئی۔ وہ ڈاک بنگلے کی جانب چلنے لگے۔

ڈاک بنگلے کے عمیق کمروں میں لیمپ روشن کئے جا رہے تھے۔ میرا کے برساتی میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف مسلح گارد دہری کر دی گئی۔

ریاض نے ان انتظامات کو غور سے دیکھا۔

"میرے والد بھی سول سروس میں ہیں ۔۔" میرا نے سادگی سے اس سے کہا۔

وہ برآمدے میں آ بیٹھے۔ شیشم کے جنگلوں پر رات کی ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔

"بابا ابھی جالن پور سے واپس نہیں آئے؟" میرا نے ایک چپراسی سے پوچھا۔

"جی نہیں بٹیا" چپراسی نے جواب دیا

"ممی پوجا میں مصروف ہوں گی ۔۔۔ میرا بھائی آج کل محاذ پر گیا ہوا ہے۔ میرا بھائی میجر ارون راج دنش ۔۔۔" وہ اداسی سے پتوں پر گرتے ہوئے بارش کے قطروں کو دیکھتی رہی۔

"مجھے کچھ اپنے مچھلی کی شکل والے خدا کے متعلق بتایئے۔" ریاض نے کہا

"کچھوے کی شکل والا خدا" میرا نے رسان سے اس کی تصحیح کی ۔۔۔ "کیشو کا مندر رام گنگا کے کنارے پر چار سو سال سے موجود ہے۔ کیشو ہمارے خاندانی خداؤں میں سے ایک ہے۔ گوپال پور کو پچھلے مہینے علی کے بہت بوڑھے نانا ابا سے لے لیا گیا۔ کیشو کے مندر کا ٹرسٹ علی کے نانا ابا اور ان کے بزرگوں کے روپے سے قائم تھا۔ چار سو سال تک علی کے بزرگوں نے کیشو کے مندر کی رکھوالی کی ۔۔۔" یکساں خالی آواز میں میرا نے کہا

لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ میرآ نے سر ہلا کر دل میں کہا — تم اجنبی — تم کبھی ہماری روح میں داخل ہونا نہ چاہو گے — تم مغرور غیر ملکی — لیمپ کی مدھم روشنی میں اس نے شک وشبے کی نظروں سے ریاض کے چہرے کو دیکھا۔ اور پھر سوچ سے سر ہلایا۔

"آپ بھی یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں —؟" ریاض نے نظریں اٹھا کر سوال کیا۔

"اکثر —" میرآ نے صحیح جواب دیا — اور پھر جنگل کے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔

ریاض اس جواب سے بہت محظوظ ہوا — دلچسپ لڑکی ہے — اس نے سوچا۔

میرآ اس کے تبسم کو دیکھتی رہی — نہیں۔ اس نے دل میں کہا — تم بے حد ذہین ہو — بہت حساس معلوم ہوتے ہو۔ لیکن تم خود پسند ہو۔ تم ہمیں نہیں سمجھ سکتے۔

"آپ ابھی راحیل سے ملے تھے؟" اس نے سوال کیا۔

"جی —؟ جی ہاں"۔ اس نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

راحیل ایک بیحد معمولی لڑکی ہے۔ اسی کی طرح میں بھی ایک معمولی لڑکی ہوں۔ غالباً میرا دماغ بھی بہت معمولی ہے۔ لیکن میں انسانوں سے محبت کر سکتی ہوں اور نفرت بھی۔ ہم اس محبت۔ اور اس خلوص کے اہل ہیں۔ لیکن تمہارے نزدیک ہر چیز انتہائی شخصی اور ذاتی بن جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ تمہارے بوٹ تک۔ اور برآمدے کے سامنے یہ گارد کے گھوڑے — یا یہ باتیں بھی جو میں تم سے کہیں — اور ایک دفعہ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنے تین لڑکوں کو کہاں کہاں پڑھاؤں گی۔ دہرہ دون نسلہ اور لڑکی کو شانتی نکیتن بھیجوں گی۔

"مسلسل بارش ہو رہی ہے"۔ ریاض نے سگریٹ جلاتے ہوئے خاموشی کو توڑا۔

میرآ نے چونک کر اسے دیکھا۔

یہاں نمی، اور اندھیرا۔ اور ویرانہ ہے۔ تم یہاں کبھی نہ آؤ گے۔ تمہیں ہمارا گھر کہیں کبھی نہ ملے گا۔

"یہ اضلاع گویا آپ کے صوبے کا بیک واٹر ہیں ۔۔" ریاض نے پھر گفتگو جاری رکھنے کی سعی کی۔

یہاں کلچر کی کمی ہے۔ مرد خواتین کی موجودگی میں ٹوپی نہیں اتارتے۔ نہ خواتین ان کو دیکھ کر مہذب طریقے سے مسکراتی ہیں۔ یہاں مرد زمین کی نرائی کرتے ہیں اور خواتین اُپلے تھاپتی ہیں۔ لٹریچر بھی نہیں ہے! میرا نے دل میں کہا۔

"لکھنؤ میں تو میں اس سے پہلے صرف ایک بار تین دن کے لئے آیا تھا۔ جب بھی آپ کا غالباً کالج ڈے تھا جس میں آپ لوگوں نے "کوالٹی اسٹریٹ" اسٹیج کیا تھا۔ لیکن اضلاع کی طرف آنے کا یہ میرا پہلا اتفاق ہے۔"

"جی ہاں ۔۔ اور خصوصاً ایسے مخدوش زمانے میں" میرا نے بیحد سنجیدگی سے جواب دیا۔ اب کی بار جب آپ لکھنؤ واپس جائیں تو غریب خانے پر ضرور تشریف لائیے گا۔ نمبر بائیس فیض آباد روڈ ۔۔۔ اس وقت تک ہم لوگ یا تو اسے لوٹ آئیں گے"

"یقیناً" ریاض نے اسی اخلاق سے جواب دیا۔

تم فواد کے دوست ہو ۔۔ تم ایک بار آرک بھی آ رہے تھے لیکن نہیں آئے۔ تم کن چیزوں سے بھاگنا چاہتے ہو۔ کن چیزوں کی طرف جانا چاہتے ہو۔

"آپ غالباً ایلمر رکیسٹن کو بھی جانتے ہیں" میرا نے کہا۔

"جی ہاں۔ وہ کیمبرج میں میرے ساتھ تھا۔"

"ایلمر سے ایک زمانے میں جلی اور ارون سے بہت تپاک تھا۔ بیحد عجیب و غریب ٹریو تھا یہ۔"

"واقعی؟"

اتنی نظمیں لکھ کر نیو رائیٹنگ میں بھیجتا تھا جو میں نے کبھی نہ پڑھیں۔ اس نے میری وجہ سے دوبارہ نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں اور میں اپنی رچنائیں جنتن میں بھیجا کرتی تھی جو فواد نے کبھی نہ دیکھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ تم ضرور میرے گھر آنا۔ میں تمہیں نہایت ذوق شوق سے مدعو کرتی ہوں۔ تم میری باتوں سے کافی بیزار انداز میں محظوظ ہوئے۔ میں بے حد تعلیم یافتہ ہوں۔ بجید کلچرڈ۔ اور تم بڑی طمانیت سے ہوسے پربتی پر گھٹا کو دیکھ رہے ہو۔

"سرکار۔ رجسٹریشن صاحب نے دوسری موٹر بھیجی ہے۔ سب صاحب لوگ دوسرے کیمپ میں آپ کا راستہ دیکھتے ہیں۔" ایک چپراسی نے برآمدے کے نیچے آکر عرض کی۔

امیر آلطنی کو خدا حافظ کہہ کر وہ باہر آیا۔ سڑک پر برساتی نالے شور کرتے ہوئے بہہ رہے تھے اور جنگلوں پر دور دور تک اگست کی بارش ہوتی تھی۔

یہ اجنبی لڑکی جس سے ایک گھنٹہ سے زیادہ اس نے باتیں کیں۔ اس کی زندگی سے کس قدر غیر متعلق ہے۔

پدما — ۹

پدما — ۹۹

۲۰

"میری بہت پیاری اسٹیلا عباسی ۔۔۔ تم اس قدر بشاش کیوں نظر آرہی ہو۔ گویا مکلیین یا ایتھینہ کا اشتہار ہو۔"

"امن اور محبت۔" اسٹیلا نے آہستہ سے کہا اور پوپی کی ٹوکری بیسز ٹھیوں پر رکھ دی۔ "پوپی خریدو۔"

امن۔ امن۔ یہ نومبر کا مہینہ ہے۔ آج پوپی ڈے ہے۔ سڑکوں پر لڑکیاں چھوٹے چھوٹے رنگین یونین جیک فروخت کرتی پھر رہی ہیں۔ ایک اندھا اور بوڑھا انگریز سیکسوفون پر اولڈ لانگ زائن بجا کر بھیک مانگ رہا ہے۔

"پوپی خریدو۔" ٹوکری اٹھا کر سنجیدگی سے کرسیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں کہتی ہوں۔ گھاس پر آرام کرسیاں بچھی ہیں۔ فواد آنکھیں بند کئے بئیر پینے میں محو ہے۔ راخیل دریچے میں بیٹھی نٹنگ کر رہی ہے ۔۔۔ وقت چیختا ہوا ہمارے قریب سے نکلا جا رہا ہے۔ میں ہنس کے پرچے کے ورق الٹتی ہوں۔

"ایسے میں بھی جیا ہی جائے مرنیو ملے نہ رام۔ سادھو سنت سبھی جو بولا سنے من سے ہار کو تو نہ مانے، وشنو کی مالا کو دو پھینکے، ترشل سے کو ہاتھ۔ میرا الٹنی سب سے پوچھے دکھ میں کس کا ساتھ ۔۔۔" لیکھکا، کماری میرا الٹنی ایلج ونش۔

"یہ کیا ہے؟" ریاض ہنس کا سرورق دیکھ کر فواد سے پوچھ رہے ہیں۔

"ہینس کا تازہ پرچہ۔" فواد بیئر کا گلاس بید کی میز پر رکھ کر استغناء سے جواب دیتا ہے۔

گھاس پر دھوپ شہد کے سمندر کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ ملک کے ہنگامے جو شروع ہوا فرو ہو چکے ہیں۔ علی دو سال سے نینی جیل میں ہے۔ ابا جان آرام اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے طہران گئے ہوئے ہیں۔ لفٹننٹ کرنل فواد نسیم احمد کافی طویل وقفے کے بعد مشرق وسطیٰ سے چھٹی لے کر پرسوں شمیم الدولہ ہاؤس واپس آیا ہے۔ دھوپ بے حد خوشگوار معلوم ہو رہی ہے۔ تالاب پر لکڑی کا پل۔ راحیل کی زرد ساری، تمہارے جوتوں کے نیچے سبز گھاس کی نمی اور مہک۔ میرے پاس یہ بے حد غیر اہم چیزیں ہیں جو بالکل خالص میری اپنی ہیں۔ یہ سب لوگ میرے اپنے ہیں اور میرا دشمن جو ازل سے میرے ساتھ ہے۔ سن شیڈ کے نیچے بید کی کرسی پر بیٹھا ہے، برساتی میں کار کا انجن ٹھیک کر رہا ہے۔ کسی دفتر میں ضروری فائلوں پر جھکا ہوا ہے۔ کسی لمحے بھی وہ ریوالور چلا دے گا اور اس سارے پھیلے ہوئے منظر کا خاتمہ ہو جائے گا۔

چنانچہ ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ راحیل نے دریچے میں نٹنگ کرتے کرتے اپنے آپ کو دوبارہ یقین دلایا۔ کیسی بھی اس کے قریب چپ چاپ بیٹھی رہی۔ (کیسی کی نظروں میں اور کتے تھے اور مناظر۔ یہ لوگ جو گھاس پر کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ پوپی کے پھول فروخت کر رہے تھے، بیئر پی رہے تھے۔ اس کے نزدیک اس وقت معمولی فرنیچر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اپنی بلی کی آنکھوں سے اس نے ان سب کو بے اعتنائی سے دیکھا) راحیل نے سورج کی کرنوں سے بچنے کے لئے کھڑکی کا پٹ ذرا ترچھا کر دیا۔ اس کو دنیا ہلکی گہرے اور نرم نظر آ رہی تھی۔ پتھروں کی سختی، درختوں کی بدصورتی،

پھولوں کا پھیکا پن۔ اس رنگ میں تحلیل ہو کر آرام دہ معلوم ہو رہا تھا جس طرح ایک بھیڑ دوسری بھیڑوں کو دھوپ میں اطمینان سے گھاس چرتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ اس نے دور سے اسٹیلا کو اور مجھے دیکھا۔ لیکن چیزوں کے اس آخری ورژن تک پہنچتے پہنچتے درمیان کی خوبصورتی گم ہو جاتی ہے۔ فضا کی میلاہٹ بھی باقی نہیں رہتی، فکر، دیکھنے کی تکلیف، سخت چٹانیں اور یہ بے رنگ پھول اس دیوار سے لگ کر سائے میں سوتے رہے ہیں۔ لیکن ان باتوں کو یہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس نے دکھ کے ساتھ سوچا۔ تالاب کی طرف ایک گائے اطمینان سے گھاس کھا رہی تھی۔ اور گائے بھی ایک دفعہ چاند پر سے کودی تھی۔

گوپالا — اندھیرے اور روشنی، ازل اور ابد کے طوفان میں سے جو ظاہر ہوا — یہ گوپالا ہے — اس نے ریاضؔ کو دوبارہ غور سے دیکھا۔

دنیا میں صرف یہ نومبر کی ہلکی سی گرمی تھی۔ پوپی کے پھول اور تھوڑے سے خواب تھے۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ، اس کی شخصیت سے علیحدہ موجود تھی۔ صرف لمحات کا انتخاب اس کا اپنا تھا۔ لمحات جو زخمی کر کے آگے چلے جاتے ہیں۔ ریاض نے کرسی کی پشت سے سر اٹھا کر دیکھا کہ دھوپ گھاس پر سے ڈھلتی جا رہی ہے۔ فوادؔ حسبِ معمول چپ چاپ قناعت سے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ راحیلؔ دریچے میں ایک بلی کے قریب بیٹھی اون کا گولہ سلجھا رہی تھی (راحیل اور ایک سفید بلی، دونوں اپنے اپنے وجود کی کائنات میں اتنی لازمی اور اہم ہیں اس نے خیال کیا) اسٹیلا عباسی پوپی کی ٹوکری لے کے عطیہ کے گھر کی طرف جا چکی تھی، نادرہ کی شادی کے سلسلے میں جس میں شرکت کے لیے وہ پچھلے ہفتے دلی سے یہاں آیا تھا۔ احاطے کے درختوں میں جو کاغذی قندیلیں لٹکائی گئی تھیں۔ وہ ہوا کے سرسراتے ہوئے پرسکون جھونکوں، کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

پھاٹک کے باہر اندھا انگریز مسلسل سیکسوفون بجا رہا تھا
ہر طرف پدما تھی۔

"ابھی اتنے بہت سے اور مبارکباد کے تار بھیجنے ہیں"۔ میز کی دوسری طرف بیٹھے بیٹھے "ایلس اِن ونڈر لینڈ" کے دیچی ڈورماؤس کی طرح وضعاً آنکھیں کھول کر سوتی سوتی آواز میں فواد نے کہا۔ "مصر اور کو۔۔۔ اور۔۔۔ تمہارا خیال ہے مجھے نادرہ کو بھی ایک عدد مبارک باد کا خط بمبئی بھیج دینا چاہئے۔ اب تک وہ بمبئی پہنچ چکی ہو گی"۔

ریاض بے خیالی سے پوپی کے پھول دیکھتا رہا۔

"اس ہفتے چاروں طرف اتنی ساری شادیاں ہوئی ہیں"۔ فواد نے ڈورماؤس کی طرح پھر بات شروع کی۔ "پرسوں یہاں ایک اور شادی ہے۔ پیلے ذوالفقار کی"۔

پدما سرخ ساری پہنتی تھی اور پچھلی نومبر کو اس نے پوپی کا پھول اس کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ ریاض نے پھول میز کے کنارے رکھ دیا۔

"سوسائٹی میں اب وہ پہلا سا ایلان نہیں رہا۔ بے شمار شادیاں ہوتی ہیں"۔ فواد نے نہایت اداسی سے کہا۔ "پرسوں پیلے ذوالفقار کی شادی ہے۔ راحیل کی ایک دوست ہے۔ تم پرسوں تک ٹھہر رہے ہوتے تو اس میں بھی شرکت کر لیتے۔ اگر تم جنرل پوسٹ آفس کی طرف سے گزرو تو مصر اور کو میری جانب سے بھی مبارک باد بھیج دینا"۔ اس نے بعد میں اضافہ کیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" ریاض نے اس سے پوچھا

"دلکشا کلب۔۔۔ زندگی کے نظام کی ترتیب ٹھیک رکھنے کے لئے چائے کے وقت تک میں اسکواش کھیلوں گا"۔ فواد نے اسے مطلع کیا۔

"تمہارے اس مشہور و معروف دلکشا کلب میں وائٹ ہارس دستیاب ہوتی ہے؟"

ریاض نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" فوآد نے جواب دیا۔ "لیکن وہ پہلا سا ایلان نہیں رہا۔" اس نے رنجیدہ آواز میں دہرایا۔

وہ دونوں سڑک پر آگئے۔

"پدما یدونش مصرا۔" مبارک باد کے تار پر نام لکھ کر ریاض نے اسے غور سے دیکھا "پدما یدونش مصرا۔"

جی۔ پی۔ او کے ہال اور برآمدوں اور برساتی میں حسب معمول بے انتہا رونق تھی۔ لوگ جلدی جلدی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ تار مکمل کر کے وہ برساتی میں آگیا۔ جہاں فواد اس کا منتظر تھا۔

دلکشا کلب کی لاؤنج میں شہر کے تقریباً سارے اولڈ ٹائمرز موجود تھے۔ فوآد ریاض کے ساتھ اندر جا کر ایک کونے میں حسب معمول چپکا بیٹھ گیا۔

"نہایت خوشگوار سہ پہر ہے۔" کنور کملیشور پرشاد سیٹھ نے رائے ظاہر کی۔

"لکھنؤ کا آئیڈیل ترین موسم ہے۔" کماری پدما نہرو نے ان کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا اور تاش کے پتے ایک طرف کو رکھ دیئے۔

"فوآد بہت اداس دکھائی دے رہا ہے۔" ہری سریواستو نے کہا۔

"فوآد پر اکٹھی بہت سی آفتیں آگئیں۔ جنگ شروع ہو گئی۔ اسے کمیشن لینا پڑا۔ مدتوں سے اس نے شلر کا مطالعہ نہیں کیا۔ وائٹ ہارس نایاب ہو گئی۔ اس کے خانساماں کی نظریں کمزور ہو گئیں۔ نادرہ نے اسے بور ہونے کے لئے اکیلا چھوڑ کر شادی کر لی۔" شیلا

نے اپنے بھائی کو جواب دیا۔

کچھ دیر بعد یہ سارا مجمع اسی طرح ہنستا اور باتیں کرتا ہوا اٹھ کر دوسری میزوں کی طرف چلا گیا۔

چنانچہ زندگی کا ایک پیٹرن ہے۔ مصروفیات۔ فرائض۔ سوشل ہنگامے۔ کچھ تصورات ایک طرف۔ خدا اور مذہب کا ایک خاص قسم کا تصور موجود ہے۔ مثلاً عیدین کی نمازیں Reconstruction of Islamic Thought وغیرہ۔ روح کا بھی کچھ سلسلہ ہے۔ کچھ اپنی پسند اور ناپسند کے سوال بھی ہیں۔ مثلاً پڈنگ بالکل پسند نہیں (اور گو میں سہ پہر سے میٹھا اب تک وہائٹ ہارس کے ان گنت گلاس ختم کر چکا ہوں۔ لیکن فواد کا یہ کلب کچھ زیادہ پسند نہیں آیا) محمد باغ یقیناً بے حد عمدہ ہے۔ یہ لڑکی جو سامنے بیٹھی ہے بہت خوبصورت ہے (مالتی اور سرلا سنا ہے اس سے بھی زیادہ حسین ہیں) باقی سب خلا ہے بکواس ہے۔ ہر چیز محض بحث کرنے کے لحاظ سے دلچسپ ہے۔ مثلاً دیال ابھی شادی کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ لڑکیوں کا اسٹکچوئیل ہونا مطلق امپریس نہیں کرتا۔۔۔ عورت کا سوال بھی اپنی جگہ خاصا اہم ہے۔ انٹرنیشنل شادیاں ٹھیک نہیں (گو یہ مسئلے زندگی کے پیٹرن میں داخل نہیں ہوتے) راحیل آج صبح زرد رنگ کا ہاؤس کوٹ پہنے دریچے میں بیٹھی تھی۔ راحیل اگر ہر آنے والی صبح بریکفاسٹ کی میز پر زرد ہاؤس کوٹ پہنے میرے مقابل میں بیٹھی ہو تو غالباً عمدہ لگے۔ اس وقت یہ تصور خاصا آرام دہ سا معلوم ہو رہا ہے۔

پدما۔۔۔

پدما۔ جو پچھلے دس سال سے میرے لئے صرف پدما تھی پچھلے اتوار کو مسز پدو نش ھصرا بن گئی اور میں اسے مبارک باد کا تار بھیج کر آ رہا ہوں۔ تار اس وقت اسے راولپنڈی

پہنچ گیا ہوگا۔

"میاں اس وقت تم اتنے ٹپسی ہو چکے ہو کہ اب مجبوراً گھر چلنا پڑے گا۔" فواد نے دوسرے میں سے کہا۔

ریاض چہکا۔ "ہا ہا۔ میرا آنٹی بھی بکواس ہے۔

اور ابھی تم نے شیلا کے قریب جا کر بے حد سنجیدگی سے اسے کیوں مطلع کیا تھا کہ تمہیں اس کی ناک اور اس کا اتنا انٹلکچوئیل ہونا قطعی پسند نہیں اور دنیا میں صرف پدما یدونش مصرا کی ناک قابلِ اعتنا اور بے حد حسین ہے۔ باقی ساری لڑکیوں کی ناکیں بکواس ہیں — ؟" فواد نے کافی برا مان کر اس سے شکایتاً پوچھا۔ وہ بھی اس وقت تک کافی ٹپسی ہو چکا تھا۔ "حالانکہ اس قدر عمدہ یونانی ناک شیلا کی ہے۔"

"شیلا کی یونانی ناک قطعی ان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ میں کچھ نہیں کہتا۔" ریاض نے بگڑ کر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کس قدر رنج کا مقام ہے۔" فواد نے گلاس کو غور سے دیکھتے ہوئے اداسی سے سوچا۔ "کہ کوئی اور ہستی میرا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ اپنا ذاتی معاملہ میں خود ہوں —" اس نے بڑے رنج سے سر ہلا کر ریاض پر نظر ڈالی۔

۲۱

اس شام فواد نے میرا کو پروپوز کیا۔

وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ وہ لیلا رام کی دوکان میں ایک اور ساری خرید رہی تھی۔

"ایک اور ساری" فواد نے پریشان ہو کر کہا۔

"سنو میرا جانی —" اس نے سنسان کاؤنٹر پر جھک کر کہا۔ "میں تم سے شادی کر رہا ہوں۔"

وہ چپ رہی۔

"سنا تم نے —؟"

"لیکن ہم ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں۔" میرا نے ذرا سوچ کر اعتراضاً کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ یعنی، ایک طرح سے، یہ تو اور بھی عمدہ بات ہے ہے نا؟" فواد نے باوثوق لہجے میں کہا۔

"اور پھر مجھے ناچنا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔"

وہ خفا ہو گئی۔ اور اس خفگی میں اس نے ایک اور ساری خرید کر کاؤنٹر پر ڈال دی۔

"تمہیں ناچنا ہے۔ راحیل کو فلورنس نائٹ انگیل بننا ہے اسٹیلا بھی اسی قسم کا کوئی تیر مارنے والی ہیں۔ کیا تم لوگ بور کرتی ہو۔"

"اور پھر اس کے علاوہ یہ کہ میں راؤ بہادر مہندر راج ونش کی بیٹی ہوں۔"

"یہ بھی مجھے کافی دنوں سے معلوم ہے۔" فواد نے جل کر کہا۔

"میں کسی موٹے آدمی سے شادی کر لوں گی۔" میرا نے سوچ کر کہا۔

"موٹے آدمی سے کیوں؟ دبلا بھی ہو سکتا ہے --- یا ہکلا۔" فواد نے کہا۔

"دبلا ہی سہی یا ہکلا ---" میرا نے اتفاق رائے کیا۔ خریداری کے پارسل سمیٹ کر وہ باہر آ گئے۔

وہ جھیل کہاں ہے جس پر سے ہم گذر رہے تھے۔ شام کی روشنیوں سے باہر جنگل کے راستے پر آ کر انہوں نے کہا۔ بنارسی باغ کا سنسان یوکلپٹس کا جھنڈ ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے چند زرد پتے ہاتھوں میں اٹھا لیے۔

"یہ ساری زندگی ہے۔" فواد نے کہا

"یہ ساری زندگی ہے۔" میرا نے دہرایا۔

"شاید ہمارا ذہن پورا ہو سکے۔" فواد نے کہا

"وہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔" میرا نے کہا

"ہمارے ہاتھ میں محض یہ زرد پتے ہیں۔" فواد نے آہستہ سے کہا۔" میرا --- میرا رانی --- وہ دفعتہً چلایا۔

"یہ سارے موسم اتنی تیزی سے گذرتے جاتے ہیں اور ہم کبھی اتنے اکٹھے نہ ہوں گے"

میرا نے کہا۔

"میرا لکھنؤ!" وہ چیختا رہا۔

"کیا تم پھر پرپوز کر رہے ہو۔" میرا نے پگڈنڈی پر بشاشت سے دوڑتے ہوئے کہا۔ گویا وہ پھر سے اسکول کے دنوں میں واپس پہنچ گئی تھی۔ "واپس بھاگ جاؤ۔ اور دیکھو کہ نجم الدولہ ہاؤس کی روشنیاں کتنی محفوظ ہیں جو صنوبروں کے پیچھے سے جھلملا رہی ہیں۔"

"اور ہمارے چاروں اور طوفان زدہ سمندر ہیں۔" ڈاڈ نے پتوں کو سرخ زمین پر گرا کر جواب دیا۔ جھیل کے کنارے ایک بنچ سونی تھی۔ اس نے غنودگی سے سر اٹھا کر ذرا اوپر نظر ڈالی۔ سامنے سے ایک موٹر گذر گئی جس میں ریاض تھے جو دلکشا کلب سے واپس جا رہے تھے۔

۲۴

رات بھر وہ خواب میں میلوں دوڑتے رہے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ ساحلوں کی کالی ریت پر سرپٹ چلے جا رہے ہیں۔ گھاٹیوں کو پھلانگ رہے ہیں۔ پہاڑیوں کو عبور کر رہے ہیں۔ صبح کو محض وہ اپنے اصطبل میں سکون اور قناعت سے کھڑے ہنہنا رہے تھے۔ بے حد خوشگوار صبح تھی۔

علی کے قدموں کی چاپ کی مانوس آواز پر کان کھڑے کر کے انہوں نے سر اٹھایا علی لکڑی کے جنگلے پر جھکا ان کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"اے ہرمزجی خانم" اصیلا نے آواز دی۔ علی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اصیلا نائلون بوشرٹ پہنے، سر پر رنگین اسکارف باندھے لکڑی کی بالٹی اٹھائے باورچی خانے کی سمت جا رہی تھی۔ لڑکیاں نہایت گھریلو ہوتی جا رہی ہیں۔ علی نے سوچا۔

"بھیا، بٹیا۔ سب بجنے والی ہیں۔ بیگم کے لئے ناشتہ کر دیجیو" ہرمزجی خانم نے چبوترے پر آ کر آواز لگائی۔ وہ اونچی اونچی گھاس میں قدم رکھتا پہلو کے برآمدے کی طرف آ گیا۔

برآمدے میں بیگم آرام کرسی پر دھوپ میں بیٹھی طمانیت کے ساتھ چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پچھلے دنوں اس کی شادی کرنل بگرامی سے ہوئی تھی۔ آج وہ اتوار گزارنے کینٹ چھاؤنی سے یہاں آئی تھی۔

ناشتے کی میز پر وہ سب نہایت تندہی سے لیفٹی کی شادی کے ہنگامے کا تذکرہ

کرتے رہے۔ لکھنؤ کی سردیاں اس مرتبہ دلچسپ تر ہوتی جا رہی تھیں۔

"علی۔ مہندی کی باڑ کے نزدیک آ کر اروِن گلا پھاڑ کر چلایا"۔ ادھر آؤ"۔

"او کے چیف" علی نے انڈا ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔ اروِن باڑ کی دوسری جانب اپنے لان کے کنارے پر آ گیا۔

"چلو کافی پینے کہیں چلیں"۔ اروِن نے باڑھ کے ادھر سے اچک کر کہا۔

"کہاں --" علی نے دلچسپی کے ساتھ اسٹیلا سے پوچھا

"محمد باغ"۔ اسٹیلا نے اروِن کو آواز دی۔

وہ سب باڑ پھلانگ کر راجونشی کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

"لفٹننٹ کرنل اروِن کمار راج ونشی"۔ علی نے اروِن کا لیلے سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ تعارف کرایا۔ اروِن جو صبح سے کار کا انجن ٹھیک کرنے میں مصروف تھا جلدی سے اسٹیلا کے اسکارف سے ہاتھ پونچھ کر ہاؤڈو یو ڈو سے بخیر و خوبی فارغ ہوا۔ میرا مٹلنی اور مایا برآمدے کی ساری سیڑھیاں ایک ساتھ کود کر قریب آگئیں۔ سب محمد باغ کلب جانے کے لئے اروِن کی اسٹیشن ویگن کی طرف بڑھے۔

"آپ لوگوں کو میں نے ہمیشہ اکٹھے دیکھا ہے"۔ لیلے نے دلچسپی سے ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی سلسلہ ہے۔ بہت بچپنے میں ہم سب پورٹ بلیئر میں اکٹھے تھے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد سے اب تک دہرہ اور مسوری میں بھی ہم سب قریب قریب رہتے ہیں اور یہاں ہم بھی بابا اور ہمارے انکل سول سروس میں بھی اکٹھے ہی داخل ہوئے تھے"۔ اروِن نے نہایت انکسار اور خوش اسلوبی سے داستان کو مختصر کر دیا۔ "دراصل ہم سب

پچھلے جنم میں ایک ہی کنبے کے افراد رہے ہوں گے۔ کم از کم فرسٹ کزن تو ضرور ہی رہے ہوں گے۔ ویسے بھی اودھ کے کائستھوں کو آدھا مسلمان سمجھا جاتا ہے"۔ انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے بعد میں اضافہ کیا۔

"روحانی طور پر ہم سب ایک دوسرے کے فرسٹ کزن ہیں۔ پورن برہما" عنبر نے نہایت سنجیدگی سے انکشاف کیا۔

"تمہاری باقی کی فرسٹ کزن خواتین کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے جو بیالوجیکل نقطہ نظر سے بھی تمہاری فرسٹ کزن ہیں ۔ جن خواتین کی ٹوم بوائز والی حرکات سے لڑکپن میں میں کیا تھر تھر کانپا کرتا تھا ۔۔۔ دراصل جب سے میں محاذ پر گیا ہوں حالاتِ حاضرہ سے بالکل واقفیت نہیں رہی"۔ ارون نے اسٹیلا سے کہا

عالیہ باجی نے ایم۔ اے میں فرسٹ آکر حسبِ عادت یونیورسٹی کا ایک اور ریکارڈ چکنا چور کر دیا ہے۔ صوفیہ ہیگل پر مقالہ لکھ رہی ہے۔ ننھو نے ٹرنٹی کالج سے ڈپلومہ لے لیا ہے۔ قصہ مختصر سب اپنے اپنے طور پر مکتی کی تلاش میں مصروف ہیں"۔ اسٹیلا نے اسے مطلع کیا۔

"اللہ کے فضل سے انٹلکچوئیل خاندان ہے"۔ ارون نے کار چلاتے چلاتے مڑ کر بیلا سے کہا۔ "کچھ دل لگی مقرر کی ہے آپ نے ۔۔۔!!"

بیلا بے خیالی سے کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی۔ "واقعی؟" اس نے اخلاقاً ارون کو جواب دیا۔ اسے اچھی طرح یقین نہ تھا کہ اس اصطلاح کے کیا معنی ہیں اور اس نے اس پر غور کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔

کیونکہ کار کلب کی برساتی میں پہنچ چکی تھی

ٹینس کورٹ کے رُخ پر جو فرانسیسی کھڑکی تھی وہ سب اس میں جا بیٹھے۔ "میرا خیال ہے کہ محفل جم ہی جائے۔" اردوان نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یقیناً۔ ایسا متبرک خیال خود سینٹ پیٹر کو بھی نہ آیا ہوگا۔" علی نے جواب دیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاں ایک ٹینس کورٹ پر پولین ٹامس اور پمیلا رکسٹن کے دو دو ہاتھ ہو رہے تھے "کیا حسین placing کی ہے۔" وہ داد دیتے ہوئے بے حد انہماک سے کھیل دیکھنے میں مصروف رہا۔

"نواد۔" علی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے مختصراً اطلاع دی۔

نواد اندر آ کر ان سب کے پاس بیٹھ گیا۔

علی نے کھیل کے نظارے سے اکتا کر ایک مصور رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ "سیزین نہایت بکواس ہے۔" اس نے ایک صفحے پر رک کر کچھ خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کون؟" لیلےٰ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سیزین۔ سخت ترین پٹی بورژوا تھا۔" علی نے جواب دیا۔

"کون صاحب ہیں ــ؟" لیلےٰ نے ذرا ٹھہر کر پوچھا۔

"آپ ـــ آپ سیزین سے واقف نہیں؟" علی نے پوری طرح آنکھیں کھول کر حیرت سے پوچھا۔ اس خوبصورت، سفید رنگت والی لیلےٰ بلگرامی کو سیزین کے وجود کا بھی پتہ نہیں۔ اس نے افسردگی سے گلاس میں اور بیئر انڈیلی۔

"چنانچہ آپ کو کاڈویل کے نظریوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"بالکل نہیں۔" لیلئے نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ کے مختلف دوست ہیں یہ حضرات۔" اس نے بعد میں اخلاقاً اضافہ کیا۔

"ہلو۔۔ علی۔" فواد نے اچانک اس کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔ "نینی سے کب لوٹے، بہ خوش آمدید۔۔"

"اتنی سردی میں نینی تال سے آپ اب لوٹے ہیں؟" لیلئے نے تعجب سے پوچھا۔

علی خاموشی سے چاروں اور دیکھتا رہا۔ اتوار کا دن تھا۔ کلب کے سارے لاؤنج ممبروں کے گروہوں سے بھرتے جا رہے تھے۔ قریب کی میز پر کولمبن نامی انگو انڈین لڑکی بیٹھی تھی۔ ان ہی دنوں اس نے دیوان چمن لال کے لڑکے سے اپنی منگنی کی خبر اناؤنس کی تھی۔ ہیرآئن اور کاڈوبل۔ علی نے دل میں دہرایا۔ یہ لوگ جو چاروں طرف ان کمروں میں موجود تھے۔ ان ناموں سے ناآشنا ہونے کے باوجود زندہ تھے اور بے حد خوش تھے۔ ہر چیز بے حد خوبصورت اور اپنی جگہ پر بشاش نظر آئی۔ لیلئے کی گہری عنابی ساڑی۔ اس کے اپنے ہاتھ۔ گلاس۔ میزوں کی شفاف چادریں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا۔ اس وقت وہ بھی بے حد مطمئن ہے۔ بدھ کی طرح آنکھیں بند کیے، وہ اس روحانی عشرت کی جھیل میں تیرتا رہا۔

ارون اور فواد اپنے اپنے گلاس لئے اس کی میز پر آ گئے۔

"روح کی عشرت۔۔۔ اسے ذرا جگائیے ہمیں لائے دیہو ٹکٹکن۔۔۔" آٹھواں گلاس ختم کر کے علی چیخا۔ "معاذ اللہ کا مقام ہے صاحب۔"

"روح کا توازن۔۔" ارون جواباً دہاڑا

"سنو بیٹا فیس۔۔ مختلف حالتوں کا وجود انسان ہے۔ ہمارا اجتماعی لاشعوری

تجربہ اور ہمارے جسم —" علی نے نہایت سنجیدگی سے انگلی اٹھا کر ارقان کو سمجھانا شروع کیا۔ "ارے بیل بک دہ تمہیں تو بل کہا کرہیں — ارے بل ہو بکامے موہے لائے دیکھو لنگن —" فواد، علی نے گیت جہاں سے چھوڑا تھا۔ وہیں سے نہایت مستعدی سے اٹھا کر گانے میں محو ہو گیا۔

یہ اونچی، ذہنی، آئیڈیل زندگیاں بتانے والے انسان تھے۔ پولین ٹامس کی میز پر بیٹھے بیٹھے میں نے علی کے گروہ کو دیکھا جو ٹیپسی ہو کر کافی شور مچا رہا تھا۔ ہم فی الواقع روح کے ارسٹوکریٹ ہیں۔ تحقیق۔ مطالعہ۔ توازنِ رائے۔ ذہنی تہذیب اور انکسار ساری خوبیوں کا مجموعہ۔ اور ہم ان لمحات کے ساتھ زندہ ہیں۔ میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنے ذہنی اور تہذیبی وقار کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ہاتھیوں کا ساوقار۔ وہا کوی کالی داس کی سی گمبھیرتا۔ میں نے چپکے سے پرس کھول کر آئینہ دیکھا۔ میں بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ خوش۔ فراخدل۔ نوبل۔ میں سینٹ ارمن ہوں۔ میں نے بے حد طمانیت سے سوچا۔

یہاں بیٹھ کر میں ایک کہانی لکھوں گی جس میں اپنے سینٹس اور فرشتوں کو کچھ عرصے کے لئے فرلو پر بھیج دوں گی۔ میں نے کلب کے باہر آ کر یوکلپٹس کے جھنڈ کی سمت جاتے ہوئے طے کیا۔ کیونکہ ایک سینٹ دوسرے سینٹ کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اب تک میری کہانیوں کا ہر کردار بے حد ذہین اور دلچسپ تھا۔ میں نے ذرا جھنجھلاہٹ سے سوچا۔ عورتیں بے حد حسین اور سمجھ دار مسخرے تھے۔ جو مزیدار قہقہے سناتے تھے۔ احمقوں اور شیطانوں کا کہیں گذر نہ تھا۔ نہایت انٹلکچوئیل قسم کا کورس ہیرو اور لڑکی

کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

یوکلپٹس کے جھنڈ پر شام کے وقت کی ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کلب کی عمارت روشنیوں سے جھلملا اٹھی تھی۔ گھاس کے قطعوں پر جنرل ہیولاک کی توپیں سکون سے کھڑی تھیں۔ خیر۔ تو قصہ مختصر اب میں نہایت سنجیدگی سے لکھا کروں گی۔

لیکن جب میں لکھنے بیٹھی تو مجھے اپنے بے انتہا غیر اہم۔ بے انتہا معمولی ہونے کا احساس ہوا۔ ابا جان کی اسٹڈی میں جا کر میں حسبِ معمول الماریوں کے پاس فرش پر بیٹھ گئی اور کتابیں نکال نکال کر چاروں طرف بکھیر دیں۔ ہر فلسفی، ہر مصنف کا یہی خیال تھا کہ وہی صحیح ہے۔ لیکن خیالات اور نظریے، موسم کے ساتھ، برسوں، قرنوں اور صدیوں کے ساتھ تیزی سے بدلتے گئے تھے۔ آخر میں موت کے علاوہ ہر چیز کو نہایت خوبصورتی سے vulgarize کر لیا گیا تھا۔" اور یہ بھی واقعہ ہے کہ سینٹ آئن اور این شیرید ان دونوں کی اسٹار وبلیو بالکل ایک ہے۔" اسٹیلا نے ایک اسٹول پر چڑھ کر بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

یہاں الگ الگ ابدی، شخصی روحیں نہیں ہیں۔ صرف ایک آفاقی احساس ہے۔ وہ اندھا انگریز بوڑھا اسی طرح بارش سے بچتا حضرت گنج کے برآمدوں کے کونوں میں کھڑا اوٹمن بجاتا اور بھیک مانگتا رہے گا اور ایک دن مر جائے گا۔

لیکن جتنے دن بھی ہم اپنی مخصوص اور علیحدہ کلاس پر قائم رہ سکیں۔ رہ لینے دو۔ اسٹیلا نے گویا خاموشی سے کہا۔ میں نے ہمدردی سے اس کو دیکھا۔

اسٹیلا عباسی۔ میں نے دل میں کہا۔ تم جو لیڈی اسٹیلا رکسٹن کی گوڈ چائلڈ ہو۔ جب تک تم اور تمہارا یہ نام باقی ہے۔ تمہاری کلاس بھی زندہ رہے گی۔ تم اپنے طبقے

کی بہترین تکمیل ہو۔"

"آخر تم ہی بتاؤ۔" اسٹیلا نے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے ٹانگیں ہلاتے ہوئے کہا۔ "کہ مجھے یا کسی اور کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ تم نے صبح کو کیا کیا۔ اور کل شام کو اور اس سے پچھلی سہ پہر کو۔"

"آخر میں کیا لکھوں اور کن لوگوں کے متعلق؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ میرا جی چاہا کہ اسٹیلا سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دوں۔ وہ اطمینان سے اسٹول پر بیٹھی رہی۔

گھر نہایت سکون سے سرو کے درختوں میں چھپا کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف گھاس کے قطعے تھے جن کے کنارے کنارے سویٹ پی اور ہولی ہوکس کے پودے تھے۔ ڈیسی تھا جو دنیا بھر کی چیزیں کھاتا پھرتا تھا اور مستقل بیمار رہتا تھا۔ کمروں میں پرانی روغنی تصویریں تھیں جن میں شہیدوں کو شہید کیا جا رہا تھا اور وہ بے حد آرام سے مرمریں سیڑھیوں پر ترچھے لیٹے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ اوپر سے فرشتے جھانک رہے تھے۔ اسٹیلا کے ابا یعنی خالو میاں تھے جو کسی بین الاقوامی سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے مہینے جنیوا یا روم جاتے رہتے تھے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر صحیح تھی ٹیلیفون کی گھنٹی ہمیشہ خوشگوار خبروں کے لئے بجتی۔ علی نینی سے واپس آگیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اباجان طہران سے لوٹنے والے تھے۔ سارے اچھے دوست نہ مرے تھے اور نہ دور دراز کے ملکوں کو چلے گئے تھے ہر چیز مکمل تھی اور فائینل دکھانے۔ لمبے برآمدے بھاری فرنیچر۔ ٹائمز آف انڈیا کی پرانی جلدیں۔ جن میں نہایت ڈی مورلائیزڈ قسم کی شکلوں

والے مہاراجہ پرنس آف ویلز سے ہاتھ ملا رہے تھے اور ہر چیز پر نوابوں کا ایسا سایہ موجود تھا ۔ چینی پگوڈا، تانبے کا نٹ راج ۔ کتابیں ۔ ٹرنیپی کی سست گام چہل قدمی ۔ مہینے میں دو تین بار بڑی سی پارٹی یا ڈنر دیا جاتا ۔

رات کو آتشدان پر سے انٹر کرنٹ راج اور سارے بُت چاروں طرف چلنے پھرنے لگتے مریم مگدلین پیانو پر بیٹھ کر شوپاں کا 'مارچ' بجاتی ۔ روتھ اپنی تصویر کے فریم میں سے باہر آ کر اپنی مشہور و معروف تقریر کرتی ۔ تمہاری قوم میری قوم ہے ۔ تمہارا ملک میرا ملک ہے ۔ سب سے آخر میں کوئی بوڑھا اینگلو انڈین ، بیگ پائپ پر قدیم ہائی لینڈ کی دھنیں بجاتا پولیس لائنز کی طرف نکل جاتا ۔ ٹیپی ۔ ٹرنیپی ، باورچی خانے کے پیچھے بندھی ہوئی خوش مزاج بکریاں ، سب گھر کے اس جذباتی تجربے میں شریک تھے ۔ گھڑی اس ٹھہری ہوئی ٹون میں ۔ یہاں داخل ہو کر ایسا لگتا تھا گویا نہایت حساس قسم کی زندگی سب پر انڈیل دی گئی ہے ۔

یہ ۱۲ فیض آباد روڈ تھی ۔

پرانے اور نئے روسی ناولوں کی طرح ، زندگی میں اَن گنت کردار تھے جو سب کے سب بے حد حقیقی ، انتہائی غیر اہم تھے ۔

میں کیا لکھ سکتی ہوں ۔ میں نے رنج سے سر ہلا کر سوچا ۔ اسٹیلا اسٹول پر سے اتر کر دریچے میں جا بیٹھی تھی ۔ دھوپ درختوں پر سے ڈھلتی جا رہی تھی ۔

میں نے کابل سے کتابیں سمیٹ کر الماریوں میں رکھیں اور اسٹیلا کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی ۔

اب تم میرے لئے ایک خرگوش کی تصویر بناؤ جس میں اس نے اوور کوٹ پہنا ہو

پھوٹے سے جعفر نے میرے نزدیک آکر گھٹنوں پر جھک کے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے فرمائش کی۔ ہولی ہوکس پر بادلوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔

تمہیں شکنتلا کا پورٹریٹ مکمل کرنا ہے۔ نوجوان خواتین کو کبھی اپنا وقت یوں برباد نہ کرنا چاہئے۔ اسٹیلا نے بے تعلقی سے یاد دہانی کرائی اور دریچے میں سے باہر کود کر علی کی طرح سیٹی بجاتی اصطبل کی طرف چلی گئی۔

لکھنا کسی اور خوش آئند زمانے پر ملتوی کر کے میں نے تصویر بنانی شروع کی۔ لیکن آسمان پر سے بادل ہٹ چکے تھے۔ پھولوں پر سے وہ سایہ غائب ہو گیا تھا۔ منظر وہی تھا۔ لیکن تبدیل ہو چکا تھا۔ ہر چیز مختلف تھی۔ روشنی میں صرف تھوڑے سے جانے پہچانے رنگ باقی بچے تھے۔ گھر اسی طرح خاموش، اور پرسکون اپنی جگہ پر موجود تھا۔ لیکن بادلوں میں سے چھنتی ہوئی ہلکی زرد دھوپ میں کمرہ، کا رٹون ایک نئے خیال کی طرح یکلخت تبدیل ہو گیا تھا۔

اس وقت میں نے جو تصویر تیار کی۔ رات کو اسے بگاڑ کر اس پر ایک کارٹون بنایا۔

۲۴

تعلیم و تربیت کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب بیگم نسیم احمد اور بیگمات کے سارے گروہ کو بچوں کی شادیوں کی فکر شروع ہوئی۔ ہماری امی گویا ان سب کی ڈائریکٹر جنرل اور کنٹرولر آف پلاننگ تھیں۔ زینب خالہ ڈپٹی چیف آف دی اسٹاف۔ رانی بلبیر سنگھ غیر قانونی مشیر، اور ساتھ ساتھ جنرل پلاننگ میں بے انتہا انتشار پھیلاتی تھیں۔ باضابطہ مختلف رشتوں کے ممکنات پر غور کیا جاتا۔ چھان بین ہوتی۔ اس اثنا میں کہ گروپ کی جونیئر لڑکیاں یعنی میرا، اسٹیلا اور راحیل وغیرہ ابھی کالجوں اور یونیورسٹی میں تعلیم کے آخری سال مکمل کر رہی تھیں۔ ہائی کمانڈ نے سینئر لڑکیوں کی جو فارغ التحصیل ہو چکی تھیں۔ کافی شادیاں طے کر لیں۔ مثلاً یہ کہ نادرہ کی شادی ہو گئی۔ میرا کی دونوں بڑی بہنوں جوگ مایا اور اندرا کی نسبتیں طے ہو گئیں۔ اسٹیلا کے لیے برابر فکر کی جا رہی تھی۔ عالیہ باجی کے مسئلے میں خاندانی سیاست کا زبردست دخل تھا۔ اس پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں (عالیہ باجی کا اس داستان سے کچھ زیادہ تعلق نہیں۔ لیکن ان کی شادی کا تذکرہ آگے آئے گا) میرا اور راحیل ایک پرابلم تھیں کیونکہ یہ دونوں نوجوان خواتین کہتی تھیں کہ جتنے رشتے اب تک ان کے لیے تلاش کیے گئے ہیں، وہ لوگ بالکل خبط ایسے ہیں۔ رانی بلبیر سنگھ اس طرح کی باتیں سن کر بے حد اسکینڈلائیزڈ ہوتیں۔ بہرحال فیض آباد روڈ، نجم الدولہ ہاؤس اور چاپلنگ روڈ کی کوٹھیوں میں ایک دوسرے

یہاں جمع ہو کر کافی پارٹی کے ساتھ ساتھ ان مسائل پر روشنی ڈالی جاتی۔ فواد، علی اور اروِن بھی زیرِ غور تھے کہ ان کے ساتھ کیا کیا جاوے۔ علی کے متعلق رانی طہیر سنگھ کو خدشہ تھا کہ وہ قطعی کسی چینی لڑکی کو بیاہ لاوے گا۔ چین میں اتنی گہری دلچسپی لینے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا۔ فواد اور اروِن کے ارادوں کو بھی وہ خاصے شک و شبہے کی نظر سے دیکھتیں۔ لیکن بہرحال، لڑکیوں کا مسئلہ زیادہ اکیوٹ تھا۔

پہلے یہ تھا (یعنی جب ہماری امّی اور بیگم نسیم اور ان کے زمانے کی لڑکیوں کو یورپین گورنسوں سے اللہ آمین کر کے پڑھایا گیا۔ اور بعد میں انہوں نے زور شور سے آل انڈیا لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنسیں منعقد کیں) لوگ چاہنے لگے تھے کہ لڑکیاں خوب پڑھی لکھی ہوں۔ وہ وقت خود بیگم نسیم احمد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ گریجویٹ لڑکی نادر تھی۔ سر آنکھوں پہ بٹھائی جاتی تھی اور کم علم لڑکی کے مقابلے میں شادی کے میدان میں اس کی دھاک بیٹھی ہوتی تھی۔ اب زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ جیسے جیسے گریجویٹ لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ بہت زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں سے بچنے لگے۔ بلکہ بعض بعض تو صریحاً تھر تھر کانپتے تھے۔ تو یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ صاحب اگر لڑکی نے ہسٹری میں بی۔ اے آنرز کیا ہے، وہ صبح سے شام تک شوہر کو گلیڈسٹن کی خارجہ پالیسی پر وہ وہ لکچر پلاوے گی۔ یا اسی قسم کی کوئی اور خوفناک بات۔ اور یہ کہ اس کے بہت سارے مرد دوست ہوں گے۔ کھانا پکانے سے مطلق بے بہرہ ہوگی۔ ہر وقت سلیکس پہنے گھوما کرے گی۔ اور چین اسموکر تو خیر ہوگی ہی۔

جو لڑکے اس طبقے سے خود تعلق رکھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ظاہر ہے کہ

یہ خوفناک لڑکیاں جو ان ہی کی بہنیں بھانجیاں اور بھتیجیاں تھیں اس طرح کی نہیں تھیں۔ لیکن ذرا فاصلے سے دیکھنے والوں کا یہ عقیدہ راسخ تھا۔ جو لڑکیوں کی ماؤں کے لئے خاصا پریشان کن تھا۔ کیونکہ عموماً لڑکے جو مقابلے کے امتحانوں میں نکل رہے تھے۔ اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اس طرح کی باتیں سوچتا تھا۔

کلبوں اور پارٹیوں میں وہ اس دوسرے گروہ کی لڑکیوں سے ملتے اور دور سے ان کو ایڈمائر بھی کر لیتے۔ لیکن کہتے کہ بھائی یہ اتنی زیادہ الٹرا ماڈرن۔ بابا لوگ۔ اپنے بس کی بات نہیں۔ جو صاحبزادی بلند اقبال شادی سے پہلے ہی رات کے دس گیارہ بجے تک کلب میں بیٹھی رہیں اور والد کے ساتھ برج سیشن میں مصروف والد صاحب قبلہ کو فادر ڈارلنگ کہہ کر پکاریں۔ تو آپ خود ہی دیکھ لیجئے صاحب۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ گلیمر بھی تھا کہ یہ بابا لوگ، بہرحال بڑے آدمیوں کی لڑکیاں تھیں، ہما شما تو جا کر چھپر منزل میں بیٹھیں گے نہیں۔ اسی جگہ میں کافی شادیاں ہو گئیں۔ میچ میکنگ کے لئے مسوری اور نینی تال آئیڈیل مقامات تھے۔ ہر سال سیزن کے دوران میں کافی منگنیاں وہاں طے ہو جاتیں۔

اس سال مسوری میں راحیل کا پھر حسب معمول کئی نوجوان بیچلرز سے تعارف کرایا گیا۔ بیگم نسیم احمد کو راحیل کے متعلق بے حد فکر تھی۔ کیونکہ بہرحال وہ ان کے خاندان کی لڑکی نہ تھی اور ان کی ذاتی ذمہ داری تھی۔ اب اس نے یونیورسٹی کی ڈگری بھی لے لی تھی۔ سینٹ جان ایمبولنس میں شامل ہونے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ بیگم نسیم احمد اور ہمارے ڈائریکٹوریٹ آف پلاننگ نے ایمرجنسی کا اعلان کر کے ہر ڈپارٹمنٹ سے

ساتھ بہت سے رشتے اس کے لئے تجویز کرنے شروع کر دیئے۔

ڈائریکٹریٹ آف پلاننگ کا موسم گرما کا ہیڈ کوارٹرز چونکہ حسب معمول مسوری تھا، اور ہماری امّی اس کی چیف کنٹرولر۔ لہٰذا ہنگامی سیشن آرک میں منعقد ہوتے راحیل سخت بور ہوتی اور نیچے کسی پتھر پر بیٹھ کر ہم لوگوں کے ساتھ چاکلیٹ کھاتی۔

انہیں بیچلرز میں ایک بزرگ میجر غیاث تھے جنہوں نے اس سال مسوری بھر میں ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ روز مختلف گھرانوں میں ان کو چاء اور کھانے پر بلایا جاتا۔ رانی بلبیر سنگھ نے اطلاع دی کہ آئندہ اتوار کو جسٹس شعبان کے یہاں انہیں دن بھر کی پکنک پر مدعو کیا گیا ہے۔

اتوار سے پہلے پہلے بیگم نسیم احمد نے ان کو سوائے میں کھانے پر بلا لیا۔

"اے توبہ توبہ ——— آپ نے بھی صاحب اچھی آنگ کی لی۔ کہاں کا مینٹ جان ایمبولنس۔ شادی کیجئے اب"۔ بیگمات کے گروہ نے راحیل سے کہا۔

"اگر بٹیا نہیں چاہتیں۔ تو پھر کہنا ہی کیا ضرور ہے"۔ امّی نے بیگم نسیم سے کہا۔ "کون سی شبھ ساعت ہے جو ٹلی جاتی ہے"۔

"اے بی اسٹیلا! تم ہی اپنی گڑیاں کو سمجھاؤ۔ نوکری کا ارادہ نہ کریں"۔ بیگم نسیم بولیں۔

"گڑیاں تو وہ میرا کی بھی ہیں۔ میرا سے کہیے"۔ اسٹیلا نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔

"میرا کے سامنے شادی کا نام لیجئے۔ تو ان کی طبیعت میں بھی حرج

واقع ہوتا ہے ۔۔" بیگم تسنیم نے غصے سے کہا اور ڈنر کے انتظامات کے سلسلے میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں ۔

سوائے کی وہ دعوت جس میں میجر غیاث بلائے گئے ۔ راحیل بگرامی کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوئی ۔

سبھی لوگ ہال میں جمع ہو چکے تھے۔ راحیل بڑے اخلاق سے مہمانوں سے باتیں کرتی رہی۔

"تشریف رکھیے۔" اس نے میجر غیاث کے لیے کرسی منگوائی۔ نادرہ کی شادی کے بعد سے اب وہی خان بہادر نسیم احمد کے یہاں کی دعوتوں میں میزبانی کے فرائض انجام دیتی تھی۔

"خاصی خوشگوار خنکی ہے مس بلگرامی ۔۔۔" میجر غیاث نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ (انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا کہ مس بلگرامی کا رنگ زیادہ صاف نہیں ہے۔ بال بہت سیاہ اور سیدھے۔ وہ کسی طرح سے بھی موڈرن اور ہارڈ یا ودین لپہ نہیں ہیں۔ لیکن بے حد شولری کے ساتھ انہوں نے راحیل کا سیاہ کلوک اٹھا کر دوسری کرسی پر رکھا اور اس سے مخاطب رہے)

"آج کل یہاں کون کون ٹھہرا ہوا ہے؟" انہوں نے مکالمہ شروع کیا۔

"سب لوگ ہیں۔" راحیل نے مختصراً جواب دیا۔

میجر غیاث نے اسے بے حد توصیفانہ انداز سے دیکھا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں۔ جو سیزن کے مختلف موضوعاتِ گفتگو پر روشنی ڈالتی تھیں

"آپ کی کار بے حد نفیس ہے مس بلگرامی۔" سوپ کے لیے چمچہ اٹھاتے ہوئے

میجر صاحب نے عرض کی "کل میں نے گیرج کی طرف سے گذرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ از نٹ اٹ اے اے ریل بیوٹی — ؟ خالص انگلش ارسٹوکریٹک کار۔"

"میری کار نہیں ہے —" راحیل نے ذرا بے اعتنائی سے جواب دیا اور سُوپ میں مصروف رہی۔

"ہا — ہا — وہ خالص آپ کے پاس نہ رہے۔ آپ کے والد کے استعمال میں رہتی ہے۔ لیکن بہرحال اس اعلیٰ برٹش ارسٹوکریٹک ٹیسٹ کے لئے مبارک باد میں آپ کو ہی دوں گا۔" میجر صاحب نے کہا۔

"خان بہادر نسیم احمد میرے والد بھی نہیں ہیں۔" راحیل نے ان کے گوش گذار کرنا چاہا۔ لیکن میز کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے کسی اور مہمان نے میجر صاحب کی بات کاٹ کر کسی اور ارسٹوکریٹک کار کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

ڈائننگ ہال سے باہر نکلتے وقت کیولری کے اسٹائل میں ایڑی بجا کر میجر غیاث نے پروپوز کیا۔

"مس بلگرامی — بلکہ اگر میں آپ کو محض راحیل کہوں (کتنا حسین اور انوکھا نام ہے) تو امید ہے آپ برا نہ مانیں گی۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کے پیارے والدین کے سامنے اپنی درخواست پیش کروں۔ لیکن یہ سب پرانے فیشن کی باتیں ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ خود آپ کی خدمت میں اپنی زندگی کو پیش کر دوں — ہا — ہا — یعنی کہ — ہی ہی — ہی!!"

وہ خاموش رہی۔ جسے میجر صاحب نے شرمانے پر محمول کیا۔

"کس قدر حسین چاندنی کھلی ہے۔ کیا دلفریب منظر ہے" سامنے ہمالیہ کی چوٹیوں کو

دیکھتے ہوتے موقعے کی مناسبت کے لحاظ سے انہوں نے کچھ رومینٹک بننے کی سعی بھی کی۔

زینے کے ایک ستون کے پاس وہ ٹھٹھک گئی۔ "میجر صاحب۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ انہوں نے جلدی سے کلوک اوڑھنے میں اس کی مدد کی اور پھر شولڈری کے ساتھ ایڑی بجائی۔

وہ ٹھہری رہی۔ "میجر صاحب۔ در اصل آپ کسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں" اس نے کلوک سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں خان بہادر نسیم احمد کی لڑکی نہیں ہوں جی کہ اُن کی متبنیٰ بیٹی بھی نہیں نہ ان کی بھتیجی یا بھانجی۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور میں محض ایک وارڈ کی حیثیت سے ان کے یہاں رہتی ہوں —— اس لئے غالباً آپ کا پروپوز کرنا بیکار ہے۔"

"جی —— ایں —— ؟" ایک لحظے کے لئے وہ بالکل ہکا بکا رہ گئے۔ لیکن فی الفور انہوں نے خود کو سنبھالا۔ اور بے حد کوشش سے ہنسے۔ "لیکن —— لیکن ——" انہوں نے ہاتھ ہلا کر کہنا شروع کیا۔

"بالکل نہیں۔" راحیل نے ان کی بات کاٹی۔ "میں قطعی یہ نہیں کہتی کہ آپ نے کسی طرح سے اپنے آپ کو commit کر دیا ہے۔ اس لئے آپ پریشان نہ ہوجیئے۔" وہ ہنسی۔

لیکن میجر غیاث بے حد پریشان تھے۔ اس قدر کہ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ پروپوز کرنے کے بعد اسے کلوک پہنائیں گے۔ پھر ذرا خفیف سا سہارا دے کر اسے زینے سے اترنے میں مدد دیں گے

بلکہ اگر موقع ہو تو ایک آدھا فسانوی جملہ بھی استعمال کر دیں گے ۔ مثلاً یہ کہ آپ میری زندگی میں چاندکی روشنی بن کر آئیے گا۔ میں تو مایوس ہو چکا تھا کہ کبھی مجھے اپنا آئیڈیل نظر بھی آئے گا یا نہیں۔ لیکن آپ ـــــ وغیرہ وغیرہ۔ بیگم نسیم احمد کے ڈر سے وہ کافی مرعوب ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اب جسٹس شعبان کے ہاں کی اتوار والی پکنک گول کرو ۔ اس کے علاوہ جسٹس شعبان کی لڑکی عینک لگاتی تھی۔

پیکو راجیل ستون کے پاس رُکی کھڑی تھی اور چاندکی روشنی میں بڑی متبسم آواز میں کہہ رہی تھی: مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کو اس قدر awkward محسوس کرنا پڑا۔ لیکن دیکھئے نا ـــ"

"آپ کیا کہتی ہیں مس بنگراجی ـــــ" انہوں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ ـــــ کیونکہ commit تو وہ بہر حال کر چکے تھے ـــــ میری بڑی خوش نصیبی ہے ـــ اگر مجھے ـــ میری زندگی کو ـــــ میری زندگی کو ـــ ان کی زبان پھر لڑکھڑا گئی۔

غضب خدا کا کس قدر کی زبردست غلط فہمی میں وہ پچھلے پندرہ دنوں سے مبتلا تھے کہ یہ مس صاحبہ خان بہادر صاحب کی بیٹی ہیں اور کسی کمبخت نے بھی ان کو اصلیت سے آگاہ نہ کیا۔ آخر مسوری اتنی چھوٹی جگہ ہے۔ سب ایک دوسرے کی سات پشتوں سے واقف رہتے ہیں۔

"یعنی کہ ـــــ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ـــ کہ آپ خان بہادر صاحب کی لڑکی نہیں ہیں ـــــ" انہوں نے خاصی مری ہوئی آواز میں ذرا گرمجوشی پیدا کرنے

کی سعی کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"فرق تو بہت پڑتا ہے ۔۔۔ !! اب مثال کے طور پر اس سن تیم ہی کو لیجئے۔ خالص برٹش ارسٹو کریٹک کار ۔۔۔ اور پورا نجم الدولہ ہاؤس ۔۔۔ جس کا تذکرہ آپ نے بہت سنا ہوگا ۔۔۔ اور ان دونوں چیزوں کو مجھ سے قطعی کوئی سروکار نہیں ۔۔۔ !!"

انتہائی گھبراہٹ اور شرمندگی کے مارے میجر غیاث کو زور کی چھینک آگئی۔

"خاصی سردی ہو گئی ہے ۔۔۔" راحیل کو ان پر ترس آیا۔ "اب غالباً ہمیں اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے جانا چاہئے ۔۔۔ ٹھیک ہے نا ۔۔۔" اس نے بڑے اخلاق سے کہا۔ "گڈ نائٹ ۔۔۔"

"گڈ نائٹ ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں آپ کو آپ کے سوٹ تک پہنچا دوں ۔۔۔؟"

میجر غیاث نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے ۔۔۔ یہاں سے صرف ایک ونگ اور عبور کرنا ہے۔

۔۔۔ اچھا گڈ نائٹ ۔۔۔ !!" راحیل نے متبسم انداز میں بڑی خوش اخلاق سے جواب دیا۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر وہ پلنگ پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ریاض ۔۔۔ اس نے دل میں پکارا ۔۔۔ ریاض۔

اگلی صبح کو جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ اس قدر کامیاب ڈنر تھا کہ میجر غیاث نے

فوراً پروپوز کیا۔ لیکن راحیل بلگرامی نے انکار کر دیا۔ تو ہماری امّی نے بورڈ آف پلاننگ کی ایک اور ہنگامی میٹنگ بلائی۔ بیگم نسیم احمد کو راحیل کی اس حرکت سے دلی صدمہ ہوا اور رانی بلبیر سنگھ پر اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔

راحیل بیگم نسیم احمد کے سامنے نہیں گئی۔ دن بھر وہ اپنے کمرے میں رہی اور اپنی زندگی کی امٹ تنہائی اور اداسی پر اسے رہ رہ کر رونا آیا۔ گوپالا —— اس نے دل میں دہرایا —— گوپالا؟؟

اس روز اس نے سینٹ جان ایمبولنس میں اپنی درخواست بھیج دی۔

۲۵

اس کے یہ میزبان جو محمد باغ میں اس کے قریب بیٹھے نہایت خلوص کے ساتھ ایک دوسرے سے عجیب و غریب بحثوں میں الجھ رہے تھے لیلیٰ کو بہت بھلے معلوم ہوئے۔ اس کا دماغ اب مختلف چیزوں کا ایک مخصوص طریقے سے تجزیہ کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اب تک اس نے کافی دلچسپ زندگی گزاری تھی۔ اپنے باپ کے ہاں جو لاہور کے بہت مشہور سرجن تھے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے، درختوں پر چڑھنے اور مضحکہ خیز رشتے دار خواتین کو آپس میں لڑوانے میں اس کا وقت گزرتا۔ کتابوں اور اسکول کے کام سے اسے قطعی کوئی عشق نہ تھا۔ سال کے چند ماہ اپنے ننھیال میں گزارنے کے لئے وہ اپنی ماں کے ہمراہ الٰہ آباد آتی۔ وہاں اس کے لئے بے حد اہتمام اور ارمان کے ساتھ سیاہ رنگ کا برقعہ تیار کیا گیا تھا۔ برقعہ پہن کر وہ بڑے ٹھسے کے ساتھ دوسری رشتے دار لڑکیوں کے ہمراہ شام کو جارج ٹاؤن کی سایہ دار سڑکوں پر ٹہلتی اور یہ محسوس کر کے وہ اس جذبے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتی کہ وہ برقعہ پہنے سڑک پر چل رہی ہے۔ مدھم لیمپوں کی روشنی میں اسے اپنا سایہ بہت عجیب معلوم ہوتا اور یہ ساری چیزیں اسے بے حد مسخرے پن کی لگتیں الٰہ آباد اور لکھنؤ اسے بے حد پسند تھے۔ لاہور اسے قطعی نہ بھاتا۔ لیکن وہاں بھی وہ

ہر لمحے خوش رہتی۔ بڑی آسائش اور اطمینان کے احساس کے ساتھ اس نے ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ لفٹنٹ کرنل بلگرامی سے اس کی شادی طے کر دی گئی ہے۔ مسلم اسکول میں اس نے کچھ دنوں راحیل کے ساتھ پڑھا تھا۔ لفٹنٹ کرنل بلگرامی بھی راحیل کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو ایک انتہائی شریف النفس انسان تھے اور ان لوگوں میں سے تھے، جن کے متعلق یہ معلوم کرنا بہت آسان تھا کہ وہ آج سے دو سال، دس سال، بیس سال، بعد کیا کرتے ہوں گے۔ اتنے ہی شریف النفس رہیں گے۔ شادی کے بعد وہ جس نئے اور دلچسپ ماحول اور نئے اور دلچسپ لوگوں سے متعارف ہوئی۔ ان کی وجہ سے زندگی سے، شدت کے ساتھ محظوظ ہونے کی جو صلاحیت اس کے اندر ہمیشہ سے موجود تھی اس میں مزید اضافہ ہو گیا (کرنل بلگرامی کو وہ اسی طرح پسند کرتی جس طرح فتح پور سیکری یا کنچن جنگا کو پسند کیا جاتا ہے)

اس سارے گروپ میں اسے ارون بے حد پسند آیا۔ اتنا ہینڈسم بھی نہیں تھا غریب۔ لیکن کچھ عجیب سی جاذبیت تھی اس لڑکے میں۔ کبھی وہ سوچتی دنیا میں ایک سے ایک دلچسپ اور دلکش لڑکے موجود ہیں۔ ان کا موازنہ وہ اپنے شوہر سے کرتی تھی۔ پھر فوراً اسے اپنے نامناسب خیالات پر غصہ آتا۔ بہت بری بات ہے یہ بہت بری۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا ارون تھا ہی بہت پرکشش۔ فواد کی طرح سے ایفیمی نہ تھا۔ اور اسے یقیناً خواتین سے گیلنٹری کی باتیں کرنے کا فن آتا تھا۔ علی میں لڑکپن بہت تھا۔ فواد بات کر کے ہی نہ دیتا تھا۔ ارون اس سے پہروں ادھر ادھر کی ہانکتا۔ پھر لیلے کو یہ لڑکیاں بھی بہت اچھی لگتیں مگن بالکل۔ سائیکل پہ کالج اڑی جا رہی ہیں۔ تفریح کر رہی ہیں۔ راحیل بلگرامی

کسی فوجی عہدے پر فائز ہو گئی تھیں۔ گو ان لڑکیوں کے مقابلے میں لیلے کو اپنی برتری کا خیال بھی رہتا کیونکہ بہر حال وہ بھاری بھرکم، شادی شدہ "بیگم صاحب" تھی۔ اور ان سب کو شیپرون کر سکتی تھی۔

اب کرنل بلگرامی کا تقرر کانپور ہو گیا تھا۔ وہ سب بہت خوش تھے کہ ویک اینڈ کے لئے کانپور جایا کریں گے۔ ان لوگوں کو زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ راجیل بھی اپنی یونٹ کے ساتھ کانپور ہی آ گئی تھی۔

۲۶

"بیٹے نے کانپور میں اچھا ریو تیار بنالیا ہے۔ اللہ کے فضل سے۔" اروِن نے باڑ پر سے اچک کر گفتگو جاری رکھی۔ "راحیل بٹیا بھی وہاں خاصی خوش نظر آتی ہیں۔ یونیفارم پہن کر دفتر جاتی ہیں۔ مجھ پر اس کا اس قدر رعب پڑا۔"

"پتہ نہیں اروِن تم شادی کس شبھ دن کرو گے۔ مار ایک بور ینت پھیلا رکھی ہے" اسٹیلا نے درخت کی شاخ پر بیٹھے بیٹھے اکتا کر کہا۔

"قسم اللہ تعالیٰ کی —" اروِن نے یکلخت بے حد سنجیدگی سے جواب دیا —

"اگر تم سب مل کر مجھے مسلمان کرنے پر تیار ہو جاتے تو میں فی الفور راحیل سے شادی کر لیتا کاش تم بیوقوف خرگوشنیاں اندازہ لگا سکتیں کہ مجھے وہ کس قدر پسند ہے — شاید تم نے نوٹس کیا ہو کہ اتنے سال گذر گئے۔ میں نے اب تک اس سے راکھی بندھوائی کر نہیں دی" — وہ نہایت فاتحانہ انداز سے پھاٹک کی طرف دیکھ کر سیٹی بجاتا رہا۔ "ارے انکل آگئے —" دفعتہً اس نے خوشی سے چلا کر کہا اور باڑ پھلانگ کر پھاٹک کی سمت بھاگا۔

ابا میاں آگئے۔ اتنے عرصے بعد وہ ایران سے لوٹے تھے۔ جہاں وہ تبدیل آب و ہوا کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ اپنا خاکی اوورکوٹ پہنے ہلکے پھلکے قدم رکھتے

متبسم اور صحت مند، وہ برساتی میں داخل ہوئے۔

"دیکھو میں کس قدر تندرست و توانا ہو کر لوٹا ہوں۔ سیاحت ہی میری زندگی ہے۔" انہوں نے امی سے کہا۔ "کاش میں آخری بار یوروپ کا ایک اور چکر لگا لیتا۔"

"آخری بار کیوں بھیا۔" سمہ مشوری موسی نے برا مان کر کہا۔ "ابھی تو آپ جانے کتنی بار یورپ جائیں گے۔" صبح کو اپنے احاطے میں سے نکل کر ہمارے پہلو کے برآمدے میں امی کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر وہ ترکاری والے اور ٹھیل والے سے نہایت ضروری تبادلۂ خیالات میں مصروف رہتی تھیں۔ ابا میاں کے آنے سے یکلخت سارے میں چہل پہل ہو گئی۔

"میں حسبِ معمول، زرّین تاج کی خاطر قزوین گیا۔ آج کل ایران کے جدید ادب میں نہایت دلچسپ تحریک جاری ہوئی ہے ۔۔۔ آقائے بہار نے غضب کی نظمیں سنائیں ۔۔ طہران میں آپ کے لئے میں نے یہ اوورکوٹ خریدا ہے ۔۔۔ پتہ نہیں۔ آج کل یہاں آپ لوگوں کے فیشن کی ٹرینڈ کیا ہے۔ ترکی سفیر نے آپ کے لئے یہ البم اور کتابیں بھیجی ہیں ۔۔۔ ابا میاں مجھے ہمیشہ 'آپ' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سے پارسل نکال کر فرش پر بکھیر دیئے اور آرام کرسی پر بیٹھ کے خوشی سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ "ہولی ہوکس خوب کھل رہے ہیں۔" انہوں نے مسرت کے لہجے میں کہا۔ "اور سویٹ پیز۔" میں نے ان کو بتایا۔

"جنگ ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔" سگریٹ جلا کر انہوں نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا "خاندان کی خبریں کیا ہیں۔ عالیہ بیگم کیا کر رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ نادرہ کی شادی میں شریک نہ ہو سکا۔ کرنل بلگرامی کی شادی کیسی رہی۔ نادرہ بی بی کو آپ نے میرا تحفہ دیدیا

ہوگا۔ میں نے چلتے وقت آپ سے کہا تھا کہ اقبالؔ کا سارا سٹ ان کو دیجئے گا۔"

"ابا جان میں نے سارا سٹ خریدا تو میری نیت خراب ہوگئی۔ آدھی کتابیں میں نے ان میں سے خود رکھ لیں۔ ان کے بدلے ایک کافی سیٹ اس کو دے آئی۔ دراصل ابا میاں اس کو اقبالؔ سے کچھ اتنا شدید عشق نہیں تھا۔" میں نے گلا صاف کر کے چوٹوں کی طرح کہنا شروع کیا۔

"ارے رے رے۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا۔ آج کل آپ کے فائنل امتحانات بھی تو ہو رہے ہیں۔ پرچے حسبِ معمول عمدہ ہو رہے ہیں؟"

"پرسوں اکنومکس کا دوسرا پرچہ ہے۔" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"بٹیا سائیکل تیار ہے"۔ اگلی صبح جب میں جلدی جلدی بال بنانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ہرمزی خانم نے حسبِ معمول کمرے میں آ کر بے حد سنجیدگی سے اطلاع دی۔ ہرمزی خانم کی عادت تھی کہ وہ ہر معمولی بات کا بھی اس قدر اہتمام سے اور ایسے پراسرار لہجے میں ذکر کرتیں کہ اس بات یا اس واقعے کی عظمت کا ایک لمحے کے لئے قائل ہو جانا پڑتا۔

"سائیکل تیار ہے بٹیا" ہاتھ ہلا کر انہوں نے اس انداز سے دہرایا۔ گویا گھوڑا گاڑی تیار ہے یا بہلی تیار ہے۔ سائیکل کی تقدیس سے مرعوب ہو کر میں فوراً گیلری میں گئی اور اسے باہر نکال کر باغ کی سڑک پر آ گئی۔

ڈِکلینیٹس کے جھنڈے کے برے، کالج کی گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ چیپل کے وقت تک میرا ارادہ لائبریری میں بیٹھ کر پرچے کی تیاری کرنے کا تھا۔

"بٹیا۔ سرکار بہت پریشان ہیں۔" امیر خاں نے سامنے آکر پھولی ہوئی سانس سے کہا۔ میں اور میرا چیپل کے بعد راج ونشر کے لان پر مولسری کے نیچے بیٹھے کتابوں میں محو تھے

"کیا ہوا؟" میرا نے گھبرا کر پوچھا

"وہ صاحب۔ بٹیا مزے میں یہاں بیٹھی ہیں اور سرکار صبح سے پریشانی میں برآمدے میں ٹہلتے ہیں کہ بٹیا ناشتہ کئے بغیر کالج چلی گئیں۔ سرکار آس پاس سب جگہ فون کر چکے ہیں کہ بٹیا نے ناشتہ کر لیا یا نہیں۔" امیر خاں نے جلدی جلدی بات ختم کی۔

"اُفوہ ــــ ابا جان بیکار ہیں اس قدر پریشان ہو جاتے ہیں۔" میں نے بے دھیانی سے کہا۔ "ابا میاں سے کہہ دینا کہ میں میرا بٹیا کے ساتھ پڑھنے میں سخت مصروف ہوں۔"

"لیکن بٹیا سرکار نے کہا ہے کہ میرا بٹیا کے یہاں ناشتہ کیجیے تو اودلیٹن بیٹا نہ بھولے گا۔"

"ارے بھئی۔ معلوم ہے۔ جاؤ بھاگو۔" میں نے ذرا جھنجلا کر کہا۔ اس کے بعد کتابیں سمیٹ کر ہم اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

دوپہر کو جب میں گھر گئی تو میں نے دیکھا کہ ابا میاں، اسی طرح متفکر آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔

"آپ صبح ناشتہ کئے بغیر چلی گئیں۔" انہوں نے پریشان آواز میں کہا۔

"اُفوہ ــــ اباجان آپ اس قدر معمولی باتوں کے لئے اتنے فکر مند ہو جاتے ہیں۔ سو میشوری مرسی نے ٹیلیفون پر آپ کی ہدایات کے مطابق مجھے ایک فلیپ ٹھنسا دیا تھا۔" میں نے بے فکری سے ان کو جواب دیا۔ "کل صبح پرچہ ہے۔ اب میں کل تک بالکل نہیں پڑھوں گی۔"

"ابا جان"۔ شام کو میں نے ان کی آرام کرسی کے قریب حسب معمول قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے ذرا حلق صاف کر کے تمہید باندھی ۔۔ " ابا جان۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ کل آخری پرچہ ہے اور اس کے بعد سے امتحانات ختم۔ تو ابا میاں حسب سالہائے سابق ــــ"

"اس قدر مفصل اور مرصع دیباچے کے بجائے قصہ مختصر کر کے بتلائیے کہ آپ کو اپنی اگلی پارٹی کے لیے کیا کیا اہتمامات درکار ہیں ــــ" ابا میاں نے ہنستے ہوئے بات کاٹ دی۔

" ابا جان ایک نہایت زوردار قسم کی پارٹی ــــ" میں نے ذرا انکسار اور تکلف سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"زوردار قسم کی پارٹیاں تو آپ اکثر دیتی رہتی ہیں"۔ ابا جان نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا"۔ مطلب کی بات پر آئیے"۔

" ابا جان یہ خاکسار متمنی ہے کہ اپنی ساری دوستوں کو ذرا گوپال پور تک لے جائے" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

ابا میاں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ "پارٹی کر لیجئے۔ گوپال پور جانے کے لیے وہاں کے انتظامات کی خاطر چیرمین کو اطلاع کرنی ضروری ہے اور وہ اس اتوار تک رائے بریلی سے نہ لوٹیں گے۔ اگلے اتوار کو لے جائیے گا سب کو"۔

ہم بہت دیر تک دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ آتشدان پر گھڑی اپنی متوازن یکسانیت سے ٹک ٹک کر رہی تھی۔

" اچھا جناب عالی"۔ ابا جان نے دفعتہً کیلنڈر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آج اپریل

کی دس تاریخ ہے۔ اگر آپ کل سے بھی اپنی ڈیوٹی پر آجائیں تو آپ کے ساتھ رعایت کرکے آپ کی ان دس دنوں کی تنخواہ نہ کاٹی جائے گی۔"

"لیکن صاحب جب تک تنخواہ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ میں آپ کا اوفر قبول نہیں کر سکتی۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے ان کو جواب دیا۔ "اس کے علاوہ جو مہنگائی کا الاؤنس بھی شاید آپ نہیں دیں گے۔"

ابا جان پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ جب سے انہوں نے مجھے ڈرائیونگ لائسنس دلوانے کا ارادہ کیا تھا۔ میری شرط یہ تھی کہ جتنی بار میں ان کو ڈرائیو کرکے چلے موٹر خانے سے برساتی تک ہی لاؤں۔ انہیں اس سے کم از کم دوگنی تنخواہ مجھے دینی پڑے گی۔ جتنی وہ اپنے شوفر کو دیتے تھے۔

باہر رات کا سناٹا اور تاریکی عمیق تر ہوتی جا رہی تھی۔ امی کے کمرے کی روشنی بھی بجھ چکی تھی۔ ڈیسی ایک آدھ بار اخلاقاً بھونک کر اپنی پلنگڑی پر جا کر سو چکا تھا۔ میں اور ابا میاں اسی طرح باتوں میں مصروف رہے۔

"اوہ۔ بہت رات آگئی ابا جان۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ایک بج رہا ہے غضب خدا کا۔ مجھے صبح سویرے جگنا ہے۔"

"میں اپنے خیال میں ڈنر سے بہت جلد گھر واپس آگیا تھا۔ لیکن اس وقت دس بجے تھے۔" ابا جان نے بشاشت سے کہا۔ "اچھا جا کر سو۔ شب بخیر۔"

"شب بخیر ابا جان۔" میں نے کہا۔

ان کے کمرے سے نکلتے وقت میں نے حسب معمول ان کے سلیپر مسہری کے نیچے ٹھیک جگہ پر رکھے۔ ڈریسنگ گاؤن کرسی کی پشت پر ڈالا۔ کھڑکیوں کے

پردے برابر کئے۔ صبح کی چائے کے لئے تپائی مسہری کے نزدیک سرکائی۔ ان کے غسل خانے میں جاکر ان کے مصنوعی دانتوں کو پیالے میں صاف پانی بھر کر واش بیسن پر رکھا اور غسلخانے کے دروازے کا پردہ گرا کے آہستہ آہستہ قدم رکھتی گیلری عبور کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔

اللہ میاں۔ میں نے اکتا کر سوچا "کل پرچے میں فاؤلر کمیشن پر کوئی سوال نہ آ جائے۔ ورنہ بیڑا غرق ہو جائے گا۔ یہ کمبخت باہر کے ممتحن ایک سے ایک بے تکے سوال پوچھ رہے ہیں۔ صبح کو کالج جانے کے لئے ایک سفید ساری باہر نکال کر رکھنے کے بعد میں سو گئی۔

دفعتاً وقت کو ایک جھٹکا لگا اور وہ جھٹکا سرنگ کی طرح پھسلتا چلا گیا۔

۲۷

لمحہ۔ اور اس کے بعد لمحہ۔ اور اس کے بعد لمحہ۔ وقت کے باہر گھنٹیاں پیچھے کی طرف بجتی جا رہی ہیں۔ باغ میں پانی کی موٹر جس طرح گھوں گھوں کر رہی ہے۔ گھاس میں کہر جس طرح جذب ہو رہا ہے۔ باہر روشنی ہے اور تاریکی ہے اور موت ہے اور نم زمین کے اوپر سے ہوائیں تیزی سے چلاتی ہوئی گذر رہی ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔ ابھی کیا ہوا تھا۔ میری پیاری سینٹ این ابھی یہ ہوا تھا کہ وہ انسان۔ جو گیلری کے دوسری طرف، اس گرم، محفوظ، آرام دہ کمرے میں مسہری پر سو رہا تھا، وہ اسی طرح لیٹے لیٹے اچانک ختم ہو گیا۔ غسلخانے کی طرف جاتے ہوئے وہ دفعتاً فرش پر گرا اور تم سب جب اس کو اٹھا کر مسہری پر لٹانے لگے تو وہ ختم ہو چکا تھا یعنی وہ اس جگہ، حیات کے اس دائرے سے یکلخت بالکل بے تعلق ہو گیا۔ وہ انسان، جو تمہارا باپ تھا جس نے ابھی، تین گھنٹے پہلے گھڑی دیکھی تھی، تم سے باتیں کی تھیں۔ تم کو شب بخیر کہا تھا۔

اب تم کس لئے یوں بچوں کی طرح کمروں کے کونوں میں چھپ چھپ کر، چلا چلا کر روتی پھر رہی ہو۔

ایک طوفان زدہ چاند یوکلپٹس کے جھنڈ کے پیچھے جا چکا ہے اور آہستہ آہستہ صبح ہو رہی ہے۔

اب ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہر بات کہی جا چکی ہے۔ ہر رنج سہا جا چکا ہے۔ ہم زندہ ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔ ہم مٹی کی نیلی، کہر آلود گھاس کی طرح زندہ ہیں۔

میں زندہ ہوں۔ ماضی سے یکلخت میں آگے نکل آئی ہوں۔ یہ رات، کل کی رات، جو دفعتہً ماضی میں شامل ہو گئی

ہوائیں۔ اور کرسینتھیم اور ہولی ہوکس کے پھول۔ خاموشی ریت کی طرح نیچے گر رہی ہے اور باغ کے یہ پرانے مانوس پھول، کہرے میں بلیوں کی زبانوں کی طرح نم اور خنک ہیں۔

چنانچہ ابّا میاں، یہاں سے ہم الگ ہوتے ہیں۔ آج کی اس کہر آلود صبح سے میرے اور آپ کے وجود کی کیفیت علیحدہ علیحدہ کر دی گئی۔ اور میں کسی اور جلا وطنی، کسی اور سفر کی تیاری کے لئے آپ کے ہولڈال پر چڑھی بیٹھی ہوں اور ایسا کبھی نہ ہوگا کہ زندگی میں ہم گھر واپس آجائیں۔

صبح ہو گئی۔ باغ کے پچھواڑے، شہتوت کے جھنڈ میں سے گذرتے ہوئے بوڑھے اینگلو انڈین نے حسبِ معمول بیگ پائپ بجانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ اسکاٹ لینڈ کی بلو بیلز اور اولڈ لانگ زائن بجاتا ادھر سے گذرتا ہے۔ لیکن ابّا جان کے کمرے کی یہ کھڑکی اب نہیں کھلے گی۔ یہ کھڑکی جس کے پردے میں نے رات کو برابر کئے تھے۔ ابّا جان مر گئے۔

الماریوں میں ابّا جان کے کپڑے رکھے ہیں۔ گرم ملبوسات۔ ٹائیاں۔ ڈریس سوٹ۔ سب میں وقت، جاڑوں اور نیم کے پتوں کی مہک ہے۔ وہ ڈریس سوٹ اوپر پڑا ہوا ہے جو رات کو ابّا میاں نے پہنا تھا۔ واش بیسن پر ان کے مصنوعی دانت سکون سے اپنے پیالے میں موجود ہیں۔ غسلخانے کے سفید فرش پر اکیا ڈیلوا چند بوندیں پڑی ہیں۔ سنگھار میز پر

برش میں ابّا جان کے چند سلور گرے بال اُلجھے ہوئے ہیں۔ سگار کی آدھ جلی راکھ کتابوں پر پڑی ہے۔ کمبل، لحاف، مسہری، قالین، تکیئے، پردے، تولیے، سلیپر، ہر چیز میں زندگی کی گرمی موجود ہے۔ کتابوں کی الماریوں کے پیچھے ایک چھپکلی آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ برساتی کی سمت کھلنے والے دریچے کے باہر صبح کا اخبار رکھ دیا گیا ہے۔ خطوں کے بکس میں صبح کی ڈاک لا کر رکھی جا رہی ہے جس میں حسبِ معمول ابّا جان کے نام کے بیشمار لفافے ہیں۔

ہر طرف بیشمار انسان نظر آ رہے ہیں۔ گھاس پر، چبوترے پر، برآمدوں اور کمروں میں سنجیدہ شکلیں بنائے، نیچی آوازیں باتیں کرتے، وہ سب ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں اور بے حد تندہی سے کسی خاص مرحلے کو انجام تک پہنچانے کے انتظامات میں مصروف ہیں۔ ڈرائنگ روم میں وہ مونچھوں والے وکیل صاحب بیٹھے ہیں۔ بنکوں کے کاغذات ان کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک برآمدے کی سیڑھیوں پر ندوشاعر نما انسان جلدی جلدی کچھ لکھنے میں منہمک ہیں اور بار بار رومال سے ناک کو چھوتے جاتے ہیں۔ راج دلشر کے احاطے میں ایک خیمہ لگا دیا گیا ہے۔ سڑک پر موٹروں کی قطاریں حدِ نظر تک چلی گئی ہیں۔ اروِن کی آنکھوں کے پپوٹے سرخ ہو رہے ہیں۔ میر آنٹی سفید ساری کا آنچل سر پر ڈالے سیڑھیوں پر خاموش بیٹھی ہے۔ انکل راج دلنش چھڑی کی نوک سے باغ کی زمین کریدنے میں مشغول ہیں۔

مستقل گہما گہمی ہے۔

اسٹیلا۔ اسٹیلا ــــ ابّا جان قطعی اس بات کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ گھر میں مسلسل

شور مچتا ہے ــــ اتنے سارے لوگ۔ پارٹیاں ہو رہی ہیں مستقل۔ چائے پی جا رہی ہے۔ وہ سب لان پر کیوں جمع ہیں۔ ان سے کہو چلے جائیں ایک ایک۔

سو جاؤ ــــ سونے کی کوشش کرو۔ اسٹیلا رسان سے کہہ رہی ہے۔

اور اگر ابّا جان کو معلوم ہو گیا کہ ان کے کمرے کے فرش پر ان سب لوگوں نے مستقل سگریٹ کی راکھ جھاڑی ہے اور دیا سلائیاں قالین پر بکھری ہیں۔ ابّا جان نے یہ سب دیکھا تو مجھ پر پڑے گی ڈانٹ۔ تمہارا کیا بگڑے گا ــــ میں سہم کر کہہ رہی ہوں۔

سو جاؤ۔ سو جاؤ۔

میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ حالانکہ ابّا جان ہرگز پسند نہیں کرتے کہ ان کے لئے Fusses کئے جائیں۔ ان کے لئے اتنا بڑا سفید دوشالہ آیا۔ سفید دوشالہ۔

خاموشی سے لیٹ کر سونے کی کوشش کرو بی بی ــــ یہ سو ئٹشورتی موسی کی آواز ہے

اتنا بڑا سفید دوشالہ۔ جو اُن کے اوپر ڈالا گیا ــــ میں دہراتی ہوں۔

گھڑی مسلسل ٹک ٹک کر رہی ہے۔ وقت لرز رہا ہے۔

میں ادھر ادھر گھوم رہی ہوں۔ گھر میں نسبتاً خاموشی طاری ہو چکی ہے۔ چبوترے پر ابّا جان کی دھاری دار کینوس کی آرام کرسی رکھی ہے۔ سالہا سال تک دھوپ میں رکھی رہنے کی وجہ سے اس کا رنگ اڑ گیا ہے۔ اس کینوس کو میں نے ابھی چھوا ہے۔ چچا میاں خاموشی سے برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ چھوٹے چچا میاں ان کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے آ کر اس آرام کرسی پر چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی کبھی اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر کہہ اٹھتے ہیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں ان کے تیسرے ساتھی کو بھی دیکھنا چاہتی ہوں اور میری نظر گیلری کے دروازے کی طرف اٹھتی ہے۔ جس میں سے باہر آ کر ابّا میاں اس چبوترے پر بیٹھ جاتے تھے۔

لیکن وہ دروازہ بند ہے۔ اباجان کا کمرہ مقفل کر دیا گیا ہے۔

یہ کھانے کا کمرہ ہے۔ کھانے کی میز پر ابا جان کا بریکفاسٹ کا سامان اسی طرح لگا ہوا ہے اور گو میں نے کل سے کھانا نہیں کھایا ہے ابا جان نے کہیں اس فکر میں نوکر نہیں دوڑائے۔ کہیں ٹیلی فون نہیں کئے۔

برساتی میں اولڈز موبیل سکون سے کھڑی ہے۔

بی بی! آج ۱۰/اپریل ہے۔ کل سے آپ ڈیوٹی پر آجائیے۔

بی بی! آج آپ کہاں جا رہی ہیں۔ کیا پہنا ہے۔ آکر دکھلائیے۔

اوہ! جناب آج آپ نے جیبیوں والے بلاؤز پہنے ہیں۔ کسی فینسی ڈریس کی تیاری ہے؟

آج رات کو آپ کا ڈرامہ کے بجے ہے۔ میں اس کو سننے کی خاطر کہیں باہر نہ جاؤں گا۔

بی بی! آپ کو اقبال کو سمجھنے کا سخت دعوےٰ ہے۔ آئیے ذرا "اسرارِ خودی" کے یہ اشعار تو پڑھئے۔

اباجان ہم کالج ڈے کے موقعے پر "گوالٹی اسٹریٹ" اسٹیج کر رہے ہیں۔

ابا میاں اپنا خوبصورت گرے سوٹ پہنے کار سے اتر کر نکلسن ہال کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں۔ کالج کے پورچ میں داخل ہو کر مسز داتس سے باتیں کر رہے ہیں۔ کوریڈورز میں سے گذرتے دوسرے مہمانوں اور فیکلٹی کے ساتھ ڈرامے کے اوڈی ٹوریم کی طرف آرہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں پروگرام ہے۔ جسے بار بار دیکھ کر ان حصوں کو دوبارہ پڑھتے ہیں جہاں میرا نام ہے۔

اباجان ریڈیو کے پاس گرم ڈریسنگ گاؤن اور کمبل میں پلٹے میر اکوئی مباحثہ یا ڈرامہ سن رہے ہیں۔ آپ کی بحث کے نکتے شروع سے آخر تک غلط تھے جب میں ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتی ہوں تو وہ خفگی سے کہتے ہیں۔ آپ طالب علم حضرات دوسروں کے مسائل کا حل سوچتے ہیں اور خود ایک مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔

کرسمس یا گرما کی تعطیلات میں تینوں بھائی تینوں میں سے کسی ایک کے گھر پر جمع ہیں سارے گھر کو بچوں کی تفریحات اور اودھم کے لئے چھوڑ کر باغ میں سن شیڈ کے نیچے انہی بچوں کے مستقبل کے لئے اسکیمیں بنائی جارہی ہیں۔ زمینداری کی خاندانی مقدمہ بازیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ شعر و شاعری پر بحث ہوتی ہے " ہم سب آپ حضرات کو اپنی فینسی ڈریس پارٹی میں مدعو کرنا چاہتے ہیں "۔ بیحد سنجیدگی سے ہم لوگ جا کر ان سے کہتے ہیں " آپ حضرات مع اپنی بیگمات کے تشریف لائیے اور اگر اونٹ یا بہلی پر بیٹھ کر آئیے تو زیادہ مناسب ہے " ۔ چچا میاں عرب شیخ بنے ہیں۔ ابا میاں سے نرسری کی نظمیں سنوائی جا رہی ہیں۔

سو جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لئے سو لو ۔۔۔ سویٹ ہوری موسی جھک کر پھر رماں سے کہتی ہیں۔

اباجان کا کمرہ بند کر دیا گیا ہے۔ الماریاں مقفل کی جارہی ہیں۔ ضروری کاغذات

مختلف درازوں میں سے نکال کر مونچھوں والے وکیل صاحب کو دیئے جا رہے ہیں یا ترتیب سے علیحدہ رکھے جا رہے ہیں۔

یہ کتب خانہ ہے جس میں دنیا کی پانچ زبانوں کے ادب کی بہترین کتابیں جمع کی گئی ہیں یہ کتابیں عمر بھر کی تلاش، تحقیق، جستجو اور شوق کا ماحصل ہیں۔ ترکی، عربی، فرنچ اور فارسی کی ان پرانی اور نئی کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ یہ اسی طرح ان الماریوں میں رکھی رہیں گی یا کسی قومی لائبریری کو تحفتہً دے دی جائیں گی۔ اس موجودہ دنیا میں کتابوں کے اس انبار کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

اس دراز میں ابا میاں کی تصنیفات کے نامکمل مسودے پڑے ہیں۔ "یہ طارق" ہے جس کا ترجمہ ابا میاں مجھ سے لکھوا رہے تھے۔ "یہ ابن موسیٰ" ہے جس کا ایک باب انہوں نے پچھلے ہفتے مکمل کیا تھا۔ کس طرح وہ ترکی پڑھتے پڑھتے اسی وقت روانی سے اس کا ترجمہ اردو میں لکھوانے جاتے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ قالین پر کہیں ٹھٹھک جاتے اور سگار کی راکھ جھٹک کر ایک لمحے کے لئے غور سے فرش کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے اور پھر بولنا شروع کر دیتے۔ اتنی دیر میں بور ہو کر ادھر اُدھر دیکھتی رہتی یا بھاگ جانے کی ترکیبیں سوچتی "ابا جان۔ اب باقی کل ـــــ ابا جان ابھی مجھے ذرا میرا کے ہاں جانا ہے۔"

"بہت اچھا۔ کل اگلا ایکٹ لکھیں گے۔" وہ خوشی سے کہتے۔

ان منتشر کاغذوں پر ابا جان کے گاہے بگاہے پنسل سے لکھے ہوئے اشعار ہیں، جن میں سے بہت سے مٹ چکے ہیں۔ میں فرش پر بیٹھ کر بے خیالی سے ان

کاغذوں کو دیکھ رہی ہوں۔

یہ غالباً کسی آل انڈیا مشاعرے کی صدارت کے موقع کی نظم ہے:۔

کیوں مجھ کو کیا ہے صدرِ مجلس کیوں مجھ کو عطا ہوئی یہ جاگیر
جب دیکھئے تخت پہ ہوں بیٹھا منبر پہ ہو جیسے واعظ پیر
صد شکر ز سعیٔ نوجواناں یک قصرِ ادب شدست تعمیر
بزمِ ادبِ جدید کی اب افکارِ جدید سے ہے تنویر
اس بزم میں ایک ادیبِ کہنہ کیوں لائے ہیں آپ بہرِ تشہیر
رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

چند اور اشعار ہیں۔ جو ایک دوست کے حیدرآباد دکن جانے پہ کچھ عرصہ قبل لکھے ہیں:۔

اللہ نے کیا ہے تمہیں صاحب نفوذ اور شاہ نے کیا ہے رعایا کا پاسباں
کوشش یہ ہو کہ خلقِ خدا کا رہے خیال اور یہ نہ ہو تمہاری جبیں شہ کا آستاں
وہ فاتح قلوب دلوں کا وہ حکمراں پرچم ظفر کا کھول کے ہوتا ہے پھر رواں
ہندوستاں کے بعد ہے فتح دکن کا عزم
نصرت تمہیں نصیب ہو احمد سعید خاں

اور یہ "کعبے کے سامنے" ہے:۔

آوارہ گرد آج ترے در پہ ہے کھڑا اللہ کیا کشش ہے ترے آستانے میں
تشکیک و شبہ دشمنِ ایمان ہی رہے سنتا ہوں دل کا چین ہے تیرے خزانے میں

وقت کے ساتھ جو کچھ ان پر گذرا، ان کی پاکیزہ سرشت، شرافتِ نفس اور رکھ رکھاؤ ہوئی شخصیت نے حیات کے جن رنگوں، جن کیفیتوں کا تجربہ کیا اور سہا۔ ان کی مختلف طریقے سے آئینہ دار یہ منتشر نظمیں ہیں جو انہوں نے کبھی کبھی لکھ کر بے پروائی سے ڈال دیں۔

یہ نظم چند سال قبل انہوں نے اپنی عزیز ترین بھتیجی کی شادی پر لکھی ہے —— جس بھتیجی کے ذہن اور قابلیت کے ذکر پر وہ دلی مسرت اور فخر کے بے پایاں احساس کے ساتھ کھل اٹھتے ہیں ——

چناں بر زمیں زہرہ آمد ز چرخ — خمید و چمید و ذمید و رمید
چو پرسیدم از وے حالت چہ گفت — چرا من نہ رقصم بطرزِ جدید
زبس منتظر بودم ایں روز را — ز الطافِ حق آخر آمد پدید

یقیناً ابا جان ان دنوں بے حد خوش ہیں۔ اس چہیتی بھتیجی کے لئے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے —— ان اشعار سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک بزرگ نے اپنے بچوں کو مخاطب کیا ہے بلکہ لگتا ہے کہ ایک دوست نے دوسرے دوست کے لئے دلی خوشی اور ذہنی رفاقت کے احساس کے ساتھ یہ سب لکھا ہے ——

آج نقیبِ گلعذار، کہہ یہ رہا ہے بار بار — اس پہ کروں گا نا الشیں، شیخِ حرم ہو ہوشیار
توبہ شکن ہے مے فروش، چار طرف ہے نائے نوش — شرح میں کا کس کو ہوش کیوں نہ ہوا ہیں بے محابا
گرچہ رہا ہیں غم بدوش آہ نہ کی رہا خموش — کعبۂ دل سیاہ پوش، جانِ حزیں سوگوار
آج مگر وہ آگیا، خانۂ دل بسا گیا — روح پہ میری چھا گیا، آج میں ہوں بختیار
مجھ کو خوشی ایک در ہے، لانا تو ایک جام مے — تخت کیاں و تاج کے، ایسی خوشی پہ سب نثار
بنتِ نصیرِ نکتہ داں، صاحبِ علمِ بیکراں — مایۂ نازِ دختراں، علم و حیا کی تاجدار

ملکِ وفا کا تخت و تاج، اس کو ملا بہ ایں قرار
اس کا نصیب کامگار، اس کا زمانہ سازگار

ـــ کیونکہ ابا میاں اپنے بچوں کے دوست اور رفیق ہیں۔ ان کے ذہنوں اور ان کے احساسات کو سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا ان بچوں کو اس طرح نہ سمجھ سکے گی۔

میز کی نچلی درازوں میں وہ پرانے البم پڑے ہیں جن کی تصویروں کا رنگ مدھم ہو چکا ہے۔ اباجان جو ایم۔ اے او کالج کے ذہین ترین اور سب سے زیادہ ویل ڈریسڈ طالب علم سمجھے جاتے ہیں۔ پکی بارک کے سامنے، یونین کے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے آرنلڈ اور موریسن کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل کے یوروپ کے مختلف دارالسلطنتوں کے سفارت خانوں کی سیڑھیوں پر، اٹنگے سوٹ پہنے، بے حد سنجیدہ شکلوں والے انسانوں کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ وی آنا اور بوڈاپیسٹ کے باغوں میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور پیچھے فوارے چل رہے ہیں۔ آس پاس، عجیب و غریب پرانے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس آدمیوں اور خواتین کے گروہ ہیں۔ یہ استانبول ہے۔ یہ اناطولیہ ہے۔ یہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء کا زمانہ ہے۔ قسطنطنیہ میں یہ اباجان کی چھوٹی سی گمنام شاطو ہے۔ اس میں ترکی کے نئے نوجوان ادیبوں، نوجوان دیوانوں کا مجمع رہتا ہے۔ یہ شاندار خوبصورت سفید رنگت والا عجیب و غریب ہندوستانی نوجوان جو اتنے دور دراز کے ملک سے یہاں آیا ہوا ہے۔ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر اپنی شاطو میں ان سرپھرے انقلابیوں کو مہمان رکھتا ہے جن کی گرفتاری اور جلاوطنی کے لئے حکومتِ عثمانیہ وارنٹ جاری کر چکی ہے۔ اس انوکھے نوجوان نے ترکی زبان کا

ایک تخلص بلدرم اختیار کر رکھا ہے اور اس نام سے وہ اپنے ملک کے رسالوں کے لئے عجیب وغریب کہانیاں اور خواتین کی آزادی کے لئے شعلہ ریز مضامین یہاں سے لکھ لکھ کر بھیجتا رہتا ہے۔ اپنے دیوان پر بیٹھے بیٹھے اور قہوے کے فنجان ختم کرتے ہوئے یہ ان آیندہ زمانوں کے خواب دیکھتا ہے جب اس کے ملک میں بھی اسی طرح انقلاب کو خوش آمدید کہنے والے پیدا ہوں گے۔ جب وہاں کی خواتین کو بھی عزتِ نفس کا احساس پیدا ہوگا۔ روس کا انقلاب ابھی بہت دور ہے۔ ایران ابھی تک قرونِ وسطیٰ میں کھویا ہوا ہے۔ قزوین کی زرین تاج کو ایرانی یاد رکھنا نہیں چاہتے ہندوستان میں اکبر الہ آبادی لوگوں کو ہنسا کر رلانے میں مصروف ہیں اور قسطنطنیہ کی اس گمنام شاطو میں یہ لوگ عجیب وغریب اصلاحات نافذ کرنے کی اسکیمیں بنانے میں محو ہیں۔ ینگ ٹرک پارٹی کا پہلا جلسہ اس شاطو میں منعقد ہو رہا ہے۔ ان سب کا میزبان، یہ انوکھا ہندوستانی بچوں کی طرح اکسائیٹڈ اور خوش ہے۔ سلطان کے جاسوس مکان کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ ترکی تخلص والا یہ ہندوستانی اپنی شدید امید آفرینی، شدید خود اعتمادی کے ساتھ، کسی شہرت، کسی صلے کی مطلقاً تمنا نہ کرتے ہوئے چپکے چپکے ترکی کے انقلاب کے لئے کام کر رہا ہے —— ترکی سے یہ کیسا والہانہ عشق ہے، کیسی روحانی، قلبی اور ذہنی کشش ہے۔ یہ عشق، یہ کشش آخر تک باقی ہے اور اسی شدت سے زندہ ہے —— یہ نامق کمال بے کی جلدیں ہیں۔ یہ جمہوریت اور ادیانش کے قائل ہیں۔ یہ جنرل فخری پاشا کے خطوں کے لفافے ہیں —— ابا جان علی گڈھ کے اسٹریچی ہال کے ڈائس پر نہایت رواں، شگفتہ اور شستہ ترکی میں خالدہ ادیب خانم کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ ان کی ابتدائی تحریروں کو سراہ رہے ہیں۔ خالدہ ادیب خانم اپنی

جگہ سے اٹھ کر ان کا شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ لیکن تقریر کے دوران میں وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ وہ اپنے پچھلے ادبی استائل سے اب تائب ہو چکی ہیں اور اسے محض ایام جہالت کی یادگار تصور کرتی ہیں۔ ابا جان خاموش رہتے ہیں ــ" ہالدہ ہانم کو کیا پتہ کہ ان کی ایام جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے۔ پھر خلط بحث سے کیا حاصل۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ہالدہ ادیب کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں"۔ وہ بعد میں کہتے ہیں۔ یہ ۱۹۳۵ء ہے۔ دنیا یکسر بدل چکی ہے۔ اس کے باوجود ۱۹۰۵ء کے اس انقلابی کے دل و دماغ کی اقدار نے زندگی کے گھٹیا پن سے معاہدہ کرنا نہیں سیکھا ہے۔

ابا جان کو انت سمے تک انسانیت کی آخری اچھائی پر اعتماد رہا ہے۔ یہ ان کی آخری نظم ہے۔ جو انہوں نے چند ماہ قبل لکھی ہے جس میں انہوں نے ایک غمزدہ دوست کو مخاطب کیا ہے :۔

نہ مرنے کی کرنا کبھی آرزو ۔۔۔ شکستہ نہ کر اپنا جام و سبو

. . . .

غرض زاہدی یہ نصیحت سنو ۔۔۔ جیو، اگرچہ جینے میں غم ہی سہو
مگر کر رہا ہے جو یہ وعظ و پند ۔۔۔ نہیں خود نصیحت پہ وہ کاربند
وہ دنیا سے نومید و بیزار ہے ۔۔۔ غم و رنج کا اس پہ انبار ہے
وہ قلب حزین و دلِ دردمند ۔۔۔ وہ سوزِ درون و فغانِ بلند
شب و روز صبح و مسا تلخ کام ۔۔۔ چہ خوش دادہ ام زندگی را نظام

ابّا جان نے آج تک اپنے کسی رنج یا مایوسی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اپنی جسمانی اور روحانی ہر تکلیف کو نہایت خاموشی اور بہادری کی شان کے ساتھ برداشت کیا ہے۔ لیکن ان اشعار کو، انہوں نے ختم ہونے سے چند روز پہلے، اپنے ایک دوست کو بتانا چاہا ہے کہ وہ زندگی سے خوش نہیں رہے۔ کتنے کم لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ایسے اعلیٰ نفس انسانوں کے لئے بالکل جگہ نہیں لیکن ابا جان کی خود اعتمادی شروع سے آخر تک قائم ہے۔ وہ اسی طرح بشاشت سے گنگناتے رہتے ہیں۔ گولف کھیلنے جاتے ہیں۔ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں میں شریک رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کو اس کا خیال رہتا ہے کہ ان کی وجہ سے کسی اور کو معمولی سا رنج بھی نہ پہنچے۔ ان کو سمجھنے والے بہت کم ملے ہیں۔ لیکن وہ کسی سے اس کی شکایت کرتے نہیں پائے گئے۔ زندگی سے ان کو جو توقعات رہی ہوں گی اور انسانوں کی طرف سے ان کو جو مایوسیاں ہوئیں۔ ان کی فہرست بنا کر انہوں نے کبھی کسی کو نہیں سنائی۔

میں فرش پر بے دھیانی سے بیٹھی ان کا غذات کو الٹ پلٹ رہی ہوں۔ اللہ کا غذوں، ان الفاظ میں اب کیا رکھا ہے۔ میں سوچنے کی کوشش کرتی ہوں ابّا جان شروع سے آخر تک وجود کی ایک سطح پر زندہ رہے۔ اسی شدّت سے انہوں نے زندگی کے بے پایاں حسن، بے پایاں اُداسی، بے پایاں ابدی مسرت کا اندازہ لگایا۔ وہ آخر وقت تک، برسوں رات تک، ۱۹۰۷ء کے نوجوان رہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے زمانے سے پچیس سال آگے سوچا اور آخر وقت تک اپنے آپ کو دنیا کے اس ہجوم میں بالکل تنہا پایا۔

میں کاغذات کی ورق گردانی کر رہی ہوں۔ یہ ابا جان کا خطبۂ صدارت ہے جو انہوں نے ہندوستانی اکیڈیمی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ۱۹۲۶ء میں الٰہ آباد میں پڑھا۔ اس طویل خطبۂ صدارت کو ابا میاں نے امیرؔ کے اس شعر پر ختم کیا ہے:۔

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ دے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

میں فرش پر سے اٹھتی ہوں۔ میں نے کاغذات سمیٹ دیئے ہیں۔ یہ کمرہ بند کر دیا جائے گا۔ ان بیکار چیزوں سے اس جذباتی لگاؤ کا کوئی حاصل نہیں۔ باہر نیلی گھاس میں چھپی ہوئی مٹی اور نم اور خنک ہے اور آوارہ ہوائیں ادھر ادھر منڈلاتی پھر رہی ہیں۔

سو جاؤ۔ بھول جاؤ — سو جاؤ — اسٹیلا عباسی مخملیں سلیپر پہنے، نیلے ہاؤس کوٹ میں ملفوف، ہاتھ میں شمعدان لیئے دبے دبے پاؤں رکھتی آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔

حلی نے برساتی کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے بیسواں سگرٹ جلایا ہے اور پوری طرح آنکھیں کھول کر سامنے باغ کی تاریکی کو غور سے پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہے۔

دودھ والے کی گاڑی حسب معمول ندی کے راستے پر سے شور مچاتی کہرے میں سے نکل کر باورچی خانے کے پھاٹک کی طرف آتی ہے۔ سڑک پر جامنوں کے پیچھے

بیل گاڑیاں کھڑی ہیں۔ جن پر فالتو سامان اور فرنیچر لاد کر گوپال پور کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ تصویریں۔ کتابوں سے بھرے ہوئے ٹب، پرانے جھاڑ فانوس۔ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹائی جاتی ہیں تو ان کے ساتھ ایک بیکار سا ترحم چپکا رہ جاتا ہے۔ شاگرد پیشے کے پچھواڑے زمین نم ہے اور فضا میں کھاد اور بھوسے کی مہک ہے۔ میں نے جنگلے کی ٹھنڈی لکڑی پر سر رکھ دیا ہے۔ مجھے یہ جگہ، یہ جنگلہ ہمیشہ سے پسند ہے۔ لہٰذا میں کچھ دیر یہیں ٹھہروں گی۔ میں خود کو بتاتی ہوں۔

گھر، سرو کے درختوں میں چھپا ہوا، ہمیشہ کی طرح خاموش، باوقار اور پرسکون اپنی جگہ پر موجود ہے۔ ہولی ہوکس اور سوئیٹ پیز کھل رہے ہیں۔

فصل سوم

۴۸

برآمدے میں لیلانے سہ پہر کی چائے کے انتظام میں منہمک تھی۔ سامنے گنگا کی لہروں پر سنہری سی دھند بکھرتی جا رہی تھی۔ کیا اس کو اس بات کا رنج ہے کہ اس کی زندگی میں کبھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ نیرا نے برآمدے کی سیڑھیوں پر آتے ہوئے سوچا۔ کہ اس کی زندگی انتہائی غیر ڈرامائی گذری ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے یاد کر کے وہ اداس ہو سکے۔ کوئی فرانس سے لکھے ہوئے خطوط۔ کوئی پرانی یادگار یعنی اس کی وجہ سے کسی شوہر نے اپنی بیوی کو نہیں چھوڑا۔ کوئی ایک گھر بھی برباد نہیں ہوا۔ اس نے کبھی کلب میں کسی سے اس وقت رین ڈے وو نہیں کیا۔ جبکہ اس کے والد برج کے کمرے میں مصروف تھے ——— اور اپنی ان ویک اینڈ کی پارٹیوں میں، کیسی شدید دلچسپی کا اظہار کرتی ہے۔ کتنی طمانیت سے پیالیوں میں چائے انڈیل رہی ہے۔ یہ برآمدہ اس وقت ایک مکمل تصویر ہے۔ ایک مکمل لمحہ۔ جبکہ وہ سب روشنی پر سے گذرتے

جاء کے لئے ادھر آ رہے ہیں — ایک دائرہ۔ محض ایک دائرہ

نیلا۔ ہری۔ راجیل اور میری پیاری بہن میرا انگنی — اروِن نے ٹینس کورٹ کی بیچ پر سے جمائی لے کر اٹھتے ہوئے دیکھا۔ ابھی یہ سب ان زرد پھولوں کے پیچھے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ پھر برج کھیلیں گے۔

"اروِن"۔ میرا کی آواز آئی۔

"آتا ہوں بھائی"۔ اروِن نے جواب دیا۔ کسی طرح ان سب چیزوں کو ایک جھٹکے سے ختم نہیں کیا جا سکتا؟ اس سارے چکر کو۔ وہ غصے سے چیونٹے جو ٹینس کورٹ کی سطح پر ایک قطار میں چل رہے تھے۔ ان کو اپنے بوٹوں سے رگڑنے میں مصروف ہو گیا۔

"کرنل راجونش —" برآمدے میں سے ہری نے پکارا

"کرنل راجونش —" روش پر سے اس کے نزدیک آ کر گویا مذاق اڑاتے ہوئے میرا انگنی نے دہرایا۔

"یہ ٹھیک ہے"۔ اس کے ذہن نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں کرنل راجونش ہوں۔ میں بھی ان سب میں اس منظر میں شامل ہوں"۔ اس نے غصے سے ایک اور چیونٹے پر پیر رگڑا۔

"نیلے"۔ اس نے کچھ اپنے آپ سے کچھ میرا سے کہا

"نو — ون ٹریک مائنڈ"۔ میرا انگنی نے سر ہلا کر غصے سے کسی پروفیسر کی طرح جواب دیا — "تم کو شرم آنی چاہیے اروِن کمار راجونش۔

اروِن نے چار پانچ چیونٹے اور رگڑ ڈالے

"کیوں مار رہے ہو ان کو"۔ میرا خفگی سے چلائی

"لیلے! کچھ سوچ کیوں نہیں سکتی"۔ ارون نے اسی خفگی سے چلا کر جواب دیا۔

"تم ہر جاندار کو اپنے ذہن اور اپنے محسوسات کی سطح پر پہنچا کر مار ڈالنا چاہتے ہو۔ میں انسان"۔۔۔ میرا نے غصے سے اسے دیکھ کر کہا۔

ارون نے بنچ پر سے کھڑے ہوتے ہوئے چیونٹوں کی ہاو پر چڑھتی قطار کو بوٹ کی نوک سے پھر نیچے گرا دیا۔۔۔

"مت مارو چیونٹے"۔۔۔ میرا نے شدید رنج۔ غصے اور نفرت بھری آواز میں کہا۔

"مجھے پتہ نہیں تھا میری پیاری بگڑیا ایسی بہن کہ تم جین بھی ہو"۔۔۔ ارون نے طنزیہ آواز میں اداسی سے کہا۔

وہ دونوں روش پر سے گذرتے ہوئے برآمدے کی سمت چلے گئے۔

خدا کرے لیلے بلگرامی میں سوچنے کی صلاحیت کبھی پیدا نہ ہو۔۔۔ وہ ہمیشہ اس برآمدے کے منظر سے اسی طرح وابستہ رہے ۔۔۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میرا نے دل میں کہا اور جھنجلا کر اپنے بھائی کو دیکھا۔

"سنو۔۔ لیلے"۔۔۔ ارون نے گنگا کی لہروں میں ایک پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

۔۔۔"یہ سب بکواس ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ سب۔ یہ پارٹیاں جو تم ہر ہفتے دیتی ہو جس میں لکھنؤ سے یہ تمہارے عزیز دوست یہاں آتے ہیں۔ تمہاری ساریاں اور تمہارے برآمدے کے زرد پھول۔ مجھے ان سب چیزوں سے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ یہ سب مور بڈ ہے"۔۔۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ایک اور طویل لفظ استعمال کیا۔ "مور بڈٹی۔۔۔

یعنی کہ ۔۔۔ یعنی کہ"۔۔ اس نے لفظ کا مطلب سمجھانا چاہا۔۔ "جہنم میں جائیں یہ سارے الفاظ۔۔۔ میں خود نہایت اعلیٰ قسم کی بکواس ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن سنو"۔۔ اس نے یکلخت نہایت سنجیدگی سے، رک رک کر کہنا شروع کیا۔۔ "اتنی مدتیں گذر گئیں جب فیض آباد روڈ کی باڑ پر سے اچکتے ہوئے مجھے پہلی بار تم نظر آئی تھیں۔ اس دن کے بعد سے میں نے کتنی بار سوچا ہے کہ ایسا کبھی نہ ہو سکے گا کہ میں اور تم اکٹھے زندگی بتا سکیں، تم آتشدان کی آگ کے سامنے، میرے قریب بیٹھی ہو، جبکہ باہر برف گرتی ہو"

وہ دفعتہً رک گیا۔

"کرنل راجونش"۔۔۔ لیلے نے آہستہ سے کہا۔ "یہاں سے چلے جائیے اور نرملا سے شادی کر لیجئے۔"

"نرملا ۔۔۔ یہ ہر موقعے پر بات بے بات کوئی نہ کوئی لڑکی میرے سامنے کیوں پیش کر دی جاتی ہے۔" اس نے بچوں کی طرح چڑ کر پیر پٹکتے ہوئے کہا۔ "اسی لئے تم اپنے یہاں دنیا بھر کی بور لڑکیوں کو بلا بلا کر پارٹیاں دیتی رہتی ہو ۔۔۔ فو ۔ بہت اچھا ۔۔۔ بیگم صاحبہ۔" اس نے اخلاق سے ذرا جھک کر کہا۔ "اگر آپ رات کو کلب آرہی ہوں تو مجھے میس پر فون کر دیجئے گا۔ غالباً ہری نے کچھ لوگوں کو مدعو کیا ہے۔" اور سیڑھیاں اتر کر لمبے لمبے قدم رکھتا ساحل پر آگیا۔

گنگا کے اس کنارے کلارس ٹریٹ ہے۔ اس کے آس پاس دور دور تک گھاس کے میدان پھیلے ہیں اور جھاڑیاں، چھاؤنی کے فوجی افسروں کے بنگلے دوسرے کنارے پرے دھند میں جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے برآمدوں پر سرخ اور زرد پھولوں کا

سایہ ہے اور آگے ٹینس کورٹ ہیں۔ رول پڑے ہیں۔ پھاٹک عموماً آدھے کھلے رہتے ہیں۔ مال روڈ جو رات کو خاموش ہو جاتی ہے۔ اس پر سے موٹریں گزر کر کلب کی طرف آتی ہیں جو اسی ساحل پر گھنے درختوں میں چھپا ہوا ہے۔ یہ کلب غدر کے زمانے سے یہاں موجود ہے۔

رجب علی بیگ سرور کو جلاوطن عبور دریائے شور کی سزا میں گنگا کے پار بھیجا گیا تھا۔ یا جب امراؤ جان ادا یہاں آئی تھیں۔ اس وقت سلطنت برطانیہ کے فرزند، ایمپائر کی مخصوص آؤٹ پوسٹ پر، اسی کلب کے چبوترے پہ بیٹھ کر اسکاچ سے شغل کرتے تھے۔ وہی انگریز، ذرا مختلف لباس میں، کیونکہ پون صدی گزر چکی ہے۔ اس وقت بھی کلب کے کمروں اور چبوتروں پہ جمع اسکاچ سے شغل کر رہے ہیں اور پانیر پڑھتے ہیں۔ اس پون صدی میں ایمپائر کی ان مختلف آؤٹ پوسٹس کے ماحول میں جتنی تبدیلیاں ہوئیں۔ ان کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ خوش نہیں۔ دھندلی آنکھوں سے وہ اپنی وفادار رعایا کو دیکھتے ہیں جو مہذب سدھے ہوئے اعلیٰ نسل کے اسپینئل اور فوکس ٹیریر کتوں کی طرح نہایت خوشدلی اور بشاشت سے گھاس کے قطعوں اور کمروں میں ادھر ادھر چل پھر رہی ہے۔ وفاداری کے مدارج میں اتنی ترقی ان دھندلی آنکھوں اور سرخ مونچھوں والے انگریزوں کو بیک وقت محظوظ بھی کرتی ہے اور افسردہ بھی۔ لکھنؤ کے محمد باغ اور چھتر منزل کی طرح یہ کلب بھی شدید ترین برطانوی اور حاکمانہ قدامت پرستی کی روایات میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن اب ان کے کمرے ہندوستانی ممبروں کی موجودگی کو برداشت کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے جو فوج اور سول سروس کے افراد ہیں یا شہر کی ملوں کے مالک ہیں۔ یہ شہر ایشیا کے عظیم ترین صنعتی مرکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈھائی لاکھ مزدور مرد اور عورتیں اس کے کارخانوں میں کام کرتے

ہیں۔ ہمارے صوبے کے کسان، جب بے دخل کر دیئے جاتے ہیں۔ یا مہاجن ان کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ یا زندگی میں کسی ایڈونچر اور رنگینی کے خواہاں ہوتے ہیں تو اس شہر کا رخ کرتے ہیں اور دور سے کملاری ٹریٹ کے طلسمات کا نظارہ کرتے ہیں جو شہر کے عظیم ترین میگنیٹ سر پدما پت سنگھانیا نے اپنی بیوی کی خاطر بنائی ہے۔ اس کے بعد وہ باقی ڈھائی لاکھ کے ہجوم میں داخل ہو جاتے ہیں اور اپنی ہری زمینوں کو واپس جانا انہیں کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

ویسے زندگی میں بڑی گہما گہمی ہے۔ کملاری ٹریٹ کے علاوہ یہاں جے پی سری واستوا کا مکان بھی خاصے کی چیز ہے۔ پھر پولو گراؤنڈ ہے۔ چھاؤنی کے شاندار میس ہیں سرخ مونچھوں والا انگریز جو ایک صدی پہلے، جان کمپنی یا ملکہ معظمہ کے احکامات بجا لانے کے سلسلے میں لکھنؤ سے گنگا پار آتا تھا اور اس چبوترے پر بیٹھ کر اسکاچ پیتا تھا۔ اس وقت نم آلود آنکھوں سے ان مناظر کو دیکھ رہا ہے۔ شدید نوسٹیلجیا کے ساتھ وہ ان زمانوں کو یاد کرتا ہے۔ جب گھاس پر سفید سائے اور سفید ٹوپیاں پہنے اس کی ہم قوم خواتین اپنے گیلنٹ مداحوں کی تعریفیں قبول کرتی تھیں۔

ریاض، جو جانے کس طرح ہر جگہ اپنے آپ کو موجود پاتا تھا، چبوترے کی کرسی پر سے اٹھا۔ کل صبح وہ ایک سرکاری کانفرنس میں شرکت کے لئے دلی سے یہاں آیا تھا۔ آج رات کو وہ یہاں سے لکھنؤ جا رہا ہے۔ وہ تیسری بار لکھنؤ جا رہا ہے۔ وہاں بہت سی چیزیں جو اسے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہی چیزیں اسے ری پیل بھی کرتی ہیں۔

لیکن اسے بہر حال زندہ رہنا ہے۔ اسے لکھنؤ میں ایک اور سرکاری میٹنگ میں

بھی بہرحال شمولیت کرنی ہے۔

وقت گذارنے کی خاطر وہ اخباروں کی میز کی جانب گیا۔

"آپ ___ آپ ریاض الدین احمد ہیں ___؟" ایک لڑکی نے جو دوسری طرف کھڑی تھی یکلخت گھبرا کر پوچھا۔

"جی ہاں ___؟!" اس نے متعجب آواز میں جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے۔ معاف کیجئے گا ___ بہت دنوں سے یہاں کوئی سے لے بریٹی نہیں آیا۔ وہ زیادہ تر دریا کے پرے رہتے ہیں اور پولو کھیلتے ہیں اور ایک دوسرے کو ایڈ مائر کرتے ہیں۔ صرف شام کو یہاں آکر بیٹھی ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اور زیادہ ایڈ مائر کرتے ہیں ___ آپ ___ آپ کیا بیگم بلگرامی سے ملنے آئے ہیں ___؟" لڑکی نے کہا۔

"جی نہیں ___ وہ کون ہیں؟"

"میں نے، میں نے دراصل راحیل بلگرامی سے آپ کا ذکر سنا ہے۔ راحیل میری رفیق کار ہے۔ ہمارا سینٹ جان ایمبولنس کا میس یہاں سے قریب پر ہے۔ میں اس وقت ٹھنڈی ہوا کی خاطر ادھر نکل آئی ہوں۔ راحیل آپ کا ذکر کرتی تھی کہ آپ بہت مشہور اور قابل آدمی ہیں۔ گویا آپ بھی سے لے بریٹی ہیں۔ ایک طرح کے ___" اس لڑکی نے ذرا ہنس کر کہا۔

"اس وقت وہ سب مشہور اور قابل لوگ کہاں گئے ہوئے ہیں۔ جن کا آپ نے ذکر کیا۔" ریاض نے میز کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بھنویں اٹھا کر دریافت کیا۔

"ہاہا ___" لڑکی پھر ہنسی ___" وہ سب غالباً پولو کے لئے گئے ہیں! آپ ان کا

انتظار کیجئے گا ۔ ؟

ریاض نے ایک اخبار اٹھایا۔ لڑکی بے دھیانی سے کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ ریاض نے دیکھا کہ وہ ایک معمولی سی، عام سی لڑکی تھی۔ جس نے ہلکے بادامی رنگ کی ساری پہن رکھی تھی اور بالوں کو ایک انبار میں جمع کر کے دو کانٹوں کے ذریعے لپیٹا ہوا تھا۔ اس لڑکی کے غیر اہم بے ضرر اور پرسکون سے وجود کے احساس سے اسے راحت سی محسوس ہوئی۔ اس نے اس کا نام دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"وہ کرنل بلگرامی ہیں جو ابھی گھوڑے پر سے اترے۔" لڑکی نے کھڑکی کے باہر نظر ڈال کر کہا۔ "ان کی بیگم اس وقت یہاں کی سب سے زیادہ ہر دلعزیز میزبان ہیں۔ آپ کو ان ہی سے ملنا ہے نا ۔ ؟"

"میں یہاں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھ سکتا ہوں ۔ ؟" ریاض نے کہا

لڑکی جھجک کر چپ ہو گئی۔

"بیگم بلگرامی ۔" ریاض نے مسکرا کر کچھ دیر بعد بات کی۔ "کیا وہ بھی بہت سے لے برشتہ ہیں ۔ ؟"

"جی ہاں ۔ ایک طرح سے ۔ ان کی ساریاں ۔ آپ کو ان کی ساریاں دیکھنی چاہئیں۔" اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر وہ لاؤنج کے پردوں میں غائب ہو گئی اس کے بعد ریاض نے اس لڑکی کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ وہ معمولی سی لڑکی جس کا اسے نام بھی معلوم نہ تھا۔

ارجمن ساحل کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ کلب کے برآمدے میں پہنچ کر اس نے

ریاض کو ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور ایک کرسی پر منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ یہ ارون اب تک اس وقت سے دس اور پندرہ سال پہلے کا، ڈیرہ دون اور رپورٹ بلیر کا ارون تھا۔ کائنات کی گونج جو چاروں اور پھیلی ہے۔ اس میں وہ بالآخر ڈوب جائے گا — وہ مقید ہے۔ وہ محسوسات کے اس تیز بھنور میں اتنے برسوں سے اکیلا ڈول رہا ہے۔ بیلا کو اپنی اور کھینچ کر وہ اس بھنور سے نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن بیلا اسے اوپر کھینچنے کی بجائے اس کے ساتھ اس گرداب میں زور سے آن گری ہے اور اس سے الگ الگ لہروں پر تیر رہی ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر دریچے کے باہر گنگا کی موجوں پر نظر ڈالی۔

"کرنل راجو لش — ؟" ریاض نے اخباروں کی میز پر سے پرسکون آواز میں سوال کیا —

"جی ہاں —" ارون نے بید کی کرسی پر سے اٹھ کر ریاض سے ہاتھ ملایا اور پھر بیٹھ کر ہرے قالین پر ٹانگیں پھیلا کے اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔

"یہ کچھ ہوا نا۔" دو خواتین دریچے کے نیچے سے آہستہ آہستہ تبادلۂ خیالات کرتی گذریں — "سوسائٹی میں کچھ تو جان پیدا ہوئی۔ اس جمود میں کچھ ہلچل مچی — زینب عباسی سے پرسوں لکھنؤ میں ملی تھی۔ ان سے پتہ چلا۔ حالانکہ —"

"سنا ہے کرنل بلگرامی نے ایریا کمانڈر سے کہا ہے کہ کرنل راجو لش کا تبادلہ یہاں سے کہیں بہت دور کا کر دیا جائے" — دوسری خاتون نے سرگوشی کا وہی اہم انداز قائم رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر کرنل راجو لش کہیں بنگلور و نگلور چلے گئے تو لکھنؤ کا پور تو بالکل سونا ہو جائے گا۔" پہلی خاتون بولیں۔ دونوں سلئے گھاس پر غائب ہو گئے۔

اردن ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھے دریاؤں کی موجوں کو دیکھتا رہا۔ میرے دماغ میں آگ بھر گئی ہے۔ پھر اس نے نہایت وثوق کے ساتھ خود سے کہا۔ میں دراصل ڈرپوک ہوں۔ کمینہ۔ بزدل۔ قصہ مختصر یہ کہ چونٹا —— کرنل بلگرامی کو چاہئے کہ مجھے ماریں ——

"آپ آج کل یہاں کیا کر رہے ہیں کرنل صاحب" ریاض نے اخبار بند کرنے کے بعد غیر معمولی اخلاق سے پوچھا۔

"جی ؟ —— کچھ نہیں —— فوج میں ملازم ہوں" اردن نے مختصراً جواب دیا۔ فواد اور ایلمر کا یہی ایک دوست ہے۔ جس سے ملنے کی تمنا مجھے آج تک نہ ہوئی۔ —— اردن نے دل میں بے تعلقی سے کہا۔ ان کی اس مشہور و معروف اکڑفوں سے میں تو متاثر ہو نہیں سکتا کم از کم —" میری بہن کہاں ہے ؟" —— اس نے لیڈیز روم کی سمت سے آتی ہوئی ایک انگریز عورت سے دفعتہً سوال کیا۔

"آپ کی بہن —؟" انگریز عورت نے ٹھٹک کر تعجب سے پوچھا۔

"ہاں —— دنیا میں صرف ایک میرانگنی ہے اور وہ میری بہن ہے۔ وہ کہاں ہے اس وقت —؟"

"یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کرنل صاحب" —— انگریز عورت نے ذرا طنزاً جواب دیا۔ وہ ایک عرصے سے ایلمر والفرڈ رکیسٹن سے شادی کرنے کی فکر میں تھی اور ایلمر اس کا نوٹس لینے کے بجائے اس کالی آنکھوں والی سانولی ہندو لڑکی کے لئے نظمیں لکھ لکھ کر وقت برباد کر رہا تھا۔

"مس راجونش ——" کسی اور نے قریب آکر مؤدبانہ لہجے میں اس سے کہا۔ "وہ تو ابھی ہری صاحب کی پارٹی کے ساتھ پولو کے میدان سے نہیں لوٹیں۔"

اچھا۔ وہ چپ ہو گیا

یہ سب کے سب اپنی اپنی بہنوں کے Fixation میں شدت سے مبتلا ہیں۔ فواد۔ علی اور یہ ارون ـــــ ریاض نے دل میں طے کیا۔

"حضور گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔" اس کے چپراسی نے اندر آ کر اسے اطلاع دی۔ وہ ارون کو خدا حافظ کہنے کے بعد (جس کا ارون نے جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا) باہر آ گیا اور کار میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں اسے ایک بار پھر ان ہی لوگوں کے درمیان لکھنؤ پہنچنا تھا۔

ایک بڑے کمرے میں ہرمی کی پارٹی کے مہمان ابھی جمع ہونے شروع نہیں ہوئے تھے۔ لیکن لیلیٰ آ گئی تھی۔ کرنل بلگرامی اپنے رجمنٹ کے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے پچھلے برآمدے کی سمت جا چکے تھے۔ وہ ٹہلتی ہوئی اس کمرے میں آئی۔ جہاں ارون بیٹھا تھا۔ اسے معلوم تھا اسے یہاں ارون نظر آئے گا۔ اسے ارون بے حد پسند تھا۔ اس کو ایک چکر سا آیا اور پھر وہ سنبھل کر اخبار کی میز کے سہارے بیٹھ گئی۔

وہ چپ رہا۔

لیلیٰ منتظر رہی کہ وہ کچھ کہے۔ لیکن اسے پتہ تھا کہ وہ اس سے خفا ہے۔ اس سہ پہر اس نے ارون کے ساتھ بے حد بد اخلاقی کا ثبوت دیا تھا۔

"تم نے وہ اسپیچ تیار کر لی ـــــ" ارون نے یک لخت سر اٹھا کر اس سے سوال کیا ـــــ

"کون سی اپیچ —؟" لیلے نے حیرت سے پوچھا

"وہی، جواب تم دینے والی ہو — یہ کہ تم کو بڑا افسوس ہے کہ تم کو آج میرے ساتھ بہت کج اخلاقی کا مظاہرہ اختیار کرنا پڑا — پھر کچھ اپنے فرائض کا ذکر کرو۔ شوہر سے وفاداری۔ بیوی کی محبت۔ گھر۔ بچے۔ معاشرے کے قوانین وغیرہ — میں یہ سوچکر بہت محظوظ ہو رہا ہوں کہ اب تم مجھ سے کیا کہنے والی ہو گی۔ اگر تم نے میری بہنوں کی طرح ان کے از ابلا تھو برن کے اوڈ ڈرامہ یڈیم میں نویل کا ورڈ کے کھیل اسٹیج کرنے میں عمر بتائی ہوتی تو تم کو یہ تقریر کرنے میں اور بھی آسانی رہتی" — اروِن نے غرا کر کہا۔

بالکل ساکت ہو کر لیلے اسے دیکھتی رہی۔ وہ کس قدر دلکش تھا —

"میں جانتا ہوں کہ تم کو یہ طمانیت ہے کہ صرف میں ہی نہیں ہوں۔ ابھی تمہاری زندگی میں اور بہت سے آئیں گے۔ اور یہ کہ زندگی بھی کیا بڑھیا قسم کا مزے دار ڈرامہ ہے — لیلے بیگم مجھے یقین ہے کہ اگر تم نے ہائی اسکول سے آگے پڑھا ہوتا اور اگر افسانہ نگاری شروع کر دیتیں تو "زندگی" کو کیپٹل ایل سے لکھتیں اور بدنصیب گل و بلبل کا ذکر کیا کرتیں —"

"اروِن — تم — کس قدر —" لیلے نے سانس روک کر کہا

"کس قدر کمینے ہو —" اروِن نے بے حد خوشی سے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ "کمینہ — یہ ایک ایسا لفظ ہے جو ہم سب کے مختلف معنوں میں بالکل پورا اترتا ہے۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ اُردو زبان میں وسعت نہیں — ہُو — چلو —" وہ ہرے قالین پر ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا — "چلو شروع کرو اپنی تقریر —"

"اروِن" — لیلے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ کتنا عجیب انسان ہے — اروِن

آخر تم کیا چاہتے ہو ــــ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ نہیں"۔ اروِن نے رنجیدہ آواز میں ٹھہر کر کہا ــ" میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ زندگی تمہیں کب تک معصوم رہنے دیتی ہے ـــــ یہ تجربہ بھی کر دیکھو۔

لیلےٰ پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

وہ ہرے قالین پر دو تین دفعہ بے مقصد ادھر ادھر ٹہلا اور پھر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"سنو لیلےٰ ـــ" ٹھہری ہوئی آواز میں اس نے آہستہ آہستہ کہا ـــ" انسان جو دوسرے انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ محض ٹائپ کی غیر شعوری یگانگت کی وجہ سے۔ ہزاروں لڑکیوں سے میں اب تک مل چکا ہوں۔ خود میرے اپنے گروپ میں ایک سے ایک دلکش لڑکیاں ہیں جن کو میں نہایت باعزت طریقے سے اپنی بالکل سگی روحانی بہنیں اور ذہنی رفیق اور قابل اعتماد دوست وغیرہ وغیرہ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اب تک کسی نے مجھے اس طرح اپنی اور نہیں بلایا۔ تم اتنی زیادہ کوئی ہیبتڑی کیمارہ بھی نہیں ہو ـــ نہ مجھے فرانسیسی ناولوں والے شوہروں کا رقیب بننے کا فخر حاصل کرنے کی تمنا ہے ـــ فذل اسٹکس ـــ میں کوئی مابعد الطبیعاتی فلسفہ نہیں بیان کر رہا۔ اس طرح متحیر نگاہوں سے مجھے کیوں دیکھتی ہو بھئی ـــــ میں تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ـــ کہ تم کو وقت کے ساتھ خود ہی معلوم ہو گا کہ گھر، اور حفاظت، اور جذباتی سکون کی اس تخیلی فردوس سے، جس میں تم خوش رہنے پہ خود کو مجبور کرتی ہو اور کرتی رہو گی اس سے دراصل کوئی بھی خوش نہیں، کوئی بھی خوش نہیں۔ میں نے تم سے یہ کب کہا ہے لیلےٰ بیگم کہ تم میرے ساتھ بھاگ چلو ـــــ اس قسم کی رومینٹک خرافات کی میری

تو عمر ہے نہیں کم از کم ـــــ لیکن للہ تم اپنی یہ ہائی اسکول کے نصاب والی اخلاقیات کا درس تو ترک کرو ــــ کبھی سوچو۔ زندہ رہنے کی سطح صرف یہی نہیں ـــــ انتھاہ جذبات ہیں، خطرناک۔ پرسکون۔ راحت بخش۔ تکلیف دہ ـــــ روح کی پکار ہے جو زندگی میں صرف ایک بار کسی دوسری مخصوص ہستی کو اپنی طرف بلانا چاہتی ہے۔ رات کے وہ لمحات ہیں جب معلوم ہوتا ہے جیسے چاروں اور محض گہرا، بے کنار سمندر ہے اور اس میں تم بالکل ایک چٹان پہ موجود ہو۔ اور کوئی اس چٹان کے قریب سے گذر کر تمہاری آواز نہیں سننا چاہتا ـــــ لمحات جب معلوم ہوتا ہے کہ سارے میں تیز دھارے بہتے جا رہے ہیں اور دماغ ان بھنوروں کے ساتھ گھوم رہا ہے ـــــ گھوم رہا ہے ـــــ

" کیا مجھے پتہ نہیں ـــــ" اس نے رک کر جیسے اپنے آپ سے آہستہ سے کہا ـــــ" کہ فواد بھی اسی طرح ایک جزیرے پہ بیٹھا ہے۔ نیرا اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے اور وہ اس اندھیرے اور وسعت میں بچوں کی طرح خوفزدہ ہو کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا ہے ـــــ

" لیکن جتنا بزدل فواد ہے۔ اس سے زیادہ ڈرپوک میں خود ہوں ـــــ تمہیں تم لیلےٰ بیگم ــــ؟ نیرا، میری بہن کس قدر بہادر ہے۔ کتنی نڈر ـــــ لیلےٰ، کاش تم نیرا کی جگہ ہوتیں، یا نیرا تمہاری جگہ ہوتی ـــــ" وہ ٹھہر گیا ـــــ" لیکن یہ ایک اور ـــــ Fixation ہے جس کا سمجھنا تمہارے بس کی بات نہیں ـــــ" اس نے پیشانی پہ ہاتھ رکھا ـــــ" کاش تم میں ذہن ہوتا۔ کاش تم سوچ سکتیں لیلےٰ بیگم! ـــــ" وہ دریچے میں سے ہٹ آیا۔

وہ اسے محویت سے دیکھتی رہی۔

"میں بزدل ہوں ۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بے حد بزدل ہوں ۔۔۔ میں کیا کر رہا ہوں میں کیا کروں گا۔" اس نے دفعتہً گرج کر کہا۔ "میں اس جلا وطنی میں کہاں سے کہاں چلا جاؤں گا۔ کس طرف نکل جاؤں گا ۔۔۔ میرا کیا بنے گا لیلے بلگرامی ۔۔۔؟" اس نے بچوں کی طرح جھک کر لیلےٰ سے سوال کیا۔

"یہ بڑے بڑے مشہور لوگ بعض مرتبہ کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ابھی لاؤنج کے دریچے میں کھڑے کرنل راجو بخش مسز بلگرامی کو چلا چلا کر بتا رہے تھے کہ وہ بے حد بزدل ہیں ۔۔۔ حالانکہ اٹلی کے محاذ پر انہیں جارج کراس ملا تھا ۔۔۔" برآمدے میں سے گذرتے ہوئے کسی نے اپنے ساتھی سے سرگوشی میں کہا۔

۲۹

ہلمر اس خط کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ جو اس کے والد نے انگلستان سے بھیجا تھا۔ "میرے پیارے بیٹے۔ اپنے اور میرے ان دوستوں کو ان کے اس صدمے میں میری طرف سے دلی رنج کا اظہار کر دینا۔ میں دکھی ہوں۔ تمہیں خود خط لکھ رہا ہوں۔ میرے گاؤٹ کی تکلیف اب پہلے سے بہتر ہے۔"

موت ـــ دوست کا واقعہ۔ اس نے انگلیاں بھینچ کر میز کی سطح پر رکھ دیں۔ انگلیاں ساکت ہو جاتی ہیں۔

اس نے باہر نظر ڈالی۔ غروب آفتاب۔ بوڑھے ریٹائرڈ انگریز اپنے باغیچوں میں کھاٹوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی بیویاں جیسی کرسیوں پر بیٹھی تھک گئی ہیں۔ سفر کرن ٹوڈی والی کیفیت میں ہیں۔ سب مستقل ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ باتصویر ڈیلی ٹیلیگراف کے مرتفع ... تمام کمبل اوڑھے ہوئے پڑے رسالہ یا اخبار نامہ پڑھتے پڑھتے آسمان کو دیکھتے

ہیں۔ نرسیں اور راہبات ان کے چاروں طرف خاموشی سے ادھر ادھر پھر رہی ہیں۔ ہر چیز عجیب ہے۔

— دروازے پر دستک ہوئی۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔ باہر میرا کھڑی ہے اس نے برساتی اوڑھ رکھی ہے اور اس کی چھوٹی سی ناک پر سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ میرا — میں کہتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا — میرا —

"واقعہ یہ ہے" — میرا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "کہ بے وقت کی بارش نے مجھے راہ میں آن لیا ہے۔ ورنہ مجھے غالباً تمہارے ہاں آنا نہ چاہئے تھا۔ لیکن اس کے باوجود، اپنے والدین کے دیرینہ تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے، میں تم سے متوقع ہوں کہ تم فی الفور مجھے کوکو پلاؤ گے — آج صبح ہم لوگ، راحیل، میں اور اردن، ویک اینڈ منا کر کانپور سے واپس آئے ہیں۔"

"ایں —" بے مینٹی پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"میرا — میرا خیال تھا کہ تم مستقل مجھے اسنب کر رہی ہو۔" میں کہتا ہوں۔

"کیوں؟ میرے چچا کی چھوٹی سی دوست انگریز ہیں۔ مک ڈونلڈز، انگرل سنز، نیوکومز —" اس نے انگلیوں پر انگریز جوڑوں کے نام گننے شروع کئے۔ پھر اس نے تمہارے کتابوں کے شیلف کو دیکھا۔ سینٹ آگسٹین کے اعترافات —

"وہ تمہاری نظموں کا مجموعہ کہاں ہے جو تم میرے نام معنون کر رہے تھے — سنا ہے اوڈن نے بالکل تم کو انسپائر نہیں کیا۔ تم کتنا ہی اس کے لئے سرپرستی کا رویہ قائم رکھو۔" اس نے کہا۔

"تم کو یہ سب خبریں کون دیتا ہے —" میں بگڑ کر پوچھتا ہوں۔

"دراصل، میں ذرا کافی لٹریری قسم کی آدمی ہوں ـــــ" میرا نے انکسار سے کہا اور اسی طرح اطمینان سے سیٹی پر بیٹھی ٹانگیں ہلاتی رہی۔

"میرا ـــــ کیا تم ـــــ میں ـــــ" پھول گلدان کے پانی میں گر رہے ہیں ـــــ پیانو کی سطح پر ایک سبز مکھی آن بیٹھی ہے۔

لمحے نے اپنے توازن کو قائم کر لیا ہے۔

"میاں کاٹو ـــــ ایسی ویران پنے کی کتابیں پڑھا کرتے ہو۔ بولا گئے ہو ـــــ؟" اس نے اسی طرح پاؤں ہلانا جاری رکھا۔

"اگر تم سب ہمیشہ مجھ سے اس قدر با محاورہ، فصیح و بلیغ اردو نہ بولا کرو تو کیا مضائقہ ہے ـــــ" میں اداسی سے کہتا ہوں ـــــ

وہ زور سے ہنسی۔

غالباً تم فواد سے شادی کر لوگی ـــــ میں منہ لٹکا کر سوچتا ہوں اور آنکھیں بند کر کے تصور کرتا ہوں کہ میرا کے انتہائی فرشتہ صفت حلیم الطبع والد اپنی چھڑی لے کر فواد کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں یا میرا کو ڈانٹنے کے بعد میز پر اس قدر زور کا مکہ مار رہے ہیں کہ ساری پیالیاں ٹوٹ گئی ہیں یا فواد کو قتل کرنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں (اس وقت وہ فواد کے والد کے ساتھ جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تبادلہ خیالات میں مصروف ہوں گے)

"میں پچھلے سولہ سترہ سال سے تم لوگوں کے اس گروپ کو جانتا ہوں۔ لیکن میں افسوس سے سر ہلا کر کہنا شروع کرتا ہوں۔

"لیکن ہم لوگ تمہارے پتے نہیں پڑے۔" میرا نے خوشی سے بات کاٹی۔

(میں لمبے لمبے قدم رکھتا پیانو کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں۔ گویا پیانو ایک ایسی چیز ہے جس کو میں نے اب تک نوٹس ہی نہیں کیا تھا)

"اب تم واگز بجاؤ۔" میرا نے تجویز کیا۔

مجھے اس لڑکی کی شکل سے نفرت ہے۔

"اچھا ایلمر۔ اب خدا حافظ — میں یہاں سے سیدھی گنیش گنج جا رہی ہوں۔ جہاں میری ننہال ہے اور جہاں مجھے کسی قسم کی پوجا کی تقریب میں شرکت کرنی ہے۔ دراصل میں ایک نہایت مذہبی اور خدا پرست آدمی ہوں —" اس نے چہرے پر انتہائی منکسر المزاجی اور تقدیس طاری کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے برساتی اٹھائی اور باہر چلی گئی —

"خدا کا شکر کہ بارش تھم گئی" — اس نے باہر سے آواز دی۔ "خدا حافظ"

خدا حافظ — میرا کی آواز سنائی دی۔ جبکہ وہ اپنی اوپل میں ایلمر کی کوٹھی سے نکل رہی تھی — سکندر باغ کی سڑکیں بھیگی ہوئی ہیں اور میں حسب معمول تنہا ہوں — مجھے ان بارشوں سے نفرت ہے۔ اس ہوا سے بھی۔ یہ ایلمر رکمینٹن کی کوٹھی ہے۔ میرا راج ونش کی کار جو اس پھاٹک میں سے نکلی تھی۔ اس دھند لکے میں اوجھل ہو گئی ہے۔ مجھے دنیا سے نفرت ہے۔ یہ سب بیحد مختلف چیزیں ہیں — (مجھے امید ہے کہ میں اپنا مطلب سمجھ گیا ہوں گا) ریاض بھی مدتوں سے نہیں آیا۔ نادرہ مستقل امریکہ میں رہتی ہے۔ میں، کرنل فواد نسیم احمد، اپنا ذاتی معاملہ خود ہوں — میں کانپور جا تا ہوں — وہاں بیلے ہے۔ بلگرامیز کے وہاں میں دن بھر اسکواش کھیلا کروں گا (لیکن فی الحال میں کنگ کے کنوئیں جاتا ہوں۔ جہاں علی بنے علی دہاں محرم منا رہا ہے۔ وہاں میں کسی تاریک دالان میں بیٹھ کر میرانیس کا مطالعہ کروں گا

جبکہ میرے اور میرا کے چاروں طرف گھونٹ طوفان زدہ سمندر ہیں۔

سکندر باغ کی اس خاموش سڑک پر سے دو موٹریں آگے پیچھے شہر کی طرف نکل گئی ہیں۔ اب یہ دریا آتا ہے۔ ہر طرف جھاڑیاں اگی ہیں۔ اور یہ فیض آباد روڈ ہے۔ یہ سڑک مجھے بیحد مانوس معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ میں آج تک اس طرف نہیں آیا۔ یہ جگہ پرسکون اور آرام دہ نظر آتی ہے — راحیل بھی ان ہی جگہوں کی ہے۔ اس سڑک پر دور دور یہ اتنی اور اس املتاس لگے ہیں۔ نمبر اکیس۔ نمبر بائیس۔ نمبر تیئیس۔

نمبر بائیس فیض آباد روڈ۔

یہ تو کوئی خواد میاں کے ساتھی جان پڑتے ہیں — نمبر اکیس کے باغ کی دیوار پر سے ایک مالی نے نمبر بائیس کے مالی سے کہا "ایلس ان ونڈر لینڈ" کے مالیوں کی طرح وہ پھر گلاب کے پودوں پر جھک گئے —

"مس راجیونش ہیں؟" ریاض نے کار سے اتر کے نمبر بائیس کے مالی سے سوال کیا۔

"جی نہیں سرکار۔ شہر گئی ہیں۔" مالی نے کہا

"کیا ہوا — کون ہے —؟" انکل راجیونش نے سر اٹھا کر قریب کے ایک مالی سے دریافت کیا۔ وہ دور ایک فالسے کے نیچے آرام کرسی پر ڈریسنگ گاؤن میں ملفوف مطالعے میں منہمک تھے۔

"کچھ نہیں سرکار۔ بٹیا کو پوچھت ہیں کوئی جنے۔" دوسرے مالی نے اطلاع دی۔

"چار ہزار جانے کتنے سو سال سے —" (ہندر چاچا نے عینک نیچی کر کے دوبارہ

پڑھنا شروع کر دیا۔ حیاتِ انسانی ان کے لئے بہت بے معنی سی بات رہ گئی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ برابر کے نمبر الیکس کے باغ پر ایک نظر ڈال لیتے اور خاموشی سے پھر پڑھنا شروع کر دیتے گویا ایک خیال ہے جس کا دفعتہً اظہار ہو جاتا ہے۔

"یہ گھر کس کا ہے۔" پھاٹک پر ریاض نے نمبر الیکس کے مالی سے دریافت کیا۔

"سرکار علی میاں کا۔" گلاب کے پودوں پر سے سر اٹھا کر اس نے جواب دیا۔ "مگر سب لوگ یہاں سے بھی شہر گئے ہوئے ہیں۔ بٹیا لوگ بھی۔ چُپ تعزیہ کر کے واپس آ جائیں گی۔"

"شہر کہاں ہے۔۔۔" ریاض نے پوچھا۔ چُپ تعزیہ کیا شے ہوتی ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

"حجور گوپال پور کی حویلی مو حجم مجلس۔۔۔ کنکر کا کنوار۔" مالی نے مستعدی سے پتہ بتلایا۔۔۔

"گوپال پور۔" ریاض نے ذہن میں دہرایا۔

"حجور چاہیں تو ہیں آپ کو وہاں تک پہنچا دوں۔" مالی نے کہا۔

"راحیل بیگم بھی وہیں ہوں گی۔۔۔؟" ریاض نے پوچھا

"سرکار، راحیل بٹیا تو "ہاؤس" میں رہتی ہیں۔ پتہ نہیں۔ آج کل شاید ہماری بٹیا لوگ کی دوسرالھا کی خاطر وہاں چلی گئی ہوں۔ راحیل بٹیا سے ہماری بٹین کی کوئی عزیز داری تھوڑا ہی ہے حجور۔ کنکر کے کنوئیں پر صرف ہمارے سرکار کا کنبہ رہتا ہے۔ کچھ گوپال پور میں کچھ وہاں۔ مالی نے تفصیلات بتلائیں۔

چلو۔۔۔ ریاض نے کہا۔۔۔ شاید فراد اور راحیل وہاں مل جائیں۔ اس نے سوچا۔

موٹر دریا کا "آئرن برج" پار کر کے نخاس کے راستے پر آئی۔ میڈیکل کالج اور حسین آباد کی برجیاں غروبِ آفتاب کی روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ چوڑی سڑکیں اور تاریک گلیاں تھیں۔ فٹ پاتھ پر پھول والے موتیا کے ہار فروخت کر رہے تھے۔ نیم روشن دکانوں کے آگے انسان حقے لیے بیٹھے تھے۔ زردوزی کی دوکانیں۔ خوش مزاج نستعلیق تنبولنیں۔ بارش کی مہک۔ ایک چوراہے پر اس نے موٹر روکی ––– شریفے لیجیے گا قبلہ ––– ایک کم عمر لڑکا بیلوں کا جھوا لیے قریب آیا ––– کیا عمدہ شریفے لایا ہوں۔ ذرا ایک نظر دیکھ لیجیے۔ حضور کی محبت میں گھلے جاتے ہیں ––

"سرکار یہی گنگا کا کنواں ہے"۔ مالی نے کہا۔

سڑک کی بائیں جانب سے ایک چوڑی اور صاف ستھری گلی شروع ہوتی تھی جس کا ناہموار اینٹوں کا فرش تھا۔ اس کے دونوں طرف پرانے مکانات کی ڈیوڑھیوں کی سیڑھیاں تھیں۔ کنارے کنارے کہاریں اور مہریاں کھاٹ بچھائے آپس میں تبادلۂ خیالات میں مصروف تھیں۔ بچے لنگوٹے اڑا رہے تھے۔ ایک لڑکا لاؤنی گاتا ہوا گزرا۔ گلی کے سرے پر ایک بڑا پھاٹک تھا۔

پھاٹک کی ڈیوڑھی میں ایک چوہلہ کھڑا تھا۔ بچوں کی طرح اس نے چوہلے کے سرخ جھمکے کو چھوا۔ اندر صحن میں ابھی ابھی چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ نہر کی منڈیر پر دو تین کہار اکڑوں بیٹھے بیڑیاں سلگا رہے تھے۔ پھاٹک کے اوپر کی منزل کی ایک کھڑکی میں سے دو مہریوں نے سر نکال کر اسے دیکھا ––– اے ہرمزی خانم ––– بیٹھک میں اطلاع کروا دیجیے کوئی جنٹے ملنے آئے ہیں ––" ایک مہری کی آواز سنائی دی۔ نہر کے سرے پر مونڈھے نکال کر رکھے جا رہے تھے۔

"اندر تشریف لے آئیے سرکار۔" میر جھمن نے سامنے آ کر کہا۔

پچھواڑے کے آگے برآمدہ تھا۔ جس کے دوہرے منقش دروازوں میں رنگ برنگے شیشے جڑے تھے۔ پھر ایک لمبا کمرہ تھا۔ اس میں بہت پرانے فیشن کا ایسا فرنیچر رکھا تھا جو ریاض نے محض نیلام کی دوکانوں میں ٹھنسا دیکھا تھا۔ بارہ سنگھے کے سینگوں کے پایوں والی میزیں اور کرسیاں تھیں۔ دوہرے آمنے سامنے ایک دوسرے کی طرف خم کئے ہوئے کوچ تھے۔ جن کی پشت پر یونانی عورتیں بانسریاں بجا رہی تھیں اور انگور کی بیلیں تھیں۔ گھومنے والی میزیں اور الماریاں تھیں جن پر پچھلے پچاس برس کی قانونی کتابوں کی جلدیں والٹر اسکاٹ اور ڈکنز اور ڈیوماز کے ناول اِدھر اُدھر پنچ کے فائل بے ترتیبی سے ٹھنسے ہوئے تھے۔ دیواروں پر اَن گنت تصویریں تھیں۔ ان سب چیزوں پر اس نے نظر ڈالی۔

فواد اسے دالان کے ایک تاریک کونے میں مصحفی اور ناسخ کے دیوانوں میں محو ملا۔

"دن اور تین راتیں وہ ان بارہ سنگھے کے سینگوں والی میز کرسیوں کی معیت میں وہاں رہا۔

"سال بھر خرافات میں گذارنے کے بعد محرم کے زمانے میں یہاں آ کر ہم لوگ ذرا سیلف ڈسپلن کی مشق کرتے ہیں۔ لڑکیاں قناتوں کے پیچھے چلی جاتی ہیں اور میں مجلسیں پڑھتا ہوں۔ دراصل ہم لوگ ذرا بے حد مذہبی اور خدا پرست آدمی ہیں۔" کمّی نے منہ لٹکا کر انتہائی کسرِ نفسی سے اس کو بتلایا۔

زندگی کا نظام ٹھیک رکھنے کے لئے اسکواش اور میر انیس سے بہتر کوئی چیز نہیں فواد نے بیحد سنجیدہ انداز میں اسے مطلع کیا۔

"جہنم میں جاؤ تم —" ریاض نے ہنس کر کہا
"مجلسیں تو آپ کے پلّے نہ پڑتی ہوں گی" — اسٹیلا نے کہا۔
ان لوگوں کو اپنے منفرد اور مخصوص ہونے کا کس قدر مضحکہ خیز حد تک شدید احساس ہے
— اس نے ذرا نفرت کے ساتھ سوچا۔ "آپ کا یہ مکان مجھے بہت پسند آیا۔ میری ہمیشہ سے تمنا تھی کہ آپ کے شہر کی اصلی تہذیب اور طرزِ معاشرت کو قریب سے دیکھوں —"
اس نے اخلاقاً اسٹیلا سے کہا
"جی ہاں۔ خالص — اولڈ ورلڈ ایٹ موسیفر —" فراد نے اپنی آواز میں حسبِ معمول اپنی رائے کا اظہار کیا۔
"یہ مکان — بشکریہ۔ یہ مکان بھی کئی سال سے رہن رکھا ہوا ہے۔ یہ کھٹن کھٹن جی ہیں نا؟ حسین آباد کے گھنٹہ گھر کے قریب جن کی اسٹیٹ ہے۔ ان کے پاس —" اسٹیلا نے بشاشت سے اس کو مطلع کیا۔
چنانچہ اس بات میں بھی ان کو تفوق حاصل ہے کہ ان کا یہ آبائی مکان روایات کے مطابق رہن رکھا ہوا ہے۔
راحیل گل عباس کی کیاریوں کے کنارے کنارے چلتی ہوئی آئی اور بے دھیانی سے نہر کی دوسری جانب دیکھنے لگی۔ وہ حسبِ معمول بہت پرسکون، بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔ "کل مجھے "ہاؤس" واپس جانا ہے۔ اس نے اسٹیلا سے کہا۔
"پرسوں تک اور رک جاؤ۔ رضا بھائی کی دعوت کے بعد چلی جانا۔ ہم لوگ بھی جائیں گے۔ کافی محرّم منا لیا۔" اسٹیلا نے جواب دیا۔ وہ باتیں کرتی زنانے مکان کی طرف چلی گئیں
اس وقت تمھاری دنیا گویا مکمل ہے۔" ریاض نے راحیل کو سفید کھڑے پائنچوں

کا پاجامہ اور پیازی رنگ کا ململ کا چنا ہوا دوپٹہ اوڑھے نرم روی سے روش پر چلتے دیکھ کر دل میں کہا۔

"سب بجتے لوٹ آئیں بیٹی۔ لوگ اندر گئیں " ہر مزی خانم نے آواز لگائی۔ ملازمین اپنے اپنے کاموں پر واپس آگئے۔ کچھ دیر پہلے، جب لڑکیاں نہر کے کنارے ٹہلنے کے لیے مردانے مکان میں آئی تھیں تو بے حد اہتمام سے پردہ کر دیا گیا تھا۔

کس قدر مضحکہ خیز۔ اس نے دل میں دہرایا۔

وہ دالان میں واپس آیا۔

"ہنس کا تازہ پرچہ" علی نے اخلاقاً چند رسالے اس کی جانب بڑھا دیئے۔ وہ اس وقت میر جمن کے ساتھ خاندانی امور پر گفتگو کرنے میں محو تھا۔ "اس میں میرا کی نئی نظم بھی ہے" اس نے ریاض سے کہا۔

"اچھا۔ واقعی۔" ریاض نے بیدلی سے پرچے کے اوراق اُلٹے پلٹے "آپ کو ہندی نہیں آتی۔۔۔؟ اچھا میں سناتا ہوں۔" علی نے مستعدی سے پڑھنا شروع کیا۔

میں نے اک چاند دیکھا ۔۔۔ کالندی کے اجلی تٹ پر
متھرا نگری کے پنگھٹ پر ۔۔۔ آتما نرتیہ کی ہر گت پر
میں نے ایک سماں دیکھا ۔۔۔ میں نے ایک چاند دیکھا

اس نے ٹھہر کے ریاض پر نظر ڈالی۔ آپ سن رہے ہیں؟ اس نے تشویش سے پوچھا۔ گویا میرا کی نظم کی کامیابی اس کی اپنی ذمہ داری تھی۔

پھاگن کے بھیگے بادل دیکھے ۔۔۔ لجاتی پریم لتائیں دیکھیں
جب پریم اگنی اس گھٹ میں لاگی ۔۔۔ تب میں نے وہ ماہ دیکھا

میں نے ایک چاند دیکھا

ہیرا کہتی تھی کہ اس نے یہ نظم راحیل کے لئے لکھی ہے۔ یہ بات میرے پلے نہیں پڑی

علی نے رسالہ میز پر رکھ دیا۔

لکھا تھا : کماری ہیرا لکشمی راجونش ۔۔۔ رسالے کے ورقوں کو پلٹتے ہوئے اُسنے تصور کیا۔ میں ہیرا لکشمی ہوں ۔۔۔ اب کی بار جب آپ لکھنؤ تشریف لائے تو غریب خانے پر ضرور آئیے گا ۔۔ اخلاق۔ تہذیب۔ آداب گفتگو۔ کلچر۔ یہ سب لوگ مل کر اگر ان کا بس چلے تو اپنی کلچر کے مارے باقی کی ساری دُنیا کا دم گھونٹ دیں۔ کلچر کی یہ دیو داسی اپنے کسی اور کلچرڈ کافشنہ عزیز کے یہاں اسی طرح کے ایک، اور محلّے میں اسی قسم کے ایک اور ان گنت ڈیوڑھیوں اور دالانوں اور کھڑکیوں والے دومنزلہ مکان میں گئی ہوتی ہے۔ جو اسی طرح وسط شہر کے کسی حصے میں موجود ہوگا۔ اسی طرح اس میں بھی مہریاں اور مامائیں لپکتی پھرتی ہوں گی۔ یہی فرنیچر ہوگا۔ یہی کتابیں۔ یہی رکھ رکھاؤ۔ زبان۔ محاورے۔ فرق محض اتنا ہوگا کہ اس منقش درودیوار والے امام باڑے کی بجائے دالان کے ایک سرے پر رادھیکا مہارانی اور بجرنگ بلی مہاراج کی مورتیاں استھاپت ہوں گی۔ دیواروں پر سیندور سے نقش و نگار بنے ہوں گے۔ تلسی کے پودے ہوں گے۔ ان لوگوں نے آپس میں غیر شعوری طور پر معاہدہ اور سمجھوتہ کر کے صدیوں سے اپنے گرد یہ حصار بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ صحت ٹھیک رکھنے کے لئے، تفننِ طبع کے طور پر کبھی کبھار پیپل کی شاخ کے سلسلے میں آپس میں فوجداری بھی کر لیتے تھے۔ اپنے آبائی مکانات ایک دوسرے کے پاس رہن رکھواتے تھے اور اس روپے سے باراتیں چڑھتی تھیں اور بیٹیاں وداع ہوتی تھیں۔ اردو میں نفیس ترین شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی مخالفت میں شدھ ہندی کی ترویج کے لئے

کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں اور اس وقت، عین اس لمحے، میرانلجی کے آبائی مکان میں، امام کی یاد میں حسیناں گاتی جا رہی ہوں گی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایلمرد الفرڈ رکیبٹن۔ اس نے دل میں کہا —— ذرا تم میری جگہ بیٹھ کر یہ سب دیکھو۔ تم جو کیمبرج میں مجھ سے لمبی چوڑی بحثیں کیا کرتے تھے۔ لیکن تم خود ان کی اس دنیا کے ایک لازمی جزو ہو۔ تم محرّم اور ہولی پر ان کے سرپھٹول کا انتظام کرتے ہو اور جاڑوں میں ان کے ساتھ شکار پر جاتے ہو اور بہار میں لا مارٹنیز کے تالاب کے کنارے بیٹھ کر میرابل کے لئے نظمیں لکھتے ہو —— کیا تم سب کے سب مل کر مجھے اپنے محاصرے میں لینا چاہتے ہو ——؟ اس نے غصّے سے سر جھٹکا اور آنکھیں کھولیں۔

میر چھمّن مردانہ انداز میں آہستہ سے کھنکارتے ہوئے کرسیوں کے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں کنجیوں کا گچھا تھا اور وہ کرکری خانے کی طرف جاتے جاتے، اپنے اجنبی مہمان کو آرام کرسی پر نیم دراز دیکھ کر ٹھٹک گئے —— اور نہایت مشکبو تمباکو کی گڑگڑی مہمان کے نزدیک لا کر رکھ دی۔

"سرکار کو کسی بات کی تکلیف تو نہیں؟" انھوں نے غیر شخصی انداز میں بات کی۔

"ارے نہیں بھئی۔" ریاض نے جواب دیا۔ "آپ بہت مصروف نظر آ رہے ہیں؟"

"جی ہاں سرکار۔" میر چھمّن نے انکساری سے کہا۔ "یہاں تو یہی کچھ نہ کچھ سلسلہ رہتا ہے۔ جہلم کا ہنگامہ تھا۔ اب نوچی تاریخ نکل گئی۔ اس لئے کل دلارے میاں نے دعوت کی ہے۔ اب دعوتوں کا سلسلہ رہے گا —— گوپال پور کی طرف سے حضور لڑائی کے فنڈ میں ہر مہینے دو سو روپے دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علاقے سے بے شمار رنگروٹ فوج میں بھیجے گئے ہیں۔ کورٹ میں جانے سے پہلے اصل شان تھی۔ اب وہ زمانے کہاں ہے" میر چھمّن نے

(ایک ٹھنڈا سانس بھرا) تو حضور، کمشنر صاحب کل یہاں آکر شکریہ ادا کریں گے۔ ملنا تو ان کو ڈکر علی میاں سے چاہیئے۔ لیکن علی میاں سے حکومت اب تک ناراض ہے۔ اس لئے رضا میاں نے کمشنر صاحب کو مدعو کیا ہے۔ بہت لمبا چوڑا کارخانہ ہے سرکار۔

روز روز نہ کوئی نہ کوئی تقریب رہتی ہے۔

آپ نے علی میاں کے سارے خاندان کو ابھی دیکھا ہی نہیں سرکار۔ خود ہمارے علی میاں کے حضور پانچ الگ الگ مکان ہیں۔ سب اسی طرح سامان سے بھرے ہوئے ہیں اور ہر چیز اور جگہ سے کوئی نہ کوئی روایات وابستہ ہیں۔ منصوری، دہرہ، گوپال پور کی پرانی سرائے گنگا کے کنوئیں کی یہ معظم منزل، اور سول لائینز میں اپنے اکیس نمبر۔ بہت پھیلا ہوا جنگی سلسلہ ہے حضور والا۔۔۔" بیرچھتن نے ایک ذرا کی ذرا دم لینے کو رکے۔ ان کی دھندلی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی افسردگی جھلملا رہی تھی۔ "اور بڑی جنگی خرچ ہے سرکار۔ اگر آمدنی ڈیڑھ ہزار تو خرچ ڈھائی ہزار۔" "جی ہاں۔" انھوں نے فخر سے کہا۔ "اپنے ان ہی ہاتھوں سے بیگم ایک دن میں ہزاروں روپے اٹھاتے ہیں۔ میں نے ابا کار دیکھی یہاں کا حضور والا! انھوں نے انکساری سے اظہار کیا۔۔۔" بس اب آن کر علی میاں نے اپنی تو ہمری سے رنگ میں بھنگ ملا دیا۔ حضور آج تک کسی کی مجال پڑی تھی جو اس گھرانے کے سامنے اکڑ کر بات تو کرے۔ کوتوال شہر تھر تھر کانپتا تھا اور کلکٹر صاحب آگے پیچھے پھرتے تھے اور اب کمشنر علی میاں رومال کی چیل کاٹ کر بیٹھے ہیں۔" ان کی آواز تقریباً بھرا گئی اور مشہدی رومال سے جو ان کے کاندھے پر پڑا تھا انھوں نے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

نہر کے کنارے چراغ روشن کئے جا رہے تھے۔ ایک کہار ان کو شے بجاتی تقریب سے نکل گئی۔ بیرچھتن کنجیوں کا گچھا ہلاتے، آہستہ آہستہ کوگری خانے کی طرف جانے لگے۔ بیر

کے کنارے اسٹیلا کا کتا زور سے بھونکا۔ بس ہمر کا۔ شمر کے ساتھ ہی حشر ہوا ان کانگریسیوں کا۔ پھر جگمگن نے جاتے جاتے کہا۔

آرام کرسی پر سے اٹھ کر وہ برابر کے کمرے میں آ گیا۔ جہاں بارہ سنگھے کے سینگوں کا فرنیچر تھا۔ ملکہ معظمہ۔ اس نے دوبارہ غور سے دیکھا۔ برطانیہ کی وکٹوریہ کی تصویر جو آتشدان کے اوپر لگی ہوئی تھی۔ پرانی رنگین تصویر جس پر ملکہ معظمہ کے اپنے دستخط تھے۔ جب بڑے ابا ڈاکٹری پڑھنے کے لئے ولایت گئے تھے تو ملکہ نے اپنے ہاتھ سے دستخط کر کے یہ تصویر ان کو دی تھی۔ کسی نے اس کو بتایا تھا۔

اکیلے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتے ٹہلتے وہ دوسری تصویروں کو دیکھتا رہا۔

تم یقیناً بہت محظوظ ہوئے اور تمہارا جی اکتا گیا ہے۔ ہمارا شجرہ ادھ جل گیا ہے۔ حالانکہ تحریروں سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ میرے اس مشہور و معروف خاندان کے مشہور و معروف بزرگ اصفہان اور مشہد کے رہنے والے تھے اور عراق سے آئے تھے۔ دستار فضیلت بندھوا کے شاہان صفوی اور قاچار کے دربار میں فتاویٰ پر دستخط کرتے تھے۔ پھر انہیں شاہجہاں نے بلوایا اور رام گنگا کے کنارے انہیں جاگیریں عطا کیں (دیکھو تاریخ ہند عہد شاہجہانی صفحہ ۱۴۸) اور اب جبکہ وہ یہاں رہے۔ انھوں نے اپنی برتر نسل کی برتری کو قائم رکھا اور عراق جا کر اسی طرح اجتہاد کی پگڑیاں بندھواتے رہے۔ پھر مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا اور نواب شجاع الدولہ کا زمانہ آیا اور وہ حسب معمول اودھ اور دہلی لکھنؤ کے جنگلوں میں گھوڑے دوڑاتے رہتے۔ ان میں سے چند نے درجہ ولایت حاصل کیا اور پیر و مرشد کہلائے۔ چند نے شمشیر زنی اور نیزہ بازی اور شہسواری میں نام پیدا کیا۔ شعر صاحب دیوان

ہوئے۔ پھر انیسویں صدی آئی اور انگریز آیا۔ ان میں سے چند تو جنرل بابرٹ کی توپوں کے سامنے آکر امر ہو گئے۔ چند کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔ باقیماندہ سارے کے سارے کالرن اور ایم۔ اے۔ او کالج بھیج دیئے گئے، جہاں انھوں نے میکالے۔ ٹینی سن اور والٹر پیٹر کا انتہائی عقیدت اور ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کیا۔ ان میں سے ایک کو ولایت میں ملکہ وکٹوریہ نے اپنی تصویرِ بخشِ نفیس عنایت کی اور ابا میاں یورپ گئے اور قسطنطنیہ میں انھوں نے نوجوان ترکوں کی رفاقت کی۔

تمہارا تمسخر۔ تمہاری حقارت۔ تمہارا ترحم۔

ہم اس تمسخر کے عادی ہو چکے ہیں۔ علی نے ہم سے نفرت کی۔ ایلمر رکیسٹن ہمارے وجود سے برافروختہ ہوا۔ اور اب تم کچھ پریشان نظر آتے ہو۔ تمہاری جھنجھلاہٹ کی وجہ کیا ہے؟

(وہ تصویروں کے سامنے ٹہلتا رہا)

اور یہ میرے پرنانا ابا کے وہ بھائی ہیں جو تلوار ہاتھ میں اٹھا کر قسمت آزمائی کرنے پنجاب چلے گئے تھے)

(کیوں ہے۔۔ لڑائی ہو گئی تھی؟ اس نے نسبتاً دلچسپی سے پوچھا)

ہاں۔۔ کسی بات پر وہ اپنے بھائیوں سے روٹھ گئے تھے اور انتہائی رومینٹک اور ڈرامائی انداز سے انھوں نے تلوار کے منقش قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ملکِ خدا تنگ نیست پنجاب ان دنوں ایل ڈریڈو تھا۔ کس قدر رومینٹک رہی تھیں۔ پنجاب میں سرکارِ انگلشیہ نے ان کو بھی ڈپٹی کمشنر بنا دیا تھا۔ گورداسپور میں اب تک ان کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔

(بیحد دلچسپ۔ اس نے ذرا مشفقانہ انداز میں کہا)

کیا مطلب آپ کا؟ ---- مجھے کوئی داستان گو مقرر کیا ہے؟ ---- میں نے یکلخت بگڑ کر کہا۔

(مہتابی پر اجلی چاندنی کا فرش تھا۔ دالان میں جھاڑ اور ہانڈیاں روشن کی گئی تھیں معزز مہمان پیچوان گڑگڑاتے ہوئے آرزو اور مصحفی کا تذکرہ کرتے رہے۔ ایک صاحب نے نو بنگال کے تھیٹر کا ذکر کیا۔ پھر سبزی منڈی کی ماہ منیر نے پون گھنٹہ تک اڑانہ کا ترانہ الاپا۔ رات گئے، دعوت کے اختتام پر جب ریاض مہمان خانے کی طرف سونے کی غرض سے جا رہے تھے تو ان کو میر ممّن نظر آئے۔ جو رضا میاں کی ڈیوڑھی سے ہاتھوں میں کچھ سنبھالے ہوئے نکلے اور خمیدہ کمر اور تیز تیز قدموں کے ساتھ ایک طرف کو روانہ ہو گئے۔

ان کے ہاتھ میں نیلم کے دانوں کی ایک مالا اور فرشی پاجامے کا مسالہ تھا جو وہ نخاس سے لئے جا رہے تھے)

اے عالیہ باجی! اب جا کے جلدی سو جائیے۔ کل صبح سویرے ہی نمبر ٹونٹی ٹون چل دیں گے۔ پھر دھوپ تیز ہو جاتی ہے اور اتوار کو ابّو جیرلڈ کی شادی کا ایٹ ہوم کر رہے ہیں ---- راحیل کو بلوا بھیجئے گا۔ کہیں وہ سیدھی یہاں سے ہوسٹل نہ پہنچ جائے ---- آنگن کی دیوار کے پرے سے اسٹیلا کی آواز سنائی دی۔ لڑکیاں آپس میں مستقل باتیں کر رہی تھیں۔ کہاروں کا شور کچھ کم ہو چلا تھا۔

خدا حافظ راحیل بیگم ---- شاید میں تمہاری دنیا کو اور تمہیں اس طرح زیادہ دیر تک

زندہ تو دیکھوں گا ــــ وہ کھڑکی میں آ کر باہر دیکھنے لگا۔ نہر کے کنارے اندھا دیوٹ جل رہا تھا۔ اس نہر کی منڈیریں کتنی پتلی ہیں۔ راحیل اور یہ سب لڑکیاں دن بھر اس پر سے ہرنیوں کی طرح قلانچیں لگاتی اِدھر اُدھر آتی جاتی رہتی ہیں۔ اگر اس نے پرانے گھروں سے بنی ہوئی اس شکستہ منڈیر کی جالی پہ ایک پاؤں بھی رکھا۔ تو یہ یقیناً ٹوٹ جائے گی۔ اس نے کچھ استعجاب اور کچھ طمانیت سے سوچا۔

۳۰

دفعتہً علی کی آنکھ کھلی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ باہر بے حد گرمی ہے اور چاند املی کے اوپر آ چکا ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ ہم سب کنارے پہ کھڑے ہیں۔ ہم سب دو دو قدم آگے بڑھا چکے ہیں۔ چاروں اور پانی ہے اور کنارے کی پرانی منڈیر پانی میں گرتی جا رہی ہے، گرتی جا رہی ہے۔ اسے محسوس ہوا وہ خوب پانی میں ڈبکیاں لگا رہا ہے۔ حالانکہ ڈون اسکول کا وہ سوئمنگ چیمپین رہ چکا تھا۔ خواب ہی میں اسے بے حد غصہ آیا) پانی اب ہر طرف پھیل گیا ہے اور برابر اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس کو ڈر لگا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ کس قدر گرمی ہے۔ اس نے آنکھ کھول کر طے کیا۔ ہم سب یہاں مقید ہیں۔ نہر کی شکستہ منڈیر پہ جو دیوٹ جل رہا تھا۔ نیند کے دھندلکے میں سے اسے وہ ٹمٹماتا سا دکھائی دیا۔ ابھی میں نے ریاض کو دیکھا جو مہتابی پہ سائے کی طرح ٹہل رہے تھے اور پھر اندر چلے گئے۔ یہاں پر یہ کس قدر اجنبی معلوم ہو رہے ہیں۔۔۔ یہ ضرور واپس

اپنے گھر جا کر ہمارے اوپر قہقہہ لگا کر ہنسا کریں گے کہ واللہ کیا لوگ ملے تھے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ پرلے برآمدے میں رضا بھائی اور دلارے چچا اور وہ سب سو رہے ہیں۔ اندر میرے بزرگوں کی روغنی تصویریں آویزاں ہیں۔ آنگن میں میرے سارے پیارے بھی بھائی سوتے ہیں اور کل کے منتظر ہیں۔ جب وہ بخیر و خوبی محرم منا کر سول لائینز واپس جائیں گے ـــ لیکن میں دنیا سے اپنا وعدہ بھول چکا ہوں۔ وہ آہستہ سے نیچے آیا۔ اسٹیلا چبوترے کے نیچے مولسری کے نزدیک محو خواب تھی اور غالباً نیند میں دیکھ رہی تھی کہ کس طرح اس نے رنگ میں گنی تھا پڑ کو ہرایا۔ قریب ہی دوسری بہنوں کے پلنگ تھے۔ جو مختلف ہل اسٹیشنوں پر مختلف انگریزی درسگاہوں میں پڑھتی تھیں۔ اپنے اپنے والدین کے ساتھ یورپ کے چکر لگا آئی تھیں اور محرم کی تعطیلات کے خاتمے کی منتظر تھیں۔ کل صبح سے پھر زندگی شروع ہوگی۔

مدھم چاندنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نہر کے پشتے پر آگیا۔ مجھے آخر کدھر جانا ہے کیا میں ریاض الدین احمد کو اس فصیل، اس حویلی، ان گلیوں سے آگے اس کی دنیا میں پہنچا کر لوٹ آؤں گا۔ یا اس کو یہاں چھوڑ کر خود آگے چلا جاؤں گا۔ اس مکان کی حفاظت میرے سپرد تھی۔ اس نے آزردگی سے چاروں اور دیکھا۔ ان تاریک ڈیوڑھیوں، اداس چھتوں کے آگے کھیت ہیں۔ دریائی راستے۔ جنگل، گوپال پور اور اس کے بعد اور بہت سے گوپال پور ہیں۔ چاروں اور گوپال پور پھیلے ہوئے ہیں۔ چاروں کھونٹ معظم منزلیں ایستادہ ہیں اور ندی کے کنارے سول لائینز کی بے تعلق سڑکیں ہیں۔ ان سب نے مل کر ساری زندگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ مدتوں میں نے اس جگہ میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے ہیں اور پھر وہیں موجود ہوں۔ خداوندا

تو نے یہ دماغ دیتے وقت مجھے اتنی ہی شکتی کیوں نہیں عطا کی۔ اپنے آپ سے مباحثے کر کے خود کو اپنا یقین دلانے کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ اس وقت، آدھی رات کو جاگ کے، میں سدھارتھ کی طرح کیا ان لوگوں سے نفرت کر رہا ہوں جو میرے آس پاس سو رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوں تاکہ چاپ سے کسی کی آنکھ نہ کھلے۔ وہ پھاٹک پر آیا جس کے اندر، چوپہلوں کے قریب اولڈز موبیل کھڑی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ کار کنکر کے کنوئیں کی چوڑی گلی میں نکل آئی۔ میں گوپال پور جا رہا ہوں۔ اس نے معافی خاں کی سرائے کو جانے والی سیدھی سڑک پر آ کر خود کو بتایا۔ گوپال پور میں میرا داخلہ قانوناً ممنوع ہے۔ لیکن میں وہاں جا رہا ہوں۔ وہاں کچھ دیر میں رام گنگا کے کنارے، گھاٹ کے ٹھنڈے پتھروں پر بیٹھوں گا اور کیشو کے مندر کی گھنٹیوں کی آواز سنوں گا۔

"بھیا موٹر یا لیکے رات کو گاؤں کی اور نکل گئے،" صبح نماز کے وقت ہرمزی خانم نے بڑبڑا کر سب کو اطلاع دی۔ بیگمات وضو کے لئے نہر کے کنارے جمع ہو رہی تھیں جنبیلی کے نزدیک تختوں کے چوکے پر ناشتے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مردانے میں بیچوانوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہو گئی تھی۔

اسٹیلا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ مہمان خانے کی طرف بھاگی ہوئی آئی۔ ریاض، پائنیر کی سرخیوں پر نظر دوڑا رہے تھے۔

۱۲ تاریخ کو دلی میں ان کے محکمے کی جو کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس کے لئے ان کو پھر جلد از جلد روانہ ہونا تھا۔ ہلو—— انھوں نے اخبار پرے سر

اٹھا کر اسٹیلا کو دیکھا۔

"علی شاید گوپال پور چلا گیا ہے۔ آپ سول لائنز واپس جا کر فواد یا ارقان کو لیتے ہوئے گوپال پور چلے جائیے گا۔ جس قدر بھی جلد ہو سکے اسے واپس لے آئیے"۔۔۔ اسٹیلا نے پریشان آواز میں اس سے کہا۔۔۔

۳۱

"سرکار! کیا اس سینے سے آپ کی آنکھ کھل گئی؟" میر چھمن نے مؤدبانہ لہجے میں منا میاں کی مسہری کے قریب آکر ان سے کہا۔ دالان میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ آسمان پر اکا دکا چیلیں اور چند کنکوے بے ترتیبی سے اڑ رہے تھے۔ زندگی کا ایک اور بے رونق بے رنگ دن شروع ہوا۔ نواب رضا قاسم نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پژمردگی کے ساتھ سوچا۔

"کیا بات ہوئی؟" انھوں نے پیچوان کی نے اپنی طرف کرتے ہوئے تکیے کے سہارے بیٹھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں حضور۔ علی میاں کا ایک اور فضیحتا!"

"کیا ہوا؟"

"بس راتوں رات جانے کیا خفقان اٹھا کہ موٹر لے کر کہیں نکل گئے۔ تب سے

ڈھنڈیا مچی ہے۔ ہم جانتے ہیں گوپال پوری گئے ہیں۔ اگر کلکٹر صاحب کو معلوم ہو گیا تو اور غضب ہو گا"

"اور عالیہ بٹیا کیا کرتی ہیں"۔ رضا قاسم نے پوچھا۔

"پہلے تو سب بجے چکو پکو رو رہی تھیں صبح سے۔ پھر باہر جا کے اسٹیلا بٹیا نے جو مہمان پنجاب سے آئے ہیں، ان سے انگریزی میں کچھ گٹ پٹ کی۔ پھر مہمان صاحب نے موٹر نکالی۔ اسی وقت فواد میاں آ گئے اور پھر سب لوگ ان کے ساتھ چلے گئے"

"ہوں ۔۔۔" رضا میاں نے ایک لمبی سانس لے کر نے رکھ دی۔ "کھن کھن جی داؤ نے کتنے دام لگائے ۔۔۔ نیلم کے اور دونوں بانیچوں کے ۔۔۔" انھوں نے ذرا سرگوشی کے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہو گیا حضور۔ کھن کھن جی اپنے ہی آدمی ہیں۔ بس اب بی داؤ مہتر کے پیسے ادا کرنے باقی ہیں۔ فروری کے مہینے میں جو ان کا گانا ہوا تھا۔ اس کے لیے بھی وہ کہتی تھیں کہ رضا میاں پرسے لونڈی صاحب نے جولائے۔ ان سے تقاضا کون کر سکتا ہے"

"کیا ناگوار باتیں چھیڑ دیں آپ نے میر تحسین۔ آپ جانتے ہیں کہ سارا ہمارا حساب کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سے کہہ کر کیا کیجیے گا۔ میں عالیہ بٹیا کے متعلق پوچھتا تھا۔ اب کے سے یہ لوگ شہر سے جا رہی ہیں۔ پھر اگلے سال ہی معظم منزل آئیں گی۔ اس وقت تک معظم منزل رہتی بھی ہے یا نہیں۔ یہ اللہ کو معلوم ہو گا۔ ہم گوپال پور لوٹ جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں سے ان کی کوٹھیوں پر جا کر ملنے سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھو تو پاؤں اٹھا کر صوفے پر نہ رکھو۔ لان پر

جاؤ تو بجائے کنکوے کے پیچ لڑانے کے ٹینس کھیلو۔ مجھے ان سب کی اس خرافات سے نفرت ہے۔ یہ لوگ یہاں آئی ہوئی تھیں۔ اسی لئے خیال تھا ان کا اب کے سے قطعی عندیہ معلوم ہو جائے۔" رضا میاں نے کہا۔

میر جمّن ہونٹ بھینچے، یک ٹک کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ غالباً جو اطلاع وہ رضا میاں کو دینے والے تھے۔ اس کو زبان پر لانے کی ہمت اپنے میں نہ پاتے تھے۔ سامنے شہر کے مکانوں کی چھتوں پر بے رونق دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی۔

عالیہ باجی خاندان کی غیر شادی شدہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی خصوصیات یہ تھیں کہ سینئر کیمبرج کے امتحان میں وہ ہندوستان بھر میں سیکنڈ آئیں اور اس کے بعد کے سارے امتحانات میں فرسٹ۔ ان کی شکل بقول ہرمزی خانم ایسی تھی کہ سینما کی موتی لیلا چٹنس بھی ان کے آگے پانی بھرے۔ سید رضا قاسم ان کے بھی خالہ زاد بھائی تھے۔ عالیہ باجی کی امی، اسٹیلا کی امی یعنی زینب خالہ اور رضا بھائی کی امی یہ لوگ آپس میں سگی بہنیں تھیں اور ان کی شادیاں تین سگے چچا زاد بھائیوں سے ہوئی تھیں جن کا گوپال پور میں مساوی حصہ تھا۔ یہ تینوں بہنیں ظہیر پور ہردوار کی بیٹیاں تھیں۔ لہٰذا طے شدہ امر تھا کہ جب عالیہ باجی پیدا ہوں تو رضا بھائی کی امی ٹھیکرے میں ایک گنی ڈال دیں۔ رضا بھائی کا یہ عالم تھا کہ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو خود کو گوپال پور اور ظہیر پور ہردوار دونوں جگہوں کا کرشن کنھیا تصور کیا۔ ان کے علاوہ کنبے کے تقریباً سارے افراد قصبے سے باہر ملک کے مختلف شہروں میں رہتے تھے۔ لیکن رضا بھائی اپنے مصاحبوں کے ساتھ پرانی سرائے کی گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے اور رام گنگا کے گھاٹ پر آنے والی

کہارنوں اور اہیرنوں کے ساتھ راس لیلا رچاتے پروان چڑھے۔ بڑی دھوم دھام اور اللہ آمین کے ساتھ ان کو پہلے لامارٹینیر، پھر کالوِن پھر علیگڈھ بھیجا گیا۔ کیننگ کالج کی طرف سے یہ خدشہ تھا کہ لکھنؤ کی ہوا ان کے سیدھے سونے پر سہاگے کا اثر رکھے گی۔ علیگڈھ میں ان کے لئے ایک کوٹھی لے لی گئی۔ کیونکہ ہوسٹل میں رہنا شانِ وضعداری کے خلاف تھا۔ کوٹھی بدقسمتی سے ڈگی کے قریب گرلز کالج کے بالکل سامنے تھی۔ لہٰذا انجام پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ذاتی عملے میں چھ نوکر اور دو مصاحبین تھے۔ ایک ستار سکھاتا تھا۔ کئی سال بعد جب وہ بخیر و خوبی انٹرمیڈیٹ میں کامیاب ہوئے تو پڑھانے کا پروگرام منقطع کیا گیا۔ لیکن رضا بھائی شہسواری بہت عمدہ کرتے تھے۔ نشانہ بھی بہت عمدہ تھا اور ستار تو ایسا بجاتے تھے کہ بس سنا کیجئے۔ گوپال پور واپس لوٹ کر انھوں نے شوقیہ ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی جس کے جنرل منیجر، پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ڈائریکٹر اور ایکٹر وہ بہ نفسِ نفیس خود تھے۔ باقی کے دوست احباب کو دوسرے مختلف کام سپرد کیے گئے۔ لکھنؤ کی ماہ منیر، کانپور کی تارا، گورکھپور کی شمیم اور الہ آباد کی کرشنا کا بے بگا ہے اس کمپنی کی گویا گیسٹ اسٹار بن کر گوپال پور جایا کرتی تھیں اور ان کے ڈراموں کو ملاحظہ کرنے کے لئے ضلع کا انگریز کلکٹر اور دوسرے حکام مدعو کئے جاتے تھے۔ روپیہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ رضا بھائی کہتے تھے کہ یہ جانِ عالم کی سنت ہے جس پر وہ سعادت مندی سے عمل پیرا ہیں۔

عالیہ باجی کے متعلق بھی وہ بے حد سنجیدہ تھے۔ عالیہ باجی کا یہ عالم تھا کہ رضا بھائی کے تذکرے ہی سے وہ اس قدر محظوظ ہوتی تھیں کہ ایک بار ان کو خدشہ ہوا کہ ہنستے ہنستے کہیں ان کو اینڈی سائٹس کا دورہ نہ پڑ جائے جس کی وہ پرانی مریض تھیں۔ پچھلے دس بارہ

سال سے۔ یعنی کالج میں پہنچنے کے بعد سے نادرہ، شگفتہ، ماما اور میرا لطیف جوشی اور اپنے دوسرے رفیقوں کے ساتھ کوئی جوشیلی بحث کرتے کرتے وہ دفعتہً گرج کر دریافت کر لیا کرتی تھیں کہ سید رضا ہم جیسی ہستیوں کو سمجھنے، ان کو سمجھانے اور ان کے ان آبائی اور کردنگ امراض کا علاج کیا پارٹی لائن نہیں ہے۔ لیکن خود آج تک انھوں نے رضا بھائی سے اچھی طرح اور اخلاق سے بات تک نہ کی تھی۔ شادی کے لئے بھی ان کے بقول شخصے ایک سے ایک عمدہ پیغام آتے تھے۔ لیکن اگر کوئی سید تھا تو آئی۔سی۔ایس نہ تھا اور جو آئی۔سی۔ایس تھا وہ سید نہ تھا اور جو سید اور آئی سی ایس دونوں تھا تو وہ پنجابی تھا۔ یا بنگالی تھا یا پشاوری تھا۔ یو۔پی کا نہ تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ بے حد وقت طلب اور پریشان کن مسئلہ عالیہ باجی کی شادی تھی۔ رضا بھائی کا یہ تھا کہ سید بھی تھے اور ایک کافی بڑی زمینداری کے اکلوتے مالک بھی مظہر پور ہروار کا آدھا حصہ بھی ان کا ہی تھا۔

اب کے سے جہلم کے لئے جب سب لوگ نمبر گیس سے حسبِ معمول معظم منزل گئے تو رضا میاں بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ محرم نکلتے ہی انھوں نے میر محسن کے ذریعے کہلوایا کہ اب عالیہ باجی سے ان کی نسبت کم از کم پکی تو کر ہی دی جائے۔ یہ کیا ستم ہے کہ برس گذرتے جا رہے ہیں اور وہ وہیں کے وہیں ہیں۔ عالیہ باجی بھی وہیں کی وہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے عزیز دوست لاڈلے آغا اور مرزا لطفی دونوں سے کہا کہ وہ یہ بھی دیکھ لیں گے کہ عالیہ بیگم کس افلاطون کے بچے سے شادی کرتی ہیں۔ لامحالہ ذات باہر شادی کریں گی۔ کیونکہ اس پاس تو ان کو کوئی اپنے لائق نظر آتا نہیں اور پھر وہ ہوگا جو آج تک خاندان میں کبھی نہ ہوا تھا۔ یعنی سادات سے باہر شادی۔ گو یہ اکثر ہوتا آیا تھا کہ کنبے کے اکثر اہلِ دل اور اہلِ نظر حضرات کسی حسین کہارن، کسی مہراسن، کسی خانہ زاد لونڈی کے لئے ایک آدھ علیحدہ مکان

بنوا رکھا تھا۔ لیکن یہ بالکل دوسری بات تھی)

معظم منزل علی اور عالیہ باجی کی والدہ کی مشترکہ جائداد تھی۔ باجی کے کوئی اور بہن بھائی نہ تھے اور ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ علی معظم منزل کے دو تہائی حصے کا مالک تھا اور کئی سال سے اس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ روپیہ فراہم کر کے معظم منزل کو رہن سے چھڑائے۔ لیکن اب تک وہ اس مہم کو سر نہ کر سکا تھا۔ اگر معظم منزل صرف عالیہ باجی کے حصے کی ہوتی تو رضا بھائی وہ مشہور و معروف پانسہ پھینکتے جو ایسے موقعوں پر ہزاروں بار پھینکا جا چکا ہے۔ یعنی اس کو رہن سے چھڑانے کے لئے اپنی شادی کی شرط پیش کرتے لیکن یہاں یہ سلسلہ بھی نہ تھا۔

لیکن ایک بات تھی جو لاڈلے آغا۔ مرزا نقی اور تقریباً سب ہی کو معلوم تھی کہ رضا میاں عالیہ باجی پر سچ مچ میں جان دیتے ہیں۔ لڑکپن سے جان دیتے آئے ہیں۔ بہرحال وہ عالیہ باجی کے تصور میں آنکھیں بند کئے بیٹھے رہتے ——— کیا طبیعت داری ہے صاحب ——— مرزا نقی کہا کرتے۔

"——— ہاں تو آپ نے بتلایا نہیں کیا جواب ملا۔" آنکھیں کھول کر انھوں نے میر چھمن سے پھر سوال کیا۔

میر چھمن اپنے مراقبے سے چونک اٹھے ——— "سرکار بات یہ ہے ———" انھوں نے گلا صاف کر کے آواز نکالی ——— "کہ رات جب میں نے بی ہرمزی خانم سے کہا کہ بڑی بٹیا نے کیا جواب دیا تو وہ تو مجھ پر برس پڑیں۔ کہتی تھیں میر صاحب کیا سوچ کر آپ نے ایسی بات کہی۔ ہمارے بیٹے تو جیسی عالیہ بٹیا ویسے ہی رضا میاں۔ لیکن بھلا کوئی تک بھی ہے۔ اور پھر انھوں نے کہا کہ صاحب عالیہ بٹیا نے تو بہت برا مانا ——— بالکل قطعی انکار ہی

گھٹے ـــ اس کے بعد سب لوگ مہمان خانے کی طرف چلے گئے۔ جہاں وہ پنجاب والے صاحب بہادر ٹھہرے تھے اور عالیہ بٹیا دیر تک انگریزی میں باتیں کرتی رہیں پھر انھوں نے کہا کہ وہ صبح صبح ہی واپس چلی جائیں گی۔ معظم منزل تو وہ ایک منٹ اب نہیں ٹھہرنا چاہتیں ـــ"

میر چھمن چپکے بیٹھے رہے۔ آنگن میں مرغیاں بے ہنگم آوازیں نکال رہی تھیں۔ ڈیوڑھی میں کسی کہار نے بیچے سروں میں بارہ ماسا الاپنا شروع کر دیا تھا۔ دھوپ اندر کے کمروں تک پہنچ گئی تھی۔

"اور کیا کہتی تھیں عالیہ بیگم؟" رضا میاں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ حضور بس پہلے تو بہت بگڑیں اندر پھر وہ اور علی میاں ویر تک کھلکھلا کر ہنستے رہے۔

"ہم سمجھے ـــ" رضا میاں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "عالیہ بیگم علی سے بیاہ کریں گی۔ ہم جانتے ہیں۔"

"اے نہیں سرکار ـــ ایسا نہ کہیے۔ بالکل سگے بہن بھائیوں کی طرح سے ہیں یہ لوگ۔ ویسے بھی عالیہ بٹیا، علی میاں سے ایک آدھ سال بڑی ہی ہوں گی ـــ ایسا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا۔" میر چھمن نے جواب دیا۔

"اسے بہت دیکھے ہیں سگے بہن بھائی۔ میر صاحب آپ نے دنیا دیکھی کیا ہے" رضا میاں نے دل برداشتہ ہو کر خفگی سے کہا۔ "دنیا تو آپ نے بھی سرکار گو بال پورے لے کر کنگر کے کنوئیں تک ہی دیکھی ہے۔ چاہے چار سال علی گڈھ کے بھی رکھ لیجیے۔" میر چھمن نے دل میں کہا۔ لیکن خاموش رہے۔

"آخر انھوں نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔" رضا بھائی نے غصّے میں اپنی باریک نفیس مونچھیں ہلائیں — "کیا ہم کو اپنے کے یہاں کا مسخرہ مقرر کر رکھا ہے اپنے حساب، جو ہم پر یوں باقاعدہ ہنسا جا رہا ہے"—

وہ مسہری سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دالان میں ٹہلتے رہے — سارا قصور کس کا ہے — انھوں نے سوچنا شروع کیا — ہم کو وہ تعلیم تو دینے کی کوشش کی گئی جو ان سب کو ملی۔ لیکن وہ باتیں سمجھانے کی ضرورت نہ سمجھی گئی جس کی وجہ سے ہم خود اس جگہ پہ ہیں اور وہ لوگ ایسے ہیں — لیکن ہم پہ تو سب کو فخر تھا۔ ہم ان لوگوں کے اس کمبخت خاندان کے اس مشہور و معروف تاریخی اور تہذیبی پس منظر اور روایات کے آخری نمائندے قرار دیے گئے تھے۔ جو اب تک دوپلی ٹوپی پہنتے ہیں اور کنکوے اڑاتے ہیں۔ جو راستہ ہمارے سامنے تھا۔ وہی ہم نے اختیار کر لیا۔ علی صاحب میں اس راستے سے ہٹنے کی آرزو تو بڑی شدید ہے لیکن ہمت نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم پہ وہ کسانوں کا خون چوسنے کا الزام رکھتے ہیں تو خود اب تک انھوں نے کیا کیا ہے۔ گاؤں میں جاکر تقریریں کرنے کے بجائے انھوں نے جیٹھ بیساکھ کی دھوپ میں ہل چلانے کا تجربہ کیوں نہ کیا —

رضا میاں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھر میر چھمّن کے مونڈھے کی طرف مڑے۔ "علی میاں آج کل کیا کرتے ہیں —" انھوں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں حضور — یونیورسٹی تو وہ کب کی چھوڑ چکے، پھر آپ جانیے جیل چلے گئے تھے۔ اب گورنمنٹ کی نوکری تو ان کو مل نہیں سکتی۔ کچھ دنوں باتیں اخبار میں کام کیا تھا اور سرکار بنکوں وغیرہ میں جو روپیہ ان کا ہے، وہ جب تک وراثت کا سرٹیفکیٹ عدالت نہ دے۔ ان کو نہیں مل سکتا۔" میر چھمّن نے جواب دیا۔

"وزری لاڈلے آغا کو بھیجتے جائیے گا۔" انھوں نے کہا۔

"بہت اچھا سرکار — ابھی بھیجتا ہوں — ذرا وہ آپ کا جی بہلائیں — کیوں آپ غم کھاتے ہیں لے بس اب جانے دیجئے" — میر چھمن نے عرض کی اور ڈیوڑھی کی سمت چلے گئے۔

"اے جناب! محبت کو تو گولی ماریئے۔ یہاں تو ناک کا سوال ہے — ہمیں بڑا لبتھا ہے۔ آپ اب تلک غصہ کیسے پیتے ہوئے ہیں" لاڈلے آغا نے تخت کے کونے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیکرے کی مانگ — کناں کہ ، اور اس صفائی سے توڑ دی جاوے۔ چہ خوش چیرانہ بودی —"

رضا بھائی دل کے بُرے نہ تھے۔ اپنے سارے خاندان سے ان کو کافی انس تھا لیکن جس طرح کا ماحول انہیں ملا تھا اور جو ان کی صحبت تھی۔ اس کی وجہ سے ان کا دماغ صرف ایک ہی راستے پر کام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ علی سے انہیں ہمیشہ سے چڑ سی تھی اس چڑ کی وجہ معلوم کرنے کی انھوں نے کبھی سعی نہ کی۔ بہت دیر تک اپنا غم و غصہ ضبط کرتے رہنے کے بعد اب یکلخت ان کو جلال آگیا اور انھوں نے طے کر لیا — وہ ان سب کو بتلا دیں گے کہ آخر تم نے ہم کو سمجھا کیا ہے — اگر ہم تمہارے ساتھ بیٹھ کر انگریزی فلسفہ نہیں بگھار سکتے۔ تو کیا صاحب توہین کا بدلہ بھی نہیں لے سکتے۔ لیکن پھر انہیں خیال آیا کہ مصیبت یہ تھی کہ وہ کسی طرح سے بھی اس توہین کا بدلہ نہ لے سکتے تھے۔ کیونکہ دراصل یہ کوئی لمبی چوڑی بات ہی نہ تھی۔ نہ کوئی بہت ادق ریاستی سیاست کا معاملہ تھا نہ تلواریں چلنے کا اس زمانے میں دستور تھا۔ لیکن بہر حال انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے

پہلے تو علی کی پھر سے ایسی خبریں لیں گے کہ ساری لاٹ صاحبی میاں صاحبزادے کی تشریف لے جائے۔ یہ جو وہ ہر موقع پر اٹھ کر جیل ویل چل دیتے ہیں اور دنیا اسے ان کو ہی ہیرو سمجھتی ہے اور رضا میاں کو تمسخر سے دیکھا جاتا ہے کہ واہ کیا ایک گھرانے میں دو اتنے متضاد کردار ہیں۔ لیکن علی کا بھی وہ اب تک کچھ نہ کر سکے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کے گوپال پور کے قیام کے زمانے میں کوئی نہ کوئی نضیحتا اس کے سر پر کھڑا کر دیا تاکہ وہ جھنجھلا کر اور زیادہ بچپنے کی حرکتیں کرے اور مقدمہ بازیوں کا جھمیلا بڑھے۔ لیکن جب گوپال پور کورٹ آف وارڈز میں دے دیا گیا تو یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ ایلمر رکسٹن کو وہ علی کے خلاف بھڑکا سکتے تھے۔ کیونکہ اکثر وہ اسے اپنے علاقے پر شکار یا تھیٹر کمپنی کے جلسوں کے لئے مدعو کرتے رہتے تھے۔ لیکن اس انگریز بچے کا بھی عجیب ہی حساب تھا۔ ایک طرف تو علی کے سارے گروہ کا بے حد دم بھرتا تھا اور دوسری طرف وہ علی اور اس کی سیاسی جماعت کے خلاف روز کوئی نہ کوئی قانون بناتا اور حکم عائد کرتا تھا۔ انگریزوں کے ہاں، رضا میاں نے سنا تھا کہ کچھ ضمیر اور اصولوں کی پابندی وغیرہ کا بہت لمبا چوڑا سلسلہ ہے اور یہ ذاتی پرخاشوں اور جھگڑوں میں کسی کے خلاف کبھی نہیں اکسائے جا سکتے۔ اور ایلمر رکسٹن کا ضمیر تو اس معاملے میں بہت ہی خاصے کی چیز مشہور تھی۔

"اور اس معظم منزل کا، اس کا نام لیجئے۔ کیا ہووے گا"۔۔ لاڈلے آغا نے رضا بھائی کو خیال میں مستغرق دیکھ کر بالکل ایک دوسرے زاویئے سے اس مسئلے پر روشنی ڈالنی چاہی۔۔۔ "ہم نے تو یہ سنا ہے کہ پٹنے کی طرف کے کوئی صاحب ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ نہروں وہروں کے انجینئر ہیں یا کیا، ان کا پیغام ہے۔ لیکن

عالیہ بیگم کو وہ بھی پسند نہیں اور ویسے بھی عالیہ بیگم نے ٹھان لی ہے۔ اگر یہ نہیں سوچا ہے کہ کبھی جب بھی ان کا بیاہ ہو گا۔ اس کے لئے جو چالیس پچاس ہزار کم از کم درکار ہے وہ کہاں سے آوے گا۔ جبکہ یہ مکان پہلے ہی سے رہن ہے۔ اس کے رہن کا کیا ہوا؟ کیا لکھن لکھن جی والوں نے ادائیگی کی میعاد بڑھا دی؟"

"معلوم نہیں"۔ رضا میاں نے جواب دیا اور خاموش رہے۔

"بہت خوب"۔ انھوں نے ایک بار کہا اور یکلخت چٹکی بجائی۔ "یار میرے ذرا میر صاحب سے کہنا جوڑی جتوا دیں۔ میں ذرا لکھن لکھن جی کے ہاں ہو کر آتا ہوں"۔

لاڈلے آغا ڈیوڑھی کی جانب چلے گئے

آسمان پر چیلیں اسی نحوست اور ویرانی سے اڑتی رہیں۔

۳۲

کار نہایت آرام دہ رفتار سے گوپال پور کی سڑک پر چلتی رہی۔ پھیلینے۔ کھرنی اور املتاس کے درخت، چھپر کے چوپال۔ کنوئیں۔ اس قصبے۔ اس موضع، اس دنیا کا سارا منظر اس کے آس پاس پھیلا ہوا تھا۔ گھاٹ کے پرے کیشو کا پرانا مندر تھا۔ اس کی اینٹوں میں سے پیپل کے پودے اُگ آئے تھے۔ اس پر کیسری رنگ کا جھنڈا بیدلی سے لہرا رہا تھا۔ گویا کہتا ہو بھائی تم سب لوگ مل کر پھر کیوں نہیں جاتے۔ پرانی سرائے کے مکانوں کے پرے سورج جگمگا رہا تھا۔ ریاض نے گرم ترچھی کرنوں سے بچنے کے لئے آنکھوں پہ ہاتھ رکھا اور کیلے کے جھنڈ کے اختتام پہ پہنچ کر کار موڑ لی۔

"شام ہوتی جا رہی ہے ہمیں شام سے پہلے پہلے گھر واپس پہنچ جانا چاہئے۔ سب بہت پریشان ہوں گے۔" دادا نے کہا۔

"تمہاری شرکت تو ظاہر ہے کہ لازمی ہے ایشا مدام میں۔ تم جیر لاد کے بیٹے ہو

بھی تو تھے۔" علی نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پہلی دفعہ بات کی۔ پھر منہ پھلا کر چپکا ہو رہا۔ جس وقت ریاض اور رفو ستر میل کی رفتار سے کار چلا کر گوپال پور پہنچے ہیں۔ انھوں نے علی کو مندر کی پچھلی سیڑھیوں پر خاموش بیٹھے کوئلے سے فرش پر تصویریں بنانے میں مصروف پایا تھا۔ اب وہ اس کو ساتھ لے کر لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔ "تم اولڈز موبیل لے کر چلو میں پیچھے آتا ہوں۔" ریاض نے فواد کو پکار کر کہا۔

فیض آباد روڈ پہ پہنچ کر ریاض نے دیکھا کہ پہلے سے ہی کافی گہما گہمی ہے۔ "ارے علی بھیا آ گئے۔" سب ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑے۔

"اچھا ـــــ اب آپ سب لوگ تازہ دم ہو کر فوراً جاپلنگ روڈ پہنچیے۔ ایٹ ہوم کا وقت نزدیک ہے۔" شیلا نے برآمدے میں آ کر آواز دی۔

"ایٹ ہوم کس سلسلے میں؟ علی کے واپس آنے کی خوشی میں؟" ریاض نے کار سے اترتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے آپ کو پتہ نہیں۔ مستقل اتنے دنوں سے تو اس کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اٹاوہ کے اے۔ ایس۔ پی نے ہماری ایک دوست سے شادی کی ہے۔ ان کے لئے عصرانہ کر رہے ہیں۔ میرے یہاں یعنی جاپلنگ روڈ پر۔ آپ لوگ چلیے۔ ہم ابھی جاتے ہیں۔" اتنا کہہ کر شیلا باڑھ پھلانگ کر ہیرا کے وہاں چلی گئی۔ اسے جلد از جلد اپنے گھر پہنچ کر زینب خالہ کی مدد کرنی تھی۔ لیکن اس سے پہلے ساری لڑکیوں کو ہیرا کے ڈریسنگ روم میں جمع ہو کر حسب معمول، شام کے ایونٹ کے لئے لباس کے انتخاب کے متعلق طے کرنا بھی اشد ضروری تھا۔ جس میں ہمیشہ کئی گھنٹے لگتے تھے۔

فواد، علی کی اولڈزموبیل پر گوپال پور سے سیدھا "ہاؤس" چلا گیا تھا۔ آکر دیا،

نہا دھو کر اور تازہ دم ہو کر اشیلا کے گھر پہنچے۔ صبح منہ اندھیرے سے علی کی گمشدگی نے اتنا تہلکہ مچایا تھا اور اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی کہ اب سب کو ذرا دم لینے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ارون بھی اپنے ڈریسنگ روم میں گھسا ہوا سوٹ کے انتخاب میں منہمک تھا۔

ریاض نے اس ساری گہما گہمی کے دوران میں جو اب ایٹ ہوم کی تیاریوں کے سلسلے میں نظر آ رہی تھی برساتی کی سیڑھیوں پہ ایک پاؤں رکھ کر باغ کو دیکھتا رہا۔ نمبر اکیس۔ نمبر بائیس۔ اس نے دل میں دہرایا۔ بہت خوب۔ دونوں کوٹھیاں درختوں میں چھپی اس کے سامنے برابر برابر کھڑی تھیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر ہاؤس تھا۔ اسی طرح کی اشیلا کی کوٹھی ہوگی جہاں اس وقت عصرانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ نیچے اترتے، سامنے سے برنزی خانم گزر رہی۔ دفعتاً اسے ایک بے حد عجیب سا احساس ہوا۔ ان لوگوں کے ساتھ وہ تین دن اور تین راتیں، شہر کی ان بھول بھلیاں ایسی گلیوں اور اس عجیب و غریب ماحول والے مکانوں میں گزار کے آ رہا ہے۔ ابھی ابھی وہ گوپال پور سے لوٹا ہے۔ اس نے تیراہ بخش کے مچھلی کی شکل والے خدا کا مندر بھی دیکھا ہے۔ ان ساری چیزوں میں، ان انسانوں میں، جو دور سے اتنے ناقابلِ فہم اتنے پراسرار نظر آتے ہیں، دراصل کوئی بھی اسرار نہیں۔ دراصل یہ سب کتنے معمولی، کتنے دکھی ہیں۔

اور روح کا چین جو پہلے بھی کہیں نہیں تھا۔ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس کی ہتھیلیوں پر ایک بوند آن گری۔ شاید بارش بھی شروع ہو جائے۔ بے وقت کی۔ برآمدے میں کسی نے رائے کا اظہار کیا۔

"تمہارا سامان جو تمہارے ساتھ معظم منزل چلا گیا تھا۔ ہاؤس پہنچایا جا چکا ہے۔ تم بھی یہاں آ کر تازہ دم ہو لو۔" فواد نے فون پر اس سے کہا۔

"اچھا بھئی علی" ریاض نے علی کے ڈریسنگ روم کی کھڑکی میں سے سر اندر کر کے اس کو آواز دی "اب ہم سب لوگ شام کو تمہارے خالو میاں کے یہاں جاپلنگ روڈ پر ملیں گے — پھر ہی؟"

"اللہ حافظ" علی نے کھڑکی میں سر نکال کر جھانکا۔

ریاض کار کی طرف جا رہا تھا۔ جب بھی وہ لکھنؤ آتا تھا۔ فواد کی کار مستقل اس کے استعمال میں رہتی تھی۔ فواد اتنے دنوں تک سائیکل یا موٹر بائیک پر گھومتا تھا۔ ان دونوں دوستوں میں کتنی محبت ہے۔ علی نے خیال کیا۔ ان سب پر۔ ان سارے لوگوں پر۔ یہاں تک کہ اس غیر ملکی شخص ریاض الدین احمد تک کے لئے رحم۔ محبت اور مکمل صلح کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوتا — خداوندا — خداوندا — میری مدد کر — علی نے تھک کر کھڑکی کی چوکھٹ میں سر رکھ دیا۔ میں ختم ہو جاؤں گا — اس نے طے کیا۔

کھڑکی میں سر رکھے وہ خاموشی سے روتا رہا۔

۳۳

زیب خالہ کی زندگی مختلف قسم کے سوشل ہنگامے آرگنائز کرنے میں گزر رہی تھی۔ سوئمنگ کے مقابلے۔ شادی کے ڈنر۔ برج اور شکار پارٹیاں ۔۔۔ "تین درجن پیالوں میں نکال کر باقی گشتیاں پھر فریجڈیر میں رکھ دو ۔۔۔" انھوں نے پینٹری میں سے جاتے جاتے رحمٰن کو ہدایت کی اور پھر ایلمر کی طرف متوجہ ہوئیں جو پان کھانے کے لئے اندر آیا تھا۔ "ہاں۔ ہاں ایڈمنڈ بالکل گدھا ہے۔ اگر اس نے تمہاری نظم پر غلط تنقید کی۔ مجھے تو یہ نئے شعر کبھی بھی نہیں بھاتے۔ خصوصاً یہ تمہارا ایڈمنڈ کوئنٹر۔ کیا بکواس نظم لکھی تھی اس نے وہ ۔۔۔" انھوں نے جلدی سے ایلمر کو یقین دلایا اور پھر میزوں پر چھپے ہوئے سامان کی طرف مڑیں ۔۔۔ "ایک چھٹانک رائی۔ جلدی نکالو سینڈوچز کے لئے ۔۔۔ کوئنٹر مجھے یقین ہے کہ بالکل ناسمجھ ہے ۔۔۔"

"لیکن آنٹی میں جیرالڈ کے متعلق پوچھ رہا ہوں" ایلمر نے جھنجھلا کر پھر کہا۔

جیرلڈ کے متعلق ہو گیا۔" ٹماٹر کاٹتے کاٹتے رک کر انھوں نے ایلمر کو متجسسانہ نگاہوں سے دیکھا۔

"کیا واقعی شادی ہو گئی؟" ایلمر نے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا میں خواہ مخواہ اتنی بڑی دعوت کی دردسری اٹھا رہی ہوں — ہیں ہو — ہاں میں تم نے چونا پھر بہت لگا لیا ہو گا — شوفرمی پیاز کا ٹوکرا بول کے لیے — چار سیر شکر —" وہ پھر انتظامات کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"ایلمر باہر آؤ — ہم کرسیوں پر بکھرے پن کے ناموں کی پرچیاں چپکا رہے ہیں۔ آکر کام کرو —" لان پر سے اردن کی آواز آئی۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" پھولوں کے نزدیک آ کر اس غیر شخصی انداز سے دریافت کیا۔ میرا نے جو انہماک سے گلدان سنوارنے میں محو تھی۔ پھولوں پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھا "جیرلڈ کی شادی کی دعوت۔ ظاہر ہے۔"

ایلمر رچیسن کا رنگ دفعتہً سفید پڑ گیا۔ پھر اس کی کنپٹیاں گرم ہو گئیں۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس نے خود کو سنبھالا اور وہ اخلاقاً ہنسا۔ "مبارک ہو۔ مبارک ہو۔" اس نے کہا

"تم کو خود مبارک ہو۔ کیا تم گواہوں میں شامل نہیں تھے؟" میرا نے اسی غیر شخصی انداز میں سوال کیا۔

"شادی کہاں ہوئی؟" اس نے زخم خوردہ بل کھاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ گو یہ میرا تھی میرابل۔ جو اس کے قریب کھڑی تھی۔ لیکن آخرکار وہ ہندوستانی تھی۔ یہ ہندوستانیوں کا گھر تھا۔

"یہیں پر۔ اسٹیلا کے ابو کے ڈرائنگ روم میں۔ وہ مسلمان ہوا۔ پھر قبلہ ملّن صاحب

نے اس کا نکاح پڑھایا۔ اسٹیلا کے ابّو اس کے بڑے تھے اور دوست۔ انھوں نے اس سے کہا: میاں کیا خرافات ہے۔ یا شادی کرلو یا پھر اس سلسلے کو ختم کردو۔ چنانچہ اس نے شادی کرلی۔" میرابیل پھر پودوں میں مصروف ہوگئی۔

ایلمر ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا ایک چنار کے نزدیک جاکر کھڑا ہوگیا اور بے خیالی کے ساتھ ناخنوں سے تنے پر لکیریں کھینچتا رہا۔ رفیعہ جیرالڈ اس نے تنے پر لکھا اور اس نام کو پڑھا۔ ایک ناقابلِ فہم برافروختگی سے اس کی کنپٹیاں پھر جلیں۔ میرا۔ میرابل کرسٹن تنے پر اس نے لکھا ــــ اور اس کا رنگ پھر سفید پڑ گیا۔ کمبخت ــــ کمبخت ۔ اس نے دل میں غصے سے دہرایا۔

لڑکے اور لڑکیاں مختلف کاموں میں انتہائی مصروف لان پر اس کے پاس سے ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ چنار کے قریب اسے تنہا اور چپ چاپ کھڑا دیکھ کر اسٹیلا اس کے قریب آکر رکی۔

" ایلمر میاں ۔ اس نے خوش دلی سے کہا: اس قدر پژمردہ کیوں نظر آرہے ہو۔ جاؤ ذرا لاؤڈ اسپیکر کے لئے ریکارڈ علیحدہ کرلو۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ آج سلطنت برطانیہ کا ایک اور اہم ستون متزلزل ہوا اور گرا۔ ایمپائر کی **Integrity** وغیرہ۔ اور میرا خیال ہے کہ چونکہ آئی۔ پی سکرٹری آف اسٹیٹ کی ملازمت ہے۔ لہٰذا جیرالڈ کو غالباً نوآبادیات کی وزارت یا انڈیا آفس سے اجازت لینی چاہئے تھی لیکن اس کے بجائے اس نے ابّو کے کہنے پر عمل کیا۔"

میاں یہی زمانہ آن لگا ہے ــــ اسی لئے تو کہا گیا تھا کہ بھائی نیٹو سوسائٹی سے الگ رہو اور اسی نکتے کو مدنظر رکھ کے تم سب کو فارسٹر کا ناول پڑھنے کی ہدایت کی

گئی تھی تاکہ عبرت پکڑو۔ مگر کیا کیا جاوے۔" جعفر نے نزدیک آتے ہوئے منہ لٹکا کر کہا اور پھر برف کی بالٹی اٹھا کر آگے چلا گیا۔

"میاں دل نہ میلا کرو۔ پارٹی کے بعد یہاں سے کلب چلیں گے" — اردن نے پاس آکر علیج کا ہاتھ بڑھایا۔ ایلمر کے قریب ان سب کا مجمع دیکھ کر میں اس طرف آئی۔ ایلمر نے اپنی جھلملاتی ہوئی نیلی آنکھیں اٹھا کر اداسی سے مجھے دیکھا۔ گویا یہ سب کیا خرافات ہے

"بلوسینٹ ایمن"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہو خاں صاحب — آپ جانو میں نے ہمیشہ تم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ ضرورت سے زیادہ ہندوستان پرستی یہی رنگ لاوے گی ایک دن"۔ میں نے گلا صاف کر کے سنجیدگی سے کہا۔ وہ کوشش کر کے مسکرایا۔ اردن وغیرہ دوسری طرف جا چکے تھے۔ "ایلمر رکسپتھن"۔ میں نے جھک کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم واقعی خفا ہو۔ کیونکہ تمہاری قوم، طبقے اور رتبے کے ایک فرد نے وہ کیا، جو آج تک تم لوگ، حقارت، نفرت اور خوف کی وجہ سے سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ تم میں اپنے ہم قوموں سے زیادہ سمجھ اور احساس کی گہرائی ہے۔ لیکن بالآخر تم بھی اس وقت اسی شدید جھنجلاہٹ اور غم و غصے میں مبتلا ہو گئے۔ جو آج تمہارے سارے ہم قوموں پر اس معمولی سے واقعے کی وجہ سے طاری ہے۔ غالباً تم اس کے غیر شعوری طور پر جیرلڈ پر رشک کر رہے ہو۔ کہ اس نے اتنی اخلاقی جرأت دکھائی اور رنجیدہ ہو کہ تمہارے نسلی وقار کو شدید ٹھیس پہنچی — بیچارے ایلمر بھائی"۔ میں نے ٹرے اٹھائی اور پھر مہمانوں کی طرف چلی گئی —

وہ ایک پاؤں کا بوجھ دوسرے پہ تبدیل کر کے وہیں کھڑا رہا — رفیعہ

قریب سے گذری۔

"ہلو مسز جیرلڈ۔" اس نے اخلاقاً جھک کر بے حد شیریں لہجے میں کہا اور اس کے ہونٹوں کا ایک کونہ، کچھ تمسخر، کچھ محبت، اور کچھ رشک کے ساتھ نیچے کو جھک گیا۔ ایسے موقعوں پر وہ بے حد خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس نے دل میں دہرایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا لان کے سرے پر آ گیا۔ بہت سے مہمان کسی مسخرے کھیل غالباً "جنرل پوسٹ آفس" میں مشغول تھے جس میں کھیلنے والے خود کو مختلف شہر تصور کر کے ایک دوسرے کی کرسیوں پر قبضہ جمانے کے لئے دوڑتے تھے اور بے حد اودھم مچتا تھا۔ صوفوں کے مختلف دائروں میں اسے صوبے کی سوسائٹی کے سارے اہم افراد نظر آ رہے تھے۔ سید وزیر حسن کا خاندان۔ راجو شنگ بہنیں۔ نیرا، مایا اور اندرا۔ جے پی سریواستو کی لڑکیاں۔ شیلا۔ مالتی، عمرلا، شکنتلا۔ نہرو اور کاٹجو گھرانے۔ راجہ مہاراج سنگھ کا خاندان۔ جسٹس محمد رضا کا کنبہ۔ حسب معمول بہت سے انگریز اور ان کی بیویاں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ مثلاً شہر کا آئی جی اور ڈی سی۔ صوبے کی حکومت کے مختلف محکموں کے سکرٹری اور چیف کورٹ کے جج۔ اور وہ خود۔ یعنی آنریبل ایمر والفرڈ رکسیٹن لیکن جیرلڈ جو اس مخصوص اعلیٰ ترین برطانوی حاکموں کے گروہ کا ایک اہم رکن تھا۔ اب دفعتہً اس گروہ سے علیحدہ ہو کر ان ہندوستانیوں میں گویا رشتے دار کی حیثیت سے شامل ہو گیا تھا۔ وہ ـــ کتنی شدید حماقت۔ کس قدر ناقابلِ معافی جرم۔

وہ اسی طرح دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

اس وقت اسے دوبارہ بے حد شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ وہ دراصل ان سانولے ہندوستانیوں کی زندگی سے، خود ان سے کس قدر الگ ہے۔ اس کی اور ان

سب کی شخصیت کی کیفیتوں میں کتنا ناقابلِ عبور بعد ہے اور میرا لنی راجونش کے باوجود یہ پائز قائم رہے گی۔ وہ خود زندہ رہے گا۔

میرا دوسرے سرے پر کھیل کی تنظیم میں مصروف تھی اور غل مچا رہی تھی۔ اس کے بالوں میں موگرے کے پھول تھے اور اس نے نارنجی رنگ کی ساری پہن رکھی تھی۔ کیشو کے مندر کی کسی دیوداسی کی طرح اس کی پیشانی پر حسبِ معمول کُم کُم تھی اور آنکھوں میں کاجل کی بڑی سی لمبی لکیر۔ اپنی شدید معصومیت اور گریس کے ساتھ وہ گھاس پر بچھے ہوئے قالین پر ادھر ادھر چل پھر رہی تھی۔

"ڈیئر چلو فوراً دائرے میں شامل ہو —— تم کو الامپور ہو —— جنرل پوست لاافس تالی بجا کر اس نے اناؤنس کیا۔

لندن برج از فالنگ ڈاؤن —— فالنگ ڈاؤن —— کسی نے لاؤڈ اسپیکر پر فارم یارڈ دھنی لگادی —— لندن برج از فالنگ ڈاؤن۔

علی لان کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا رہا۔ سارے مہمان رخصت ہوچکے تھے۔ باغ میں رات کا سناٹا چھا رہا تھا۔ درختوں میں اکا دکا کاغذی قندیلیں دھیرے دھیرے جھول رہی تھیں۔ میرا کو اس نے ملول نگاہوں سے دیکھا جو میزوں پر سے نیپکن اور دوسری چیزیں تندہی سے سمیٹتی پھر رہی تھی۔ اس کا دل دھڑکتا رہا۔ میں اپنے آپ کو اس شدت سے کمزور اور غیر محفوظ کیوں محسوس کر رہا ہوں —— خداوندا —— اس نے صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر رات کے آسمان کو دیکھا۔ جہاں ہر سمت تاریکی اور خلا تھا۔ عالمِ لاہوت۔ بہت خوب۔ اس غیر شخصی خدا کے تصور کے مقابلے میں اس کو مجسمے کی شکل والے کیشو کا

خیال زیادہ بھلا اور طمانیت بخش معلوم ہوتا۔ خدا۔ مختلف، متضاد خدا۔ مختلف متضاد قوموں اور نسلوں کا تصور۔۔۔ میرے لئے تو سینٹ آگسٹین کے اعتراف بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوئے جو ایلٹر نے اس قدر وثوق کے ساتھ پڑھنے کو دیئے تھے۔ کیا زندگی ہے ماشاءاللہ سے۔ اس نے چاروں اور دیکھا۔ کس خوبصورتی سے ہم سب اپنے آپ کو قتل کر رہے ہیں۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔ ختم ہو رہا ہوں۔ اس نے پھر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ کیا میں اسی طرح ضدی بچوں کی مانند چپکے چپکے روتے روتے اپنی عمر بتا دوں گا۔ اس نے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کی اور ان آنسوؤں کے دھندلکے میں سے اسے پھر میرا نظر آئی۔ فواد بہت دور پھولوں کے نزدیک کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

پچھلے دس سال سے میرا فواد کو پسند کرتی ہے اور اس لئے اس نے برہم پتر اور گوداوری کے ناچوں میں ۔۔۔ اپنے آپ کو کھو دینا چاہا ہے۔ فواد نسیم احمد۔ علی نے دل میں اسے مخاطب کیا۔ خیالات کی افیم کھا کھا کر اپنے آپ کو ڈورماؤس کی طرح سلا کر یقیناً تم کو کچھ بہت زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ خیالات کی افیم میں نے بھی کھائی۔ لیکن اب مجھ میں برداشت کی ہمت نہیں۔

گھاس کے دوسرے سرے پر میرا نے اپنے جوڑے میں سے موگرے کے گجرے نکال کر پھینک دیئے اور ایک گلدان میں سے دو تیز سرخ گلاب بالوں میں اڑس کر ہنستی ہوئی دوسری طرف چلی گئی ۔۔۔ دفعتہً علی کا سر چکرایا۔ اس کے سامنے یہ میرا اُلٹی گھوم رہی ہے جس نے بالوں میں گلاب کے پھول سجائے ہیں اور سرخ زرتار لہنگا پہنا ہے۔ جس کی مانگ میں سیندور اور افشاں چنی ہے۔ جو نقرئی کردھنی اور پیروں میں گھنگنلا پازیب پہنے آہستہ آہستہ منڈپ کی طرف جا رہی ہے اور چاروں اور شعلے لپک رہے ہیں۔

اور شادی کے مہمان اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے سر اٹھا کر آدھی رات کے آسمان پر ان دو ستاروں کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، جن کی اور ہندوستان کے سارے پہاڑوں جنگلوں اور مقدس دریاؤں کی گواہی پر پنڈت میرا کا بیاہ کسی اجنبی سے کر رہے ہیں۔ جو میرا کا ہم قوم اور ہم مذہب ہے۔ اور بڑی دور سے، تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھے اور پگڑی باندھے اسے بیاہنے آیا ہے اور برآمدے میں لڑکیاں گا رہی ہیں ___ لائے ہمارا جی ہمیں محل پر کرکے۔۔۔

جاڑوں کی سہ پہروں میں کتنی بار، گھر کے سیب کے درخت کے نیچے بیٹھ کر میرا سے اس نے ہمیشہ کتنی دنیا جہان کی باتیں کیں۔ اس کو اپنے دکھ سکھ کے قصے سناتے جنہیں میرا نے اس پیار، اس صبر اور تحمل سے سنا جس طرح صرف ایک بہن ہی سن سکتی ہے

لان پر سے ایمبر کی آواز آئی۔ وہ غالباً کسی اور انگریز سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ علی نے آنکھیں بند کر لیں۔ گرمی ___ ہوا میں خنکی نہیں ہے۔ اسے خنکی چاہیئے۔ راج محل کے باغ کی ٹھنڈک، آشیانے کے اور چڑو کا سکون۔ پیچھے مسوری کے پہاڑوں پر برف گرتی ہو۔ میرا سیب کے درخت کے نیچے بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہے۔ اب جاڑوں اور برف بھی گئی اور میرو پہاڑ کے ایک برف پوش گرجا کے دروازے میں سے ایک سفید فام شخص کے ساتھ باہر نکل رہی ہے اس نے سفید ساری اور ویل پہن رکھی ہے اور اس کے ہاتھ میں نارنگی کے شگوفے ہیں۔

گھاس پر دو سفید فام انسان ایک دوسرے سے نیچے، مہذب، باوقار لہجے میں باتیں کر رہے ہیں۔

"کس قدر حماقت ___ کس قدر شدید توہین۔ لیکن امپائر زندہ رہے گی ___ ضرور زندہ رہے گی ___" یہ ایمبر کی آواز تھی۔

علی دفعتہً آگ بگولا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی دیر سے، اتنے عرصے سے جتنا غصہ اور جھنجلاہٹ اس کے سارے اعصاب پر چھائی ہوئی تھی، وہ سمٹ کر اس کے دماغ میں آگئی۔ لمبے لمبے قدم رکھتا وہ ایلمر رکیسٹن کے نزدیک آیا اور چند لمحوں تک لیے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

صوفوں کے دائرے کے پہلو میں فانوس کے نیچے شام کی پارٹی کے لیے جو عارضی بار بنائی گئی تھی۔ ایلمر اس کا سہارا لے کر کھڑا رہا۔ علی کو وہ حسب معمول بے حد محبت سے دیکھ رہا تھا۔ بار کی میز پر فواد آ کر چپکا بیٹھ گیا تھا۔ راحیل اور اردن گھاس پر دو زانو جھکے برف کی بالٹیوں کو خالی بوتلوں سے پُر کرنے میں مشغول تھے۔ اشیلا اور میرا نیپکن تہہ کرتے کرتے رک کر علی کو اور ایلمر کو دیکھنے لگیں۔ فضا میں یک بیک جو کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا، جو ساری شام ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر غیر شعوری طور پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ بڑھ گیا۔

یک لخت علی نے ذرا آگے بڑھ کر ایلمر کی ناک پر ایک گھونسہ رسید کیا۔

ایلمر کی آنکھوں کے آگے تارے ناچے۔ وہ اس غیر متوقع گھونسے کی تاب نہ لا کر ایک بار چکرایا اور پھر سنبھل کر صوفے پر بیٹھ گیا ۔۔۔ اور اسکول کے کسی لڑاکا بچے کی طرح جس کو اچانک شکست کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس نے علی کو آنکھیں پھیلا کر حیرت سے دیکھا۔

"علی:" اردن نے پیچھے سے آ کر رسان سے علی کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ "شاید ہم سب نے آج شام ضرورت سے زیادہ وہسکی پی لی ہے اور اس کے علاوہ شاید تم کو سائیکو انالسس کی بھی ضرورت ہے ۔۔۔ گو میں خود سائیکو انالسس کے

قابل ہوں۔" اس نے ذرا آہستہ سے بے حد انکسار سے اضافہ کیا۔ "دراصل تمہاری سائیکولوجی برباد، تباہ ہو گئی ہے بالکل۔"

علی نے اروِن کی بات کا قطعی نوٹس نہیں لیا اور پھر شعلہ بار آنکھوں سے ایلمر سے مخاطب ہوا۔ "ساتھ ساتھ تم میرا سے عشق بھی لڑانے لگے ہو۔۔۔ وہ دہاڑا۔۔۔ "اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔ نکلو میرے گھر سے۔"

"لیکن یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔۔۔ علی۔" ایلمر نے ناک کو چھوتے ہوئے رسان سے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" علی پھر گرجا۔۔۔ "یہ میرا گھر ہے۔ میرے ماموں کا گھر ہے۔ چلو۔۔۔ باہر جاؤ اسی وقت۔"

"تمہارا کوئی گھر نہیں ہے علی بہادر۔۔۔" ایلمر نے ٹھہری ہوئی آواز میں جواب دیا ۔۔۔ "یہ سارے گھر میرے ہیں۔ یہ ساری زمین میری ہے۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ یہ سارا ملک میرا ہے اور میرے باپ کا ہے۔ تمہارا تو کچھ بھی نہیں ہے علی بہادر۔"

علی نے اور قریب آ کر لیک اور گھونسہ ایلمر کی ناک پر لگایا۔

ایلمر صوفے کے تکیے کا سہارا لے کر آہستہ سے اٹھا۔ "پیارے علی بہادر تم کو یقیناً رنج ہو گا کہ تم نے مجھے نکالا۔ تم میرے دوست ہو۔۔۔ خدا کی قسم تم میرے اتنے چہیتے دوست ہو۔" اس نے بڑی معصومیت اور ملال سے کہا اور اپنے سفید دستانے اٹھانے کے لئے میز کی طرف بڑھا۔ "تم سب دراصل میری روح میں گھس گئے ہو۔۔۔ میں تم کو اپنے سسٹم میں سے نہیں نکال سکتا۔۔۔ میں رو رہا ہوں۔"

اس نے بالآخر طے کیا اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"ٹھہر جاؤ ایلمر ۔۔۔" صوفے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے یرا نے بشاشت سے کہا۔ "اب میں تم سے واگز سنوں گی۔ تم میرے لئے واگز بجاؤ۔ برائیڈل مارچ"

"برائیڈل مارچ ۔۔" ایلمر نے اداسی سے دہرایا۔

"ہاں۔ ہم سب تم سے واگز سنیں گے ایلمر ٹمپیشن ۔۔۔" اسٹیلا نے اتفاق ظاہر کیا۔ وہ سب صوفوں کے گرد جمع اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ رات کی ہوا نے درختوں میں سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔

ایلمر ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا پیانو کے قریب گیا۔ جو شام کی پارٹی کے لئے ایک درخت کے نیچے وہاں رکھا گیا تھا۔ بیدلی سے اس نے پردوں کو چھوا۔

میرا صوفے کی پشت پر جھکی اسے دیکھتی رہی ۔۔۔ میری دنیا میں تم کو سکھ نہیں ملیں گے ایلمر ٹمپیشن ۔۔ "تمہاری وہ انگوٹھی کہاں گئی ایلمر ۔۔۔ وہ مسخرے پن کے طغرے والی ۔۔" میرا نے سیاہ و سفید پردوں پر رکھی ہوئی اس کی انگلیوں کو دیکھ کر آہستہ سے سوال کیا۔

"جہنم میں ۔۔۔" وہ دفعتہً غرایا ۔۔۔ پھر اس نے رک کر انگوٹھی اتاری۔ "میں بصد ادب و احترام اسے تمہاری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ کماری میرا غنی ۔ اب تم اسے جا کر اپنی رام گنگا میں یا گومتی میں پھینک آؤ ۔۔۔ اس کا وہ طغرہ میرے کسی کام کا نہیں رہا۔"

میرا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی

"تم سب پر خدا کی لعنت ہو ۔۔۔" ایلمر نے اسے دیکھ کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "اتنی مدت تک میں تمہارا ۔ ۔ تہ نہایت اعلیٰ و ارفع پیمانے پر بی ہیو کرنے کی کوشش میں مصروف ۔ ا ۔ ۔ تم انداز ۔ ۔ کی دیوبالا ہیں۔ لیکن آج میں تم کو بصد حسرت و یاس خدا حافظ کہتا ہوں ۔ ۔ ۔ تم رہتے ۔"

"دراصل ہم سب پر دہسکی کا بہت زیادہ اثر ہوگیا ہے۔ چلو یہاں سے کلب چلیں" اروِن نے ایلمر سے بے حد شگفتگی سے کہا۔

"ہلو اروِن رابونش"۔ ایلمر نے پیانو کا اسٹول پیچھے سرکاتے ہوئے اروِن کو اجنبی نگاہوں سے دیکھا: "تمہاری جھیتی، تمہاری آئیڈیل، اور تمہارے خیالات کے سورگ کی مالتی لیلیٰ بلگرامی کہاں ہے؟"

اروِن کا رنگ دفعتہً زرد پڑ گیا۔ جیسے اسے بیحد تکلیف پہنچی ہو۔

ہم سب بالکل کنارے پر کھڑے ہیں اور چاروں اُور کی منڈیریں ٹوٹ ٹوٹ کر پانی میں گر رہی ہیں ـــــ اسٹیلا نے دفعتہً آنکھیں مل کر گھبرائی ہوئی آواز میں اپنے آپ سے کہا۔

"چپ رہو ایلمر رکسٹن"۔ اروِن نے کہا۔

"پچھلے ڈھائی سال سے، جب سے لیلیٰ بلگرامی کی شادی ہوئی ہے اور تم نے اسے دیکھا ہے۔ تم اس سے شدید قسم کے ذہنی اور جذباتی عشق میں مصروف ہو۔ تمہاری شخصیت کی Integration کا کیا انجام ہوا؟" ایلمر نے اسی آواز میں پوچھا

"اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو تم لوگ ــــ" اسٹیلا نے یکلخت بے حد پریشان ہو کر کہا۔ "تم نے اپنا توازن کہاں کھو دیا ــــ؟"

"اگر تم خاموش رہو تو کتنا بہتر ہو کزن اسٹیلا"۔ اچانک راحیل نے جھنجلا کر پہلی بار بات کی ــــ "تم کو کاہے کی فکر ہے۔ تم اپنے باپ کے گھر میں، اپنے خاندان کی حفاظت میں زندہ ہو۔ پس منظر میں تمہاری اونچی تعلیم ہے معظم منزل ہے۔ تمہارے باپ کا عہدہ ہے۔ اوپر سے تم لیڈی اسٹیلا رکسٹن کی گوڈ چائیلڈ ہو۔ کیا تم نے کبھی نجم الدولہ پارک

میں رہتے ہوئے کسی دھندلے تصور تک پہنچنے کی کوشش کی؟ کیا تم نے کبھی اس فاصلے کو ناپنے کی سعی کی جو اتنے قرب کے باوجود مذہب اور فرقے نے نمبر اکیس اور نمبر بائیس یا نمبر بائیس اور نجم الدولہ ہاؤس کے درمیان قائم کر رکھا ہے اور جس فاصلے کے ایک سرے پر میرا کو اپنی عمر بتانی ہے ــــ؟ توازن ـــ! توازن کے بنا تو تم ایک لمحہ بھی نہیں جی سکتیں پچھلے اڑتالیس گھنٹوں تک تم سب کے عزیز دوست ریاض الدین احمد تمہارے ساتھ تمہاری معظم منزل میں مہمان رہے۔ تم لوگوں سے جو ناقابل بیان چڑ ان کو ہے اور جس حقارت سے وہ تم سب کو دیکھتے ہیں۔ تم اپنے تہذیبی رکھ رکھاؤ اور توازن کی وجہ سے اس کا اندازہ کبھی خود کو نہ ہونے دو گی۔ کیونکہ اسی ظاہرا توازن اور اخلاق سے وہ تم سے ملتے ہیں، لیکن چیزوں کے اس آخری وژن تک پہنچتے پہنچتے درمیان کی نیلاہٹ ختم ہو جاتی ہے ــــ میرے اور اس وژن کے درمیان جو چیزیں ہیں، ان کو تم نے کبھی نہیں دیکھا ــــ راحیل نے دل میں کہا۔

سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ باغ کے تاریک درخت ہوا میں سرسرا رہے تھے۔

"ریاض آج یہاں پارٹی میں نہیں آئے ــــ؟" راحیل نے باآواز بلند سوال کیا۔

"نہیں ــــ" فواد نے جواب دیا۔ "گوپال پور سے لوٹ کر سہ پہر کو وہ خیض آباد روڈ سے "ہاؤس" لباس تبدیل کرنے کے لئے چلے گئے تھے۔ اس کے بعد یہاں آنے کے بجائے وہ دلکشا کلب گئے اور وہاں یہ ساری شام انہوں نے بار پر بیٹھ کر گذاری۔ اب پتہ نہیں وہ کہاں ہیں ــــ لیکن تم کو ریاض کی اتنی تلاش، اتنی فکر کیوں ہے راحیل بیگم ــــ؟" فواد نے چونک کر اسے مخاطب کیا۔ "ہم سب کو صرف اپنی اپنی فکر ہونی چاہئے مجھ سے تم ریاض کے متعلق کیوں پوچھتی ہو ــــ میں اپنے بھائی کا کیپر نہیں ہوں۔ میرا

بھائی میرا کیپر نہیں ہے — علی آؤ ہم اور تم مل کر ذرا رو لیں۔" اتنا کہہ کر فواد، علی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر رونے میں مصروف ہو گیا۔

"بہت دنوں بعد یہ لوگ اتنے ٹپسی ہوئے ہیں"۔ عالیہ باجی نے برآمدے میں سے گذرتے ہوئے لان کی طرف دیکھ کر کسی سے کہا اور پینٹری کی سمت چلی گئیں۔

فواد آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں سے ہیرا کو دیکھتا رہا۔" ہیرا رانی میں تمہارا راجکمار کنال ہوں۔ مہاراجہ نل ہوں۔ تمہارے گوکل کا گوالا ہوں۔ لیکن تم تو ایلمر کی کشش سے بھی انکار نہیں کر سکتیں۔ اپنے شخصیت کے مکمل پن کو قائم رکھنے کی اس سعیٔ لاحاصل کو چھوڑ دو۔ میں مہاراجکمار کنال ہوں۔ لیکن تم میری آنکھیں نکال دو۔ میری آنکھیں نکال دو"

نالسے میں لٹکی ہوئی ایک جاپانی قندیل زور سے ہوا میں ہلی اور اس کی روشنی میں سب کے چہرے ایک لحظہ کو جھلملا اٹھے۔

پھاٹک کے باہر خاموش سڑک پر ایک آہٹ ہوئی۔

"اب کون آیا ہے؟" اسٹیلا نے کہا

ہیرا ایک جمائی لے کر صوفے کے ہتھے پر سے اٹھی اور پھاٹک کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کوٹھی کی روشن کھڑکیاں جیسے گویا اسے مستقل ونک کر رہی تھیں۔ وہ ذرا خوفزدہ سا ہو کر درختوں کے سائے میں آ گیا اور پھاٹک میں داخل ہو کر لان کی جانب بڑھا۔ اس کوٹھی کی روشنیاں، لان کی مدھم قندیلیں، آسمان کا رنگ۔ ہر چیز اسے بیحد تھیٹریکل معلوم ہوئی۔ گویا پردے کی کینوس پر بے حد صاف رنگوں سے بڑی احتیاط کے ساتھ سارا منظر پینٹ کیا گیا ہو۔ گھاس پر کوئی آہستہ آہستہ واگز بجا رہا تھا۔ گویا کسی اوڈی ٹوریم کی اوپر

کی گیلری میں سے یہ منظر ڈایریکٹ کیے جا رہے ہوں اور ہر بار آرک لائٹیس ہر زاویے سے اسی پر ڈالی جا رہی ہوں۔ وہ پھر خائف ہو کر ایک درخت کے نیچے ٹھٹک گیا۔ آج سے برسوں قبل دیکھی ہوئی "کو الٹی اسٹریٹ" کی یاد اس کی ذہن میں کوندی۔

سامنے میرا ملنی موجود تھی۔

"آپ نے مجھے مدعو کیا تھا۔" اس نے اخلاق سے جھک کر میرا سے کہا۔

"میں نے آپ کو بلایا تھا۔؟" میرا نے دہرایا۔

"جی ہاں — !!" ریاض نے کہا

"میں نے آپ کو بلایا تھا؟" میرا نے دماغ پر زور ڈال کر پھر سوچا — "ضرور تشریف لیے۔ یہاں اس وقت بڑی فرسٹ کلاس پارٹی ہو رہی ہے۔" اس نے صوفوں کے حلقے کی طرف اشارہ کر کے کہا اور اسی طرح منقے پر بیٹھی رہی۔

ریاض گھاس پر آ کر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ ریاض الدین احمد ہیں —؟" میرا نے جھک کر وثوق سے کہا۔ "ان ادا اس زمانوں میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ہم ان انسانوں سے ملیں جن سے دوبارہ ملنے کی کبھی خواہش ہوئی ہو —" پھر یکلخت اس کے قریب آ کر میرا نے اس سے کہا۔ "میں اپنا انتظار کر رہی ہوں۔ میں میرا ملنی راجونش ہوں، جو سیاہ کلوک پہنے ایک روز سامنے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوں گی۔ مدتوں سے مجھے اپنے آپ سے ملنے کی آرزو رہی ہے اور ایک سیارہ دوسرے سیارے سے کتنا دور ہے۔ میں نے آپ کو مدعو کیا ہے۔"

"ہم پھر کنارے پر آن کھڑے ہوئے ہیں۔ خداوندا —" اسٹیلا نے اپنے

آپ سے کہا۔

میں بھیگی چھتوں پر برستی چاندنی اور گیلی چمنیوں پر منڈلاتے کہرے کو یاد کرنا چاہتی ہوں اور راج محل کے پیچھے پھیلی ہوئی برف کو۔ دماغ کا سکون کہیں نہیں ہے پیرآ نے آنکھیں بند کر کے بات کی۔ خدا کے لئے مجھ سے نہ کہو کہ اس کمبخت دنیا میں میں ہی تنہا زندہ ہوں باقی سب مر چکے ہیں۔ میرا خرگوش تاک جو اگر کبھی کبھی ریس کورس جا کر ہیری کے گھوڑوں میں دلچسپی لے سکتا اور وہ اگر بجا سکتا تو نہایت مکمل ہستی ہوتا ـــ تم لوگ تو خرگوش بھی نہیں ہو ـــ پیرآ نے افسردگی سے کہا۔ ایک مرتبہ وہ اس مشہور رقاص سے ملی تھی جس کو وہ برسوں سے ایڈمائر کرتی آئی تھی۔ لیکن جب اس سے ملاقات ہوئی تو اسے پتہ چلا کہ وہ کتنی غلط انگریزی بولتا تھا اور کتنا لالچی تھا اور اس کی بڑی بہن اندرا کی منگنی ہو گئی تھی اور تب سے وہ ہر نوجوان سے نہایت خود اعتمادی اور مادرانہ شفقت کے ساتھ ملتی تھی اور دنیا میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ پہ خوش تھے۔ اس نے آنکھیں آدھی کھول کر رنج سے پاشا کو دیکھا۔ کیا اس انسان کی کوئی فطرت نہیں ہے۔ کوئی مزاج نہیں ہے۔ کوئی طبیعت نہیں ہے؟ کیا وہ بھی محض ایک اور فارمولا ہے ـــ کم از کم تم راحیل کو لے کر کہیں بھاگ ہی جاؤ ـــ راحیل دوسرے صوفے پر خاموش بیٹھی قندیل کو دیکھ رہی تھی۔ راحیل تو مستقل سب کو معاف کرتی رہتی ہے۔ اس کی زندگی ایک مسلسل ثواب، مسلسل ذہنی اور روحانی کیفیت ہے۔ تم بھلا کیا بھاگو گی۔ اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

"آپ نے اپنے دوستوں کو تمام بجیر بھی نہیں کہا" پیرآ نے علی، شیلا اور جعفر کی طرف اشارہ کر کے ریاض کو مخاطب کیا "یہ ایک بے حد مقدس خاندان ہے ـــ ہولی فیملی ـــ" اس نے سنجیدگی سے صلیب کا نشان بنایا۔

ایلمر پیانو پر سر رکھے بیٹھا رہا۔

علی اپنی کرسی پر سے اٹھا اور ایلمر کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"ایلمر۔ میں نے ابھی تم کو مارا تھا۔" اس نے بچوں کی طرح بے حد وثوق سے اسے اطلاع دی — اور بڑے پیار سے اسے دیکھتا رہا۔

"آج کلب میں تذکرہ ہو رہا تھا کہ آپ "کلپنا" میں حصہ لے رہی ہیں۔" ریاض نے اخلاقاً گفتگو شروع کرنے کی سعی کی۔

"جی ہاں"۔ تیرا نے آنکھ کھول کر جواب دیا۔ "شنکر دادا نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا رانی تم کو "کلپنا" میں ضرور ناچنا پڑے گا۔ ہم مدراس جا رہے ہیں — مدراس سے کوالالمپور کتنی دور ہے — اور بولیویا —؟" اس نے استفسار کیا۔

"جی —؟" ریاض نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا

راحیل نیپکنوں کے انبار اٹھا کر کوٹھی کی طرف چلی گئی۔

"راحیل بیگم —" ریاض نے کہا "کیا تم پدما کے تصور کا — نعم البدل، بن سکو گی — تم میرے دماغ کی عجیب و غریب عورت ہو — میں تم کو بھولنا نہ چاہوں گا۔ لیکن شاید میں تم کو کل ہی بھول جاؤں۔"

"ابھی ابھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں پھر گوپال پور میں ہوں، جہاں میں آج صبح گیا تھا"۔ ریاض نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہاں میں نے آپ کے مچھلی کی شکل والے خدا کو دیکھا —"

"گوپال پور —؟" میرا نے چونک کر برا مانتے ہوئے پوچھا۔ "گویا آپ کو گوپال پور جانے کی کیا ضرورت تھی۔ گوپال پور صرف ہماری چیز ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں۔

"سنیئے"۔ نیرا نے جھک کر رسان سے اس سے کہا۔ "آپ راحیل سے شادی کر رہے ہیں ــــ؟"

"جی ــــ؟ جی ــــ غالباً نہیں"۔ ریاض نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

آپ شاید کل یا پرسوں صبح دلّی، لاہور، اپنی دنیا، اپنے دیس واپس چلے جائیے گا۔ آپ نے ہمارا یہ خودکشی کا دور دیکھا اور محظوظ ہوئے۔ کچھ عرصے بعد آپ کسی چمکدار پرم کئے ہوئے بالوں والی لڑکی سے شادی کر لیجیے گا اور رات کو کلب سے دیر میں گھر لوٹا کیجیے گا ــــ ہم سب ایک بہت پریشان کن سوال تھے۔ ہمیں آپ بہت جلد بھول جائیں گے اور چند سالوں بعد آپ کا تذکرہ "ہوز ہو" میں مع آپ کی تصویر، کلب کے پتے اور ہوبیز کے، چھپے گا اور آپ کی بیگم صاحبہ تقسیم انعامات کے جلسوں میں صدارت کے لئے بلائی جائیں گی ــــ اور میرے پاس ایک نیلا سوٹ کیس ہے جس کو لے کر شاید میں کہیں چلی جاؤں۔ ہم کنارے پر آ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن اب واپس چلے گئے ــــ اس نے اسٹیلا سے کہا۔

"خدا حافظ میرا راجونش ــــ خدا مجھ پر رحم کرے"۔ ایلمر نے پیانو پر سے سر اٹھائے بغیر دہرایا۔

"بھیڑیے ــــ عمر بھر بھیڑوں کے ساتھ رہنا ــــ بھیڑیا اور خرگوش"۔ نیرا نے ایلمر کو دیکھ کر حقارت سے کہا۔ "میں تم سے بھی نفرت کر سکتی ہوں ایلمر ریکسیٹن ــــ" وہ اٹھ کر اس کے پاس گئی ــــ "تم نے بنے بھائی کو قید کروایا تھا۔ تم نے علی کو دو سال کی سزا کی تھی۔ ــــ تمہارے ضمیر سے لان پر ٹہلتے ہوئے کلب میں، ریس کورس پر، اکثر ملاقات ہوئی۔ تمہاری برطانوی اصول پرستی اور تمہارے ضمیر دونوں سے، تم کتنے کمینے انسان ہو ــــ

تم نے علی کو جیل بھیجا تھا"

"علی کو۔" الیسٹر نے دفعتہً مفلوج سا ہو کر کہا۔ "علی کو۔" اس نے اپنی جیب میں لرزاں انگلیوں سے کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جس وقت میں یہاں آرہا تھا چپراسی نے مجھے یہ کاغذات لاکر دیئے جو تمہارے کزن نواب رضا قاسم نے خاص طور پر جانے کس لئے مجھے بھجوائے ہیں۔ دراصل کھن کھن جی نے دیوانی کی عدالت کے ذریعے نوٹس دیا ہے"۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک لفافہ علی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ "مسماۃ سیدہ عالیہ بیگم اور علی بہادر" ۔۔۔ وہ پریشانی سے دوسری جانب دیکھنے لگا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر ساکت رہ گئے۔

عالیہ باجی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھاس پر آئیں۔ "آم کے باغات کی ضمانت پر چالیس ہزار روپے کی دستاویز لکھی گئی تھی۔ اس کی ادائیگی اب تک نہیں ہوئی۔ معظم منزل کے رہن کی رقم سود در سود ملا کر اصل سے تین گنی ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی میعاد ابھی باقی ہے۔ علی کے نام یہ نوٹس دستاویز کے متعلق ہے۔ اگر پچاس ہزار کی رقم اگلے ہفتے تک ضمانت کی تو داخل کی گئی تو۔۔۔" اسٹیلا رک گئی۔

"تو سنٹرل جیل؟" علی نے پرسکون آواز میں ذرا مسکرا کر دریافت کیا۔ اب وہ بالکل سویرا ہو چکا تھا۔ تم کو معلوم ہوگا۔ اس ملک کے جیلخانوں سے ہم لوگوں کے بہت دیرینہ مراسم ہیں۔ سیاسی۔ معاشی۔ مذہبی ۔۔۔ قومی ستیہ گرہ۔ سن بیالیس کا اندولن دیوانی اور فوجداری کے مقدمے۔ تبرا ایجی ٹیشن ۔" اس نے جھک کر ریاض کو بتلایا۔

"تبرا ایجی ٹیشن ۔۔۔؟" ریاض نے استعجاب سے سوال کیا۔

"ہاں یہ ۔۔۔ ہمارے کے یہاں کی خاص سیاست تھی۔" علی نے انکسار سے مطلع کیا

میرا پھیلی ہوئی آنکھوں سے سب کو دیکھتی رہی ــ جب انسان بالکل ڈھ بنے لگے تب غالباً مشیت کا مذاق اڑا کر خود کو مطمئن کرنے کے لیے ہنستا ہے۔ علی کی پلکیں اب تک بھیگی ہوئی تھیں۔ لیکن اب وہ ہنس رہا تھا۔

"ہم اپنے بڑوں کو قطعی اس سانحے کی خبر نہ ہونے دیں گے۔ جہاں تک ممکن ہوگا۔" جعفر نے آہستہ سے عالیہ باجی سے کہا

"اور کل وہ انجینئر صاحب آنے والے ہیں جن سے شادی کے لئے باجی مستقل انکار کر رہی ہیں۔" اسٹیلا نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"بجیا۔ تم ان چیندہ اس سے شادی کے لئے تیار تو نہ ہو جاؤ گی؟" علی نے گھبرا کر پوچھا وہ سب آہستہ آہستہ قدم رکھتے کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

ایلمر ملول نگاہوں سے ان کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ ریاض اور فواد کچھ دیر قبل "ہاؤس" جا چکے تھے۔

"خدا حافظ میرا راجونش ــ خدا حافظ علی ــ میں بے حد کمینہ انسان ہوں۔ میں بالکل واش آؤٹ ہوں۔ خدا مجھ پر رحم کرے۔" اس نے بیحد خلوص کے ساتھ کہا اور عارضی بار پر سے ایک اور بیئر کا مگ اٹھایا۔

"علی میرے عزیز ــ میرے دوست" ــ اتنی دیر بعد پہلی دفعہ یکایک نہا رہ جانے کا اسے احساس ہوا۔ اور اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ علی۔ میرا۔ اِن دِن ارنسٹ۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک رو کوندی۔ ارنسٹ ــ تم سب میرے کتنے پیارے ہو ــ پیلے بالوں اور شفاف نیلی آنکھوں والا میرا پیارا ارنسٹ برومیل ــ کھلی ہوا ہرے

میدانوں اور پائن کے عمیق جنگلوں کا بیٹا۔ جس نے ہائنے کی شاعری سے عشق کیا اور ہندوستان کے رقص کو سنوارنے کی سعی کی۔ سات سال تک وہ نظر بند رہا اور کیمپ میں اسے ٹی۔بی ہو گئی۔ ارنسٹ۔ میرا عزیز ترین دوست جو میرا بدترین دشمن بھی ہے۔ ارنسٹ۔ اگر اب تم بھی مجھ سے ملو تو کیا تم بھی میری ناک پر گھونسہ مار دو گے — میں نے تم کو وہاں قید نہیں کیا تھا — گو میں بے حد کمینہ ہوں — میری دلی تمنا ہے کہ ایک ایک کر کے تم سب کا خاتمہ ہو — تم سارے جرمن سوروں کا — وہ آنسو بہاتا رہا۔ پیانو پر بیٹھ کر اس نے پھر انگلیاں چلانے کی کوشش کی — ارنسٹ بروئیل تم کہتے تھے نا کہ ہم انگریز بیتھوون کی روح میں داخل نہیں ہو سکتے — وہ موسیقی کے اوراق الٹتا پلٹتا رہا — سوناٹا — منیوٹ — فیوگ — اگر میں اس وقت بجانا بھی چاہوں تو میری انگلیاں کام نہیں کریں گی۔ میری انگلیوں کی، میری ساری روح کی شکتی علی رضا میرا اور ارنسٹ ان سب نے مل کر سلب کر لی ہے — علی — میرے پیارے دوست علی — ارنسٹ تم دونوں میرے عزیز ترین دوست ہو — میرے ازلی، شدید ترین دشمن ہو — میں اپنے الطار پر تم دونوں کی تصویریں سجاؤں گا۔

رات کی ابدی تاریکی سارے میں پھیل گئی۔

لیکن اگلی گرمیاں۔ اگلی صبحیں اور شامیں۔ اگلی پھواریں —

باغ زندہ رہا۔

۳۴

رفتہ رفتہ سارے میں یہ گھور اندھیرا چھا گیا۔ کائنات پر ابد کی رات کی تاریکی پھیلتی چلی گئی۔ کرمن کی گت نیاری رے اودھو۔۔۔ پچھلے برآمدے میں اندر اراجونش مدھم سروں میں گا رہی تھی۔ دروازوں کی چوکھٹوں میں بندھن وار باندھے گئے تھے۔ کیا اب میری لگن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا۔

شاید تمہاری لگن تو نہیں ہوگی۔ لیکن تمہارے باباجن سے تم کو اتنی محبت ہے، مر جائیں گے۔ کسی نے چپکے سے اس کے دل میں کہا اور ان کی اس بیماری اور ممکن موت کی وجہ تم خود ہو گی۔ یہ بھی تم جانتی ہو۔ تم نے ایک سرکش خود سر لڑکی کی طرح ان کے پسند کے لوگوں سے بیاہ کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ تم تو پونم و شاریہ کا بھی مذاق اڑاتی ہو۔ تم اپنے باپ کی مجبوریوں کو نہیں پہچاننا چاہتیں۔ تمہاری ان کو ستاؤں سے بھلا تمہارے باپ کو کیا سکھ پہنچا۔۔۔؟

"کیا بابا مر جائیں گے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کرمن کی گت نیاری۔ برآمدے میں آندرا نے دہرایا۔

سیڑھیاں طے کر کے وہ باغ کی باڑھ کے پاس آئی اور وہاں سے اس نے دیکھا کہ علی کے کمرے میں ابھی روشنی ہو رہی ہے۔ باڑ پر سے اتر کر وہ حسبِ معمول نمبر اکیس کے احاطے میں داخل ہوئی۔ علی کے کمرے کی فرینچ کھڑکی کے شیشوں میں سے وہ لوگ نظر آرہے تھے۔ وہ سب ایک میز کے گرد بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ میرا کھڑکی کے نیچے سائے میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اندر جانے کی ہمت اس نے اپنے میں نہ پائی۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں اپنے لئے، علی کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ اس نے خود سے سوال کیا اور اندر کی باتیں سنتی رہی۔

"اب کیا کیا جائے۔" جعفر نے کہا

"سنا ہے ان سب قصوں سے گھبرا کر رضا بھائی یا انجینئر صاحب کا پیغام منظور کر لیا جائے گا۔" میں نے غصے سے کہا۔

"ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔" اسٹیلا نے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

فانوس اپنی مدھم روشنی سے دیواروں پر دھبے پھیلاتا رہا۔

"ڈیڑھ لاکھ۔ یعنی ایک لاکھ پچاس ہزار سب ملا کے۔ تقریباً پچاس ہزار ضمانت" جعفر نے انگلیوں سے چادر پر دائرے بناتے ہوئے کہا۔ "آپ کو معلوم بھی ہے یہ رقم کتنی ہوتی ہے۔"

"اگر علی نے آج تک کچھ کیا ہوتا۔ وہ کیوں ہر چیز میں اتنا ناکامیاب رہا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "اور ابھی نہ ہم کمپنیوں کے حصے فروخت کر سکتے ہیں۔ نہ ان کا منافع حاصل

کر سکتے ہیں۔ نہ کیش سے پیسہ نکلوا سکتے ہیں۔ ورنہ ایک ہی دفعہ میں ساری رقم اطمینان سے ادا کر دی جاتی۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ گویا دیوالہ پٹ گیا؟" اسٹیلا نے معصومیت سے پوچھا۔

"ایک طریقے سے تو پٹ گیا۔" میں نے جواب دیا۔ "ایک تو میں اپنا پیانو فروخت کر دوں گی"۔۔۔ میں نے طے کیا۔

"میرے پاس کندن کے نگ ہیں جو پچھلے سال ممی نے دیئے تھے۔" اسٹیلا نے اطلاع دی۔

"اور میرا بچارہ ٹوپسی جو کم از کم پانچ سو میں بکے گا۔" جعفر نے کہا

"جھمکے میرے پاس بھی تھے۔ لیکن ان میں سے ایک گم گیا۔" میں نے کہا

"تم اپنی تصانیف وغیرہ کچھ بیچو۔" اردن نے خفگی سے مجھ سے کہا۔

میں نے اس بات سے شدید طمانیت محسوس کی کہ اردن مجھے بحیثیت ادیب مخاطب کر رہا ہے۔ بے حد وقار سے میں نے اس سے پبلشرز کی بد معاملگی اور نہ ہونے کے برابر قلیل معاوضے اور ہندوستان کے ادیبوں کی اقتصادی بد حالی کی شکایت کی۔ اسی سنجیدگی اور وقار کو قائم رکھتے ہوئے اس نے میری گفتگو سنی اور پھر سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔ میرا کھڑکی کے نیچے سے باغ کی روشنی میں آگئی اور ہم کو اس نے وقت کا اندازہ لگایا۔

۳۵

وقت گذرتا جا رہا ہے اور اب تم کو بہرحال فیصلہ کرنا ہے میرآرانی۔ میرآرانی۔ میرا رانی۔ میرآرانی۔

رات کے پرندوں نے پھر چیخنا شروع کر دیا ہے۔

وہ تنہا کمروں میں گھومتی پھر رہی ہے۔ یہ ارون کا کمرہ ہے۔ اس میں برسوں پہلے کے براؤن اوون ویکلی اور روور کے انبار، اسکیٹس کی جوڑیاں، مشینوں کے پرزے اور طیاروں کے ماڈل الماریوں میں ٹھنسے ہوئے ہیں۔ ہر طرف سخت افراتفری کا عالم ہے (کرنل راجونش وہ مشہورِ عالم نفاست پسند بجلہ ہیں جن کے گھر اور گھر کی سجاوٹ کا تذکرہ چاند کی بیرونی پر کیا جاتا ہے) اسی قسم کا کمرہ علی کا ہے جس میں صرف یہ فرق ہے کہ مشین کے پرزوں اور طیاروں کے ساتھ ساتھ اس نے لڑکپن کے زمانے سے دنیا بھر کی کتابیں اور پمفلٹ بھی جمع کر رکھے ہیں جن کو وہ رات کو بڑی رازداری سے بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ یہ رسالے

اور کتابیں مس کیتھلین چیو مرحومہ کی اطلاع کے مطابق وہی بولشویک لٹریچر تھا جو انھوں نے اس سے بھی چند سال پہلے ماسٹر آیلمر کو موم بتی کی روشنی میں پڑھتے دیکھا تھا۔ علی اور ارون کے کمرے بالکل ایک سے ہیں۔ جن دو لڑکوں نے چار سال کی عمر سے لے کر اب تک کی ساری زندگی مسلسل اکٹھی بتائی ہو۔ ان کے کمروں میں کسی انفرادیت کے باقی رہ جانے کا امکان ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لڑکپن میں دونوں بوکسنگ کرتے اور دونوں کی ناک سے خون بہتا۔ ارون علی سے تین سال بڑا تھا۔ دونوں کو وہ اس بہت بڑی خوفناک دنیا میں اپنا محافظ اور نگران سمجھتی آئی تھی اور کبھی کیا ایسا ہوگا کہ وہ بالکل اکیلی رہ جائے گی اور تنہا دنیا کے راستوں پر چلے گی۔

میرا پیانو کو چھوڑ رہی ہے۔ وچتر وینا اور ستار اور تان پورے — تان پورے۔ میں موسیقی کی کتابیں پیک کرتی جا رہی ہوں (موسیقی کے خبط میں سارا گھر مبتلا تھا۔ ابا جان نے رامپور دربار کے استاد یعقوب خاں کو برسوں اپنے ہاں ملازم رکھا جو مجھے پکے گانے کا ماہر بنانے میں دن رات کوشاں رہتے۔ لیکن اس میں کامیابی ان کو بہت کم ہوئی۔ گھر کے ایک ونگ میں ان کو دو کمرے دے دیئے گئے تھے۔ جہاں وہ دن بھر شاعری میں مصروف رہتے —— ارون نے پندرہ سال کی عمر میں انگریزی میں نظمیں لکھی تھیں۔ علی نے سولہ سال کی عمر میں کئی ہزار صفحے کا تاریخی ناول لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ جس میں وہ بتانا چاہتا تھا کہ ہند کا کسان موجودہ حالت پر کس طرح پہنچا — محظوظ ہونے کی صلاحیت سب میں کس قدر تھی۔ لارل اور ہارڈی کے فلموں پر سب مل کر اس قدر قہقہے لگاتے کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے —— اور لوگ حیرت سے دیکھتے)

کتابیں بیکار ہیں۔ زندگی میں آج یہ پچیسویں بار مجھے معلوم ہوا کہ کتابیں بکواس ہیں۔

ابا جان مرے تھے۔ تب بھی مجھ پر یہی انکشاف ہوا تھا۔

"میں باہر جا رہی ہوں ۔۔" دفعتہً میرا نے مڑ کر مجھے مخاطب کیا۔ دیوار پر اس کے سائے نے آسمان کی تاریکی کی سمت اشارہ کیا۔

"لیکن اتنا اندھیارا ہے۔ تم کہاں جاؤ گی" میرے سائے نے تکرار کی۔

شمع دان اٹھا کر میں ستون کے پاس کھڑی رہی جس پر روشنی ناچ رہی تھی۔ ملبے جا بجا بنا مدے کے سرے والے کمرے میں سب جمع تھے ۔۔۔۔ "کیا علی وغیرہ اب تاش کھیل رہے ہیں ۔۔" میں نے استفسار کیا۔

"اینٹ کے پتے ٹرمپ بن گئے ہیں ۔۔۔ ساری بلیاں سینٹ پال چلی گئی ہیں ۔۔۔ ساری بلیاں ۔۔" میرا اونچی آواز میں گاتی ہوئی باغ کی سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔

بیک روم میں کسی نے دوبارہ نارم یارڈ ممفی بجانا شروع کردی

اندھیرے میں پہنچ کر میرا نے تیز تیز قدم رکھنے شروع کیے۔ لیکن اندرا کی آواز اور "کرمن کی گت نیاری" کی تکرار اور بہت سی صدائیں مل کر دور تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ تیزی سے ایک طرف کو چلتی رہی۔

پھر مدھم چاند تیرتا ہوا اندھیرے میں نیچے اتر آیا اور اس کی ہلکی سی سرخ روشنی سارے میں پھیل گئی۔ اس روشنی میں زلزلے آ رہے تھے اور دیواریں ہل رہی تھیں اور ہر طرف ٹوٹے ہوئے پھاٹک اور بند دروازے تھے۔ اس کی جانی پہچانی گومتی کے کنارے کنارے جو راستہ جاتا تھا۔ اس کے آخری سرے پر شمشان تھا۔ جس میں اب شعلے لپکنے لگے تھے۔ جتنا جتنا وہ آگے بڑھتی۔ ان شعلوں کی لپک زیادہ ہوتی جاتی۔ پھر وہ رک گئی اور گھر کی اور واپس مڑ گئی۔ شعلے مدھم پڑ گئے اور شمشان بھومی میں خاموشی چھا گئی۔ اس نے پھر چلنا شروع کیا۔ آگ کی تیزی سے

ساری فضا سُرخ ہو گئی۔ چاند اس قدر دہکا کہ ہیرا کو اس کی تپش اپنی پیشانی پر محسوس ہوئی۔ کلکاریوں کے پھٹنے اور انگاروں کے لپکنے کے ساتھ ساتھ دہشتناک خلاؤں میں نارد منی کی آواز زور سے گونجی ——— دھرم مورت دھرم آتما شری چندر کمار راجونش کی ستیہ متی پتری جو ——— یہ آواز اس نے پوری نہ سُن پائی۔ کیونکہ نارد منی جو پاتال تک آ گئے تھے۔ پھر اوپر لوٹ گئے سرد ہواؤں کے تھپیڑوں میں اس کو بہت سی انسانی سرگوشیاں سُنائی دیں ——— چنانچہ وہ مر گئے بے ——— جی ہاں ——— بات یہ ہوئی کہ لڑکی کی طرف سے اپنی، ان کو بہت دکھ پہنچا ——— لڑکی نے ان کے گھر سے جا کر ایک مسلمان سے بیاہ کر لیا تھا ——— دراصل ——— پھر نارد منی نے اپنا آسمانی دوتارہ ہلا کر سر اٹھایا ——— دھرم آتما دھرم مورت ——— کریا کرم کے سمے کے منتروں سے آسمان لرزنے لگا ——— وہ کھڑی رہی اور اس نے واپس مڑنا چاہا۔ لیکن ہوا کا کہ ایک زوردار تھپیڑا آیا ——— اور اس کو پھر آگے کی طرف دھکیل دیا۔ یہ ہوا اسے پتہ نہ تھا کہ کہاں سے آئی ہے۔ یہ وہ آوارہ ہوا تھی جو کائنات کے سارے کونوں میں روتی پھرتی ہے اور نیم وا دریچوں سے اندر جا کر سوتے ہوئے دکھی انسانوں سے چپکے سے پوچھتی ہے کیا تم میرے ہمراہ نہ چلو گے۔

پھر چاند تیرتا تیرتا اپنی اصلی حالت پر واپس چلا گیا اور اس کی نرم روشنی میں ٹھنڈی ندیاں بہنے لگیں۔ جن کے کناروں پر خوبصورت چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ جن کے باغیچوں میں ڈیزی کے پھول کھل رہے تھے اور دیواروں پر بچے بیٹھے تھے اور جھاڑیوں میں خرگوش کھیل رہے تھے۔

ہیرا ——— ہیرا ——— باغ کی دیوار کے پرے کھڑے ہوئے فرہاد نے اسے پکارا۔

"ہیری — ہیری — کرائسٹ کونٹری — ہاؤ ڈو یو ڈو گارڈن گرو —" دیوار
پر سے اچکتے ہوئے ایک نیلی آنکھوں والے شریر بچے نے اپنی لکڑی کی بندوق کا نشانہ
اس کی طرف لگاتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

"میرا —" پھَو نے دہرایا۔

"فادر انتھنی — " میرا نے آہستہ سے کہا۔

"فادر انتھنی — یہ کیا اڑا رہی ہو — کیا تم مجھ کو نہیں پہچانتیں؟ اس وقت شام کے
سات بجے ہیں۔ تم فیض آباد روڈ سے کلب آئی ہو — تم نے مجھے فون کیا تھا کہ تم کلب آرہی
ہو اور یہ کہ تم آج بالآخر اپنے فیصلے پر پہنچ گئی ہو اور یہ کہ یہاں سے ہم کانپور جا کر —"

"فادر انتھنی — فادر انتھنی —" میرا نے آنکھ بند کر کے زیرِ لب دہرایا — اور فواد
کی بات پوری نہ ہونے دی۔

وہ سڑک پر آگے روانہ ہوئے۔

اندھیرے میں بہاریں اور پھول ہی پھول تھے۔ کانپور روڈ پر کچھ فاصلہ طے کرنے
کے بعد انہیں پھونس کی چھت کا ایک مانوس کاٹج نظر آیا جس کے آگے کی زمین پر اودے
زیادہ پھول کھلے تھے۔ وہ دونوں کار سے اتر کر کاٹج کے اندر گئے۔ میرا کو محسوس ہوا جیسے
اب وہ سو گئی ہے۔ ایک اینگلو انڈین جمعدار نے ان کو سلام کیا۔ ایک کتا پاس سے گذرا۔
اس لکڑی کی بالکنی پر سے ابھی ہمارے ساتھی جھانکیں گے اور سفید پھول ہمارے اوپر
پھینکے جائیں گے۔ میرا نے تصور کرنا چاہا۔ اندر جا کر وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایک [illegible]
اطالوی اس کے قریب آیا۔ "آپ کے لئے کیا بجاؤں سینیورینا —؟" اس نے

سوال کیا۔

میرا نے فواد پر نظر ڈالی جو اطمینان سے میز کے کنارے بیٹھا تھا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ۔ اس تھوڑے سے عرصے میں انھوں نے ایک پنٹو مائم کیا تھا۔ اب باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ نیلے کے وہاں پہنچ کر ہم تار بھیج دیں گے۔ ہم کل مینی تال جا رہے ہیں ــــ سید ہ بیگم فواد نسیم احمد ــــ فواد نے کانٹے سے میز کی چادر پر چند لکیریں بنائیں "۔ ٹروپیکل میجک بجاؤ ــــ" اس نے بے حد نوابانہ طریقے سے اطالوی کو انگلی کا اشارہ کیا ــــ

اطالوی نے وائلن پر زور سے بو رگڑا۔ میرا نے دہل کر اسے دیکھا۔

"فادر اینٹنی "ــــ غیر ارادی طور پر اس نے پھر کہا۔

فواد نے استفسارانہ نگاہوں سے ذرا جھنجلا کر اسے دیکھا۔

"فادر اینٹنی ہمارے اسکول میں تھے"۔ میرا نے کہا"۔ اور ایک بار جبکہ ہم لوگ کیمپ کے لئے دہرہ سے بارلو گنج جا رہے تھے تو راستے میں ایک پہاڑی چائے خانے میں رک کر انھوں نے ہماری اس روز کی دعا لیڈ کی تھی ۔ خداوندا ــــ ہمیں ہماری مرضی پہ چلنے کے لئے استقامت عطا فرما ــــ"

"ہماری مرضی جو کہ دراصل تیری مرضی ہے ــــ" فواد نے آہستہ سے جملہ پورا کیا۔

"جو کہ دراصل تیری مرضی ہے ــــ" میرا نے رک رک کر دہرایا۔ خداوند ــــ ؟ خداوند کی مرضی ــــ ؟؟ وہ کون ہے۔ کیا ہے ؟ ــــ کدھر ہے ــــ اس کی مرضی کیا ہے ؟؟ ــــ خلاؤں میں جھکڑ چلتا رہا تھا۔ وہ پھر نیز ہو گیا۔ نارمنی کے آسمانی دو تارے کے سُر جھنجھنائے۔ ذہن اور عناصر کے سارے راکشسوں نے مل کر قہقہہ

لگایا۔ شمشان بھوم کے شعلوں سے فضا پھر روشن ہوگئی۔ میرا نے لرز کر آنکھوں پر ہاتھ رکھے جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس وقت ٹی روم کے سارے لیمپ روشن ہو چکے تھے۔

وہ چپ چاپ بیٹھی ٹی روم کے مانوس "اولڈ ورلڈ" ماحول کو دیکھتی رہی۔ فواد خاموشی سے چھری کانٹوں کی ناؤ بنا کر میز پر ادھر ادھر چلانے میں مصروف رہا۔

پھر فواد اطمینان سے چلتا ہوا اسٹینڈ کے نزدیک گیا۔ باہر چند مرغیاں جن کو ابھی بند کیا گیا تھا۔ نم زمین پر دانے چگ رہی تھیں۔ میرا کا جی چاہا کہ وہ جا کر دیکھے کہ کاٹج کے پیچھے کیا ہے۔ اسے ہمیشہ سے مکانوں کے عقبی حصے دیکھنے کا شوق تھا جو اس قدر پراسرار ہوتے تھے۔ الگنی پر پھیلے کپڑوں کی شخصیت۔ لکڑی کے ٹب۔ مرغیاں۔ چولائی اور ڈیلیا کے پودے کوئی سفید بلی یا بوڑھا کتا ——— اس نے پھر فواد کو دیکھا۔ آج اس طرح اچانک اس نے اس انسان کے ساتھ اپنی زندگی بتانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ دراصل کس قدر معمولی بے رنگ اور سادہ واقعہ تھا۔ اس میں کہیں سے کسی میلو ڈرامہ، کسی منظر آفرینی کی گنجائش ہی نہ نکلتی تھی۔ کل وہ اسٹیلا کے ہاں کے ایٹ ہوم سے تھکی ہوئی گھر آئی۔ صبح کو اس نے بابا کا ٹمپریچر لیا اور ان کو اخبار سنایا۔ ارون نے اس کو اطلاع دی کہ مسٹر پونم وشاریہ بردکھوے کی غرض سے تشریف لے آتے ہیں اور کارلٹن میں ٹھہرے ہیں (جو کوئی تمہارا بدنصیب سوٹر آتا ہے کارلٹن ہی میں ٹھہرتا ہے۔ حالانکہ ان غریبوں کے لئے کارلٹن سخت منحوس ثابت ہوا ہے"۔ ارون نے جل کر کہا تھا" داد لفٹنٹ کمانڈر ایورب جیکر ورتی جو آئے تھے۔ وہ برنگٹن میں قیام پذیر ہوئے تھے اور راگھو راجی وینکٹا چاریم رائل میں۔ اس نے ذرا تصحیح کی تھی) اس کے بعد اس نے کچھ دیر ممی کے پاس بیٹھ کر مٹر کاٹے تھے اور خانساماں سے آلوؤں کی

قیمت پر بحث کی تھی۔ شام کو وہ اردن کے کمرے کی افراتفری کو ٹھیک کرتے کرتے اکتا گئی تھی اور کچھ دیر اس نے اندرا کے ساتھ ایک بھجن گایا تھا۔

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب ہم کیا باتیں کریں گے۔ وہ ایک دوسرے کے متعلق اتنا کچھ جانتے تھے۔ بچپن سے لے کر اس وقت تلک کا رتی رتی واقعہ۔ اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی —— میرا نے میز کی سطح پہ ہاتھ رکھا۔ پھر بھی فواد، یہ انسان جو کچھ ہے مجھے اس کے متعلق کیا معلوم ہے۔ نہ اسے اصلیت میں پتہ ہے کہ میں کون ہوں۔ غالباً وہ میرے لئے اتنا ہی اجنبی ہے جتنا اجنبی ریاض تھا۔ اگر کبھی ریاض اور راجیل ایک دوسرے سے باتیں کرنی شروع کر دیں —— لیکن کیا کبھی ایسا ہو گا ——؟ اسے پھر خوف محسوس ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ پھولوں کی اس نیم تاریکی میں فواد میرے نزدیک موجود ہے۔ بدرجے ٹرتھی ہوپکنز سے کاؤنٹر پہ جھکا باتیں کر رہا ہے۔ ابھی ہم لیٹنے کے گھر جائیں گے۔ پھر ایک لمحے کی پرواز کے ساتھ یہ ساری واقعیت ایک اور واقعیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ محض فواد نسیم احمد نہ رہے گا۔ وہ میرا شوہر ہو گا۔ وہ میرے متعلق کہے گا —— میری بیوی نے ابھی چاء پی ہے، شکریہ —— میری بیوی صبح شاپنگ کے لئے گئی تھیں۔ —— آپ میری بیوی کو فون کر دیجئے گا —— بھگوان —— یہ سب ممکن ہے۔ یہ سب ہونے والا ہے، ہو جائے گا۔ اس نے پھر لرز کر سامنے کی اور دیکھا۔ وہ پھولوں پر جھکا کاٹج کے مالک سے کچھ کہہ رہا تھا۔

پھر وہ حسب معمول اپنے سوتے سوتے انداز میں میرا کی طرف مڑا اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔

اور تب میرا نگنی نے دیکھا کہ وہ ایلمر ریکسٹن تھا۔ ایلمر کی نیلی آنکھیں تھیں جو اسے دیکھ کر متبسم ہوئیں۔

ایلمر۔ نہیں، یہ تو محض فواد تھا (محض فواد ۔ ؟؟) اور ایلمر اس دنیا میں ہے، رہے گا۔ پھر دل کی اس نیم تاریکی کے پرے، کہیں موجود ہے۔ میرابل ۔۔۔ میرابل رکمیشن ۔۔ اس نے ایک پھریری لی ۔ اور زور سے گلدان کو اٹھا کر زور سے دوسری جگہ رکھا اور طے کرنا چاہا کہ یہ شام کے ساڑھے سات بجے ہیں اور وہ بہر حال فواد کے ساتھ زندگی بتانے جا رہی ہے ۔۔ ایلمر کو وہ نہیں جانتی علی سے بھی وہ بالکل واقف نہیں۔ اسے اب عمر بھر فواد کی پرستش کرنی ہے ۔۔ جی ہاں ۔ میرے ہزبنڈ کل دہلی جا رہے ہیں۔ میرے شوہر کو تو بمبئی کی آب و ہوا ابھی راس نہیں آئی ۔۔ ہلو ۔۔ کرنل و مسز فواد احمد ۔ تخیل میں اس نے یہ سارے مکالمے ادا کئے اور سُنے۔ لیکن ایلمر بالکل اس کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا ۔۔ میرابل ۔۔ مجھے صرف دکھ چاہئیں۔ تمہاری دنیا میں صرف دکھ ہیں اور مجھے وہ پسند ہیں ۔

"میرارانی ۔۔ چلنا چاہئے۔ کہیں بارش نہ شروع ہو جائے" فواد نے روزمرہ کی معمولی آواز میں اس سے کہا۔

وہ باہر نکلے ۔ فواد نے اس کے لئے کار کا دروازہ نہیں کھولا۔ اپنی بہن نادرہ اور اس کے علاوہ راجیل، اسٹیلا اور میرا وغیرہ ان لوگوں کے لئے اس نے آج تک کبھی یہ زحمت گوارا نہ کی تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔ اس طرح ہم عمر بھر اکٹھے دروازوں سے نکلیں گے۔ کمروں میں داخل ہوں گے۔ سفر کریں گے۔ کھانا کھائیں گے۔ میری شخصیت اور اس انسان کی شخصیت آج سے ایک مجھی جائے گی۔

"اوہ ابھی ہم صرف دس میل آئے ہیں" ۔ فواد نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا جس طرح وہ ہر بات ایک خاص تھکے ہوئے انداز میں ادا کرتا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

۳۶

"میرا — میرا کہاں ہے"— اسٹیلا چلاتی ہوئی آئی اور سراسیمگی سے زینہ طے کرتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"میرا؟— ابھی ابھی وہ یہاں تھی۔ پھر اس نے کہا کہ میں باہر جا رہی ہوں۔" بیانو پر شمعدان رکھ کے میں نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

"انکل راجو نشں کو دوبارہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ بار بار میرا کو پکار رہے ہیں۔" اسٹیلا نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ "ان کی حالت یکایک بگڑ گئی ہے۔"

"اروں کہاں ہے"۔ میں نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

"اروں اور علی اور سب لوگ ادھر ادھر ڈاکٹروں کو بلانے کی دوڑ بھاگ میں لگے ہوئے ہیں۔ چلو جلدی سے میرا کو ڈھونڈو۔"

"وہ اس وقت چل کہاں دی۔ عجب کریک لڑکی ہے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"بٹیا — بٹیا ابھی سڑک پر گئی تھیں" ایلیس ان ونڈر لینڈ والے مالی نمبر ۲ نے پھاٹک کے قریب سے سر نکال کر کہا۔

ہم لوگوں نے جلدی سے علی کی پرانی اوپل برساتی میں سے نکالی اور سڑک پر اندھا دھند ایک سمت کو روانہ ہو گئے۔

"لیکن ہم لوگ اس طرح جا کہاں رہے ہیں۔ پہلے تین چار جگہ فون تو کر لیں۔ دریا کے پل سے اتر کر اسٹیلا کو خیال آیا۔

سامنے کارلٹن کی روشنیاں سرو کے درختوں میں سے جھلملا رہی تھیں۔ پھاٹک کے اندر جا کر تیزی سے ہم نے برساتی میں کار روکی اور فون کی طرف لپکے۔

"میرابل — وہ تو مجھے کل شام سے نظر نہیں آئی" ایلمر کمیٹن نے جلی ہوئی آواز میں کہا۔

"مس رانجوش — آج ان کی کوئی ریہرسل یا پروگرام نہیں تھا —" ریڈیو اسٹیشن سے اطلاع ملی۔

"میرا آپا — جی ہاں بٹیا — ابھی وہ اور فواد بھیا کچھ دیر کے لئے یہاں آئے تھے پھر دونوں بجنے موٹر میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے —" محمد باغ کلب کے ہیڈ آبدار نے گھمبیر آواز میں جواب دیا۔

"کدھر گئے ہیں — کچھ پتہ ہے عبدل —" میں نے پریشانی سے سوال کیا

"معلوم نہیں بٹیا۔ کانپور روڈ کی اور موٹر مڑی تھی۔ فواد بھیا نے۔ دیکھئے چوکیدار سے پوچھ کر بتلاتا ہوں۔"

"یہ میرا اس وقت دیک اینڈ منانے پیلاگے کے ہاں گئی ہے۔ اس کا دماغ تو نہیں

چل گیا —" اسٹیلا نے غصے سے کہا۔

"اس کا تعاقب کیا جائے —" میں نے مشاق جاسوسوں کی طرح تجویز کی۔

"یہ کار کس کی ہے —" برآمدے سے باہر آتے ہوئے اسٹیلا نے ٹھٹھک کر نیلے رنگ کی ایک برق رفتار تازہ ترین اسپورٹس ماڈل پر نظر ڈالی جو امیر متوسط طبقے کے نودولتیے پن کی طمانیت کی ٹھوس علامت بنی برساتی میں کھڑی تھی۔

کامیاب تعاقب کے لئے یہ تیز رفتار کار خاصی مفید ثابت ہوتی۔ میں نے اسی جاسوسی انداز میں اسے دیکھ کر قدرے تاسف سے اپنی وفادار پرانی اوپل کو دیکھا جو ایک پیڑ کے نیچے کھڑی سستا رہی تھی۔

"میں پونم ہیبشور روشناریہ ہوں —" ایک لمبے چوڑے انسان نے کار میں سے نکلتے ہوئے کہا۔

"پونم — کیا —" اسٹیلا نے گھبرا کر کہا۔

"جی۔ میں آپ کی اس وقت کیا خدمت کر سکتا ہوں —؟ آپ دونوں خواتین کافی پریشان نظر آتی ہیں —"

"جی — جی نہیں۔ نہیں تو —" میں نے سٹپٹا کر کہا۔

"جی — ذرا — ذرا ہم کو کانپورنک جانا ہے —" اسٹیلا نے اور زیادہ گھبرا کر جواب دیا۔

"کانپورنک — اس وقت —" مسٹر روشناریہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"جی — جی ہاں —" میں نے دفعتہً بہت زیادہ پریشان ہو کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ وقت بھاگا جا رہا تھا۔ "جلدی کرو" میں نے اسٹیلا سے آہستہ سے کہا۔ "ارون کو فون

کرد کر میرا خاباً عطیہ کے گھر یا یونیورسٹی لائبریری کسی سخت ضروری کام سے چلی گئی تھی۔ ہم اس کو لے کر فوراً آتے ہیں ۔۔" اسٹیلا دوبارہ ٹیلی فون کی طرف لپکی اور اسی تیزی سے واپس آئی۔ ہم لوگ اوپل میں جا بیٹھے۔

اوپل نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔

میں نے اور اسٹیلا نے ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تم میں اتنی عقل بھی نہیں ہے کہ ایک موٹر ہی ٹھیک کر لو۔ اگر وقت پڑ جائے تو۔۔" میں نے کہا

"تم خود کر لو۔ تم بھی تو اتنی سخت عالم فاضل ہو۔ یار۔۔" اسٹیلا نے جواب دیا۔

پرنم ہیبشور وشاریہ جو برآمدے میں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ مسکراتے ہوئے نیچے اتر آئے۔

"آیئے۔ میرے ساتھ چلئے۔"

"لیکن ۔ بات یہ ہے کہ ۔۔" اسٹیلا نے کہنا شروع کیا۔

میری نظر پھر گھڑی پر گئی ۔۔" اسٹیلا ۔۔ اللہ اب کیا کیا جائے۔"

"گو ہم لوگوں کا باقاعدہ تعارف نہیں ہوا ہے۔ لیکن آپ دونوں اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کون ہوں۔ اس لئے تکلف نہ کیجئے۔ آپ بے حد پریشان نظر آ رہی ہیں۔ آپ کو جہاں بھی جانا ہے۔ میں پہنچائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ہمیں باقاعدہ ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچتے ہوئے اپنی کار میں ٹھونس دیا۔

آناً فاناً میں اس کی کار سڑک پر آ گئی۔

"آپ کو پتہ ہے۔ ہم ہندوستانی لوگ سسرال والوں کی کتنی خاطر کرتے ہیں اور ان سے

کتنی بے تکلفی برتتے ہیں۔ چنانچہ اگر آپ اپنے ملک کی رسوم سے واقف ہیں اور ان کا پاس
کرتی ہیں۔ تو یقیناً میری یہ ضرورت سے زیادہ بے تکلفی آپ کو ناگوار خاطر نہ گذرنی چاہئے۔
— بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کو ایسا لائق فائق اور پرمذاق
بہنوئی ملنے والا ہے —!!"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے طنزاً یہ سب کہا ہے یا محض خوشدلی سے۔ اور یہ سب
کچھ اس قدر یک بیک ہوا تھا کہ میں بالکل حواس باختہ بیٹھی تھی۔

کار برق رفتاری سے کانپور روڈ پر رواں ہو گئی۔

"اب بتائیے —" گیئر بدلنے کے بعد اس نے کہا۔ "آپ دونوں اس قدر سراسیمہ
کیوں دکھلائی دیتی ہیں —" اس نے اطمینان سے جھک کر پائپ جلایا۔

"انکل — انکل بیمار ہیں" اسٹیلا نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

لائیٹر کی روشنی میں میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ کس قدر ٹھوس قسم کا انسان تھا۔
میٹر آف فیکٹ۔ کامیاب اور معمولی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا کردار نہ تھا۔ کوئی جذبات
کوئی گہرائی۔ یہ آدمی میرا سے شادی کرنے آیا ہے اور خود ہم اسے میرا کی سمت لئے جا
رہے ہیں۔ آج کی رات۔ جبکہ آج کی رات وہ بالآخر اپنا فیصلہ کر چکی تھی — یہ کیا ہو گیا۔
— یہ کیا ہو گیا — کیا اب بھی یہ کار رک نہیں سکتی — پھر گھڑی کی طرف میری نظر گئی۔

"کون انکل —؟" اس نے بے خیالی سے استفسار کیا۔

"انکل راجونش — تھندر چاچا"

"او آئی سی —"

"اور ہم لوگ میرا کو لینے جا رہے ہیں" اسٹیلا نے آہستہ سے کہا۔ میں نے دوسری

طرف دیکھنا شروع کیا۔

خاموشی سے ہم لوگ چلتے رہے۔ وہ اجنبی۔ اور ہم لوگ۔ اور اندھیرا۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ مجبوراً ایک سمت کو رواں تھے۔ جدھر میرا اور فواد گئے تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت چائے خانہ ہے۔ ایر فیلڈ، اناؤ اور کانپور کی طرف جانے یا ادھر سے آنے والے اکثر اس میں ٹھہر جاتے ہیں۔ یہاں ایک اطالوی دامن فواز ہے جو پہلے جنگی قیدی تھا اور اب یہیں رہتا ہے اور عمدہ چائے اور گھر یلو فضا اور لنگڑا ٹموتھی ہو پکنز اس جگہ کا مالک ہے۔ جو دراصل یہاں پولٹری فارمنگ کرتا ہے۔ اور ہفتے کے دن چار باغ جاکر انڈے فروخت کر آتا ہے۔ اب تک ہم ان گنت بلو یہاں آئے ہیں یا ادھر سے گذرے ہیں اور جب ٹموتھی اپنے کچن گارڈن میں کدال چلاتے چلاتے ہم کو دیکھ لیتا ہے تو زور سے ہاتھ ہلاتا ہے اور آوازیں دیتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں وہ ایک ٹانگ کھو بیٹھا تھا۔ اس جنگ میں اس کے چاروں جوان بیٹے برما اور اٹلی میں مارے گئے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ہنستا اور شور مچاتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ مل کر گانے لگتا ہے۔ خود ان کے لئے توس سینکتا ہے اور جب چائے تیار ہو جاتی ہے تو آتشدان کے پاس بیٹھ کر وہ کبھی کبھی اپنے مرحوم بیٹوں کے قصے سناتا ہے یا پھر چپ بیٹھا خوشدلی سے سب کی باتیں سنتا رہتا ہے۔ میرا اور فواد کو بھی اس وقت اس نے چائے پلائی ہوگی اور ان کو اکٹھا اور خوش دیکھ کر اسے بھی مسرت ہوئی ہوگی۔

"گڈ ایوننگ مسٹر ہوپکنز —" میں کاؤنٹر پر جاکر چونٹوں کی طرح کہتی ہوں۔ ابھی ابھی ہم

باہر آکر رُک گئے ہیں۔ ہیشور روشاریہ خاموشی سے پائپ پی رہا ہے۔ اسٹیلا سہمی ہوئی ہے۔ ہیشور روشاریہ کی خاموشی ہمیں کھائے جاتی ہے۔ راستے بھر ہم میں سے کسی نے ایک لفظ بات نہیں کی ہے۔

"گڈ ایوننگ مسٹر ہوپکنز ——" میں پھر چلا کر کہتی ہوں۔ وہ کان پر ہاتھ رکھ کر چونکتا ہے اب وُہ بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے اور بہت زیادہ بہرہ۔

"ہلو —— ہلو —— گڈ ایوننگ مائی ڈیرینگ لیڈی ——" وہ خوشی سے باچھیں کھلا کر دھندلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہے۔

"کیا میرا رانی اس طرف سے گذری ہیں ——؟" میں پوچھتی ہوں

"مس میرا ——؟ ہاں ہاں —— مس میرا اور ماسٹر فواد دونوں ابھی ابھی کانپور گئے ہیں —— وہ بشاشت سے جواب دیتا ہے۔

باہر بارش شروع ہو چکی ہے۔

"میں تم نوجوانوں کے لئے ابھی چاء بناتا ہوں —— آرام سے بیٹھو" —— وہ مصروفیت کے ساتھ آتشدان کے آگے کرسیاں کھینچتا ہے۔

"اب ہم بارش کے رُکنے کا انتظار کرتے ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ——؟" پونم ہیشور سرد آواز میں سوال کرتا ہے اور آرام کرسی پہ بیٹھ کر جارج ششم کے خاندان کی تصویر دیکھنے میں محو ہو جاتا ہے۔ جو دیوار پر آویزاں ہے۔

اسٹیلا حسبِ معمول سہمی ہوئی بیٹھی ہے

"چاچا اس وقت جانے کیسے ہوں گے —— میں بے صبری سے گھڑی دیکھتی ہوں۔

"اب کیا ہو گا۔ یہ تو بڑی قیامت ہو گئی"۔ اسٹیلا آہستہ سے کہتی ہے۔

"لیکن پھر میرا کو کیسے تلاش کرتے"۔ میں سرگوشی میں کہتی ہوں۔

"پیلاٹے کو فون کر دیتے۔ یا گھر واپس جا کر علی کو ساتھ لیتے ۔۔۔ اس کے ساتھ بہرحال نہ آتے"۔

"اب کیا ہو سکتا ہے۔ چپکی بیٹھی رہو"۔ میں اس سے کہتی ہوں۔

پونم بھیشور اسی سرد مہری اور تمسخر کے انداز سے ایک ابرو اٹھا کر ہمیں دیکھتا ہے اور پائپ پیتا رہتا ہے۔

اسے اس طرح دیکھتا پا کر اسٹیلا دفعتہً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

اس نے تعجب سے اسٹیلا کو دیکھا۔

"آپ ۔۔۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ ہم لوگ ۔۔۔ ہم لوگ کتنے دکھی ہیں۔ ہمیں کتنی تکلیفیں اٹھانا پڑی ہیں ۔۔۔ آپ کو کیا معلوم ۔۔۔" اسٹیلا نے انتہائی غم و غصے کے ساتھ کہا۔

"تکلیفیں ۔۔۔" وہ خوب ہنسا

"جی ہاں ۔۔۔" اسٹیلا نے اسی غصے سے جواب دیا "آپ کے خیال میں ایک بہت ہی دلچسپ قسم کا ڈرامائی واقعہ ہے۔ جو آج رات اس طرح غیر متوقع طور پر آپ کے ساتھ پیش آیا۔ آپ بے حد محظوظ ہوئے۔ لیکن آپ کو کیا معلوم ۔۔۔"

"کہ تکلیفیں کیا ہیں ۔۔۔!!" پونم و شاربہ نے اسی طرح بات پوری کی ۔۔۔ "میں اس سارے قصے کی [illegible] سے یقیناً لطف اندوز نہیں ہو رہا"۔

"تکلیفیں —" تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر آہستہ سے مسکرایا۔
"ذرا بتلاؤ تو تم نے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں تمہیں کتنی بار بچپن میں بھوکا رہنا پڑا۔ تم نے کن دقتوں سے تعلیم حاصل کی۔ روزگار کی تلاش میں تمہیں کیا کیا برداشت کرنا پڑا —— تمہارا کیسا گھر تھا جہاں رات کو اکثر لالٹین بھی نہ جل پاتی تھی —— وہ آہستہ آہستہ کہتا رہا —
زندگی کی سب سے بڑی مجبوری اور تکلیف افلاس ہے۔ جس کا تم کبھی خواب میں بھی اندازہ نہیں کر سکتیں — تم مجھ سے ہمدردی کی متوقع ہو —؟! اگر مجھے ہنسی آئے تو میں کیوں نہ تم پر ہنسوں۔ تم اور تمہارے ساتھیوں کے مسائل اور پریشانیاں آخر کیا ہیں —؟
تم لوگ ایک یونیورسٹی سے دوسری میں چلے گئے۔ کشتی رانی کے مقابلے کئے۔ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کو پارٹیوں پر بلایا۔ تم کو تو شاید اس بات میں بھی کوئی رومان اور گلیمر نظر آتا ہوگا کہ کس طرح میں نے افلاس، مصائب جھیل کے اپنی قابلیت کی وجہ سے موجودہ حیثیت کو حاصل کیا اور کس طرح ایک جست بھر کر تمہارے ڈرائینگ روم میں آن بیٹھا"
بارش ہوتی رہی۔ کمرے میں مکمل سناٹا طاری تھا۔ پائپ کی راکھ جھٹک کر بہت دیر تک کسی گہری اور اداس سوچ میں کھوئے رہنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا —" آج اس عجیب و غریب طریقے سے آپ کا ساتھ ہوا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ سب میرے نام، میرے وجود تک سے نفرت کرتے ہیں۔ میں گویا آپ کی زندگی کے اس دلچسپ طریقے کا وہ لازمی ولین ہوں جسے ایک روز آخر کار ظاہر ہونا تھا۔
آپ کو معلوم ہے۔ میں آپ تک، یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں —؟ دس سال کی عمر میں میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ میرا باپ ایک قصبے کے اسکول کا سیکنڈ ماسٹر تھا۔ میری پانچ بہنیں تھیں۔ ایک کو ٹی بی ہو چکی تھی۔ ایک بہن قریب کے ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ چیکر

کے ساتھ بھاگ گئی تھی (جب ہم اسے پکڑنے کے لئے شولاپور تک گئے تو اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی اور اس کے بعد دوبارہ بمبئی بھاگ گئی) اس کے چلے جانے کے بعد میری تیسری بہن کو ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ تب وہ مجھے پکڑ کر مارتی تھی۔ ماں ایسی شائستہ، کلچرڈ، برج کھیلنے اور انگریزی بولنے والی نہ تھی جیسی تمہاری مائیں ہیں۔ دن بھر وہ رسوئی میں بیٹھی اپنی ساس اور محلے والوں کو گالیاں دیا کرتی۔ میں گھر کی سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھا گلی میں سے گذرتی ہوئی لڑکیوں کو اشارے کیا کرتا تھا—

کس قدر حسین اور سہانا پس منظر تمہارے بچپن کا ہے۔ جسے میں آنکھ بند کر کے فوراً تصور کر سکتا ہوں۔ جس میں یہاں سے وہاں تک انگریزی کانونٹ ہیں اور ہمالیہ پہاڑ۔ اور فینسی ڈریس پارٹیاں میں نے تو ہمیشہ جنگ کے اسکول میں پڑھا۔ ماحول [illegible] جو میرا تھا۔ اس میں سب شکلیں ایک سی تھیں۔ [illegible] تاریخ، سب کے دکھ۔ ہمارے گھروں میں لالٹینیں جلتی تھیں اور خاص خاص موقعوں پر فرش پر سیتل پاٹیاں بچھادی جاتی تھیں۔

پھر میں کالج گیا اور وہاں میں نے معاشیات پڑھی اور مہاسبھا کا سرگرم رکن بن گیا۔ مجھ سے کسی نے کہا۔ پونم وشاریہ۔ پارٹی جوائن کرلو۔ یہ تمہارے دکھوں کا واحد علاج ہے۔ کیا تم اپنی اس بہن کو بھول گئے جو بمبئی بھاگ گئی تھی اور اب ورسوا کی ایک کاٹیج میں رہتی ہے۔ لیکن میں معاشیات پڑھتا رہا اور سارے فلسفے میں نے گھول کر پی ڈالے۔ میں تمام مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھوں گا۔ امیرزادے جو لائبریری میں بیٹھ کر مارکس ازم پر گفتگو کرتے اور گرمیوں میں اوٹی جاتے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہتے۔ سارے یونیورسٹی شہروں میں، سارے ملک میں، ساری دنیا میں ایک نئی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ ہمارے رفیق جاگ اٹھے ہیں۔ ایک دوست نے اپنے لکھنؤ کے رفقا کا ذکر کیا جو ایک کلچرل

کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے ـــ زاد نسیم احمد۔ علی بہادر۔ ارون راجونش۔ لیکن میرے دکھ کا علاج پارٹی نہیں تھی۔ جہنم میں جائے پارٹی۔ میں اوپر نکلوں گا۔ علی بہادر اور ارون راجونش جیسے سورما بہت دیکھے ہیں۔ وہ میری جگہ اتر کر میری دنیا میں پیدا ہو کر دیکھتے تو انہیں حقیقت معلوم ہوتی۔ میری بالکل پرورٹ، بیمار ذہنیت ہے جس کا ذمہ دار میرا ماحول ہے۔ مجھے میرے ہمدردوں نے بتایا۔ لیکن میں خاموشی سے مقابلوں میں بیٹھتا رہا اور ایک مقابلے میں سارے ملک میں اول آگیا۔ اور پل کی پل میں اپنی کائنات سے نکل کر علی بہادر کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ کلبوں میں، سرکاری کانفرنسوں میں، پہاڑوں پر ان سب سے ملاقات ہوئی ـــ ایک بار میں لکھنؤ گیا۔ جہاں آئی ٹی کالج کا ایک ڈرامہ دیکھنے کے لئے مجھے خاص طور پر مدعو کیا گیا۔ جب میں چیف کمشنر بنا تو میرا راج ونش کی میرے لئے بات آئی ـــ"

گھڑی ٹک ٹک کرتی رہی۔ بارش کا زور کم ہو چلا تھا۔

"ـــ آج کی رات ـــ" وہ اسی آواز میں آہستہ آہستہ کہتا رہا ـــ "آج کی رات تم سب میری مٹھی میں ہو۔ تمہارے طبقے کے استحکام اور بقا کا صرف میرے رحم و کرم پر انحصار ہے اب میں تمہارے حصار میں داخل ہو کر تم سے بدلہ لے سکتا ہوں۔ میرا راج ونش کا سارا مستقبل اس وقت میری مٹھی میں ہے ـــ کیا یہ صحیح نہیں ـــ؟ کائستھوں کی اونچی قوم کی وہ لڑکی جو ایک مسلمان کے ساتھ بیاہ کرنے کے لئے چلی گئی۔ اس کا مستقبل اب کیا ہے؟ تمہارے سارے نظام کا تار و پود اس وقت میرے قدموں میں بکھرا پڑا ہے۔ جب میری بہن گھر سے گئی تھی تو اسے بھاگنے کی عامیانہ اصطلاح سے یاد کیا گیا تھا۔ میرا کانپور جانا تم لوگ ذہنی رفاقت کی تکمیل کے نام سے تعبیر کرو گے ـــ

"لیکن اس کے باوجود ـــ" اس نے میری طرف جھک کر کہا۔ "تمہارا سارا اسٹیٹ آپ

میرے قبضے میں ہے۔ کیا تم میرے عہدے کی عظمت سے واقف نہیں ۔۔۔ غالباً تم یہ جانتی ہو کہ ملک کے سارے اعلیٰ ترین ہندو گھرانوں سے جن میں کئی راجواڑے بھی شامل ہیں، میرے لئے پیام آ چکے ہیں ۔۔۔ یہ تمہاری اصلیت ہے۔ جس کو میں نے پہچانا ہے ۔۔۔

"تم مجھ سے دکھوں کی بات کرتی ہو مسز اسٹیلا بیگم ۔۔۔!"

پھر وہ یکلخت خاموش ہو گیا۔ وہ پُراسرار اور خوفناک نظر آ رہا تھا۔

بارش رُک چکی تھی۔

"کیا اب ہم کو چلنا نہ چاہئے ۔۔۔ نہ جانے اب تمہارے چاچا کی حالت کیسی ہو" اُس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

لیلے کے گھر پہنچ کر ہم نے لکھنؤ فون کیا۔ چاچا کی حالت کچھ بہتر ہو چکی تھی۔ زرد پھولوں والے برآمدے میں فوراً ملا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

"تم کیسے آ گئیں" اس نے بھونچکا ہو کر مجھے اور اسٹیلا کو دیکھا۔

ایمنٹ کے پتے ترمپ بن گئے ہیں۔ ساری بلّیاں بسنت پال چلی گئی ہیں ۔۔۔ اندر سے میرا کے پیچھے سروں میں گانے کی آواز آئی۔

"مسٹر وشارد یہ ہمارے ساتھ آئے ہیں" اسٹیلا نے آہستہ سے کہا۔ لیلے اور کرنل بلگرامی ہڑبڑا کر برساتی کی جانب لپکے۔

"آئیے ۔۔۔ آئیے ۔۔۔ ہیبشور صاحب" کرنل بلگرامی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"بچوں کو کسی نے کاٹ کھایا ہے اور چاند پر دورے پڑ رہے ہیں ۔۔۔" میرا کی آواز آتی رہی۔

مسٹر ہیشور وشاریہ نے بیلے آ کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا اور کرنل بلگرامی سے مسکرا کر ہاتھ ملایا۔ جو ابھی ڈائننگ اِن نائٹ سے لوٹے تھے اور میس کٹ میں ملبوس تھے۔ باتیں کرتے ہوئے کرنل بلگرامی انہیں جلدی سے دوسرے سٹنگ روم کی طرف لے گئے۔

بیلا نے سرعت سے ان کے لیے کافی بنوائی۔

"اب کیا ہوگا — اب کیا ہوگا۔" اسٹیلا نے ایک صوفے پر گرتے ہوئے فریاد کے سے لہجے میں کہا۔

"ہم لوگ سب ڈرمپ میں ہیں اور رائینٹ کے پتے ٹرمپ بن گئے ہیں۔" نیرا کی آواز جاری رہی۔

"اب کیا ہوگا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہے نا؟" فواد نے اطمینان سے اخبار دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن تم نے بیٹھے بٹھائے یہ پروگرام کیسے بنا لیا تھا۔ تم کیوں نہ جانو —؟" اسٹیلا نے غصے سے کہا۔

"نیرا سے پوچھو۔ انتخاب ابھی اس کا اپنا ہے۔"

چاند دیوانہ ہو گیا ہے اور گھر بغیر دیواروں کے بنے ہیں — نیرا کی آواز آئی — یہ کتنا پرانا نرسری کا گیت تھا، جو وہ اس وقت گا رہی تھی۔

(یہ کیسا ہے کہ اتنے عرصے سے میرے دماغ میں جو دوتارہ بج رہا تھا وہ یک بیک تھم گیا ہے اور اب ایسا سناٹا ہے کہ اس سناٹے سے مجھے ڈر لگتا ہے — نیرا نے سہم کر چپکے سے کہا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے دریچے میں بیٹھ گئی اور گنگا کو دیکھتی رہی)

"للہ بتلاؤ کہ اب کیا ہوگا — کیا تم نیرا کو اپنے ساتھ لے کر چچا کے پاس چلی جاؤ گے"

ہو یا اسے اس کمبخت ہبیشورد وشاریہ کے ساتھ جانا چاہئے" اشیلا نے عاجز آ کر پوچھا۔

"پتہ نہیں " فواد نے حسب معمول اونچی آواز میں جواب دیا " میرا بھیجا جانتی ہے ۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو کسی کے لئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا" اس نے پھر اخبار اٹھا لیا۔

"اشتر یہ کیا دیوانگی ہے" اشیلا چلائی۔

مسٹر وشاریہ برآمدے میں نکل آئے " ہلو ـــ یہاں تو بہت دلچسپ مجمع نظر آتا ہے " انھوں نے فرمایا۔

لیلئے اور کرنل جگراجی گھبرائے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے باہر آئے ۔

فواد نے اطمینان سے اخبار رکھ کر مصافحے کے لئے مسٹر وشاریہ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

مسٹر ہبیشورد وشاریہ نے جھک کر بڑے اخلاق سے اس سے ہاتھ ملایا ۔

"اس خاکسار کو فواد نسیم احمد کہتے ہیں "

"ہاؤ ڈو یو ڈو ـــ" بے حد متوازن آواز میں انھوں نے کہا اور لیلئے کی طرف مڑے "اگر آپ اجازت دیں تو میں واپس جاؤں ۔ کیونکہ دس بجے مجھے ایک آفٹر ڈنر پارٹی میں شریک ہونا ہے "

لیلئے سٹ پٹا گئی ۔ گو اس سارے واقعے سے غیر شعوری طور پر وہ بے حد محظوظ ہو رہی تھی ۔ سرعت سے وہ ان کے ہمراہ ڈرائینگ روم کی طرف مڑی ۔

فواد مدھم سروں میں سیٹی بجاتا اس کمرے میں گیا ۔ جہاں میرا منہ دھونے کے بعد بالوں میں ایک پھول ٹھونسنے کی کوشش میں مشغول تھی ۔ لیکن وہ پھول سنبھالے نہ سنبھلتا تھا ۔

"بیوقوف گدھا ـــ ہلو ـــ" اس نے فواد کو دیکھا

"شکوہ بیرا آرائی ـــ" وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گیا ۔ گویا اب وہ کسی پارٹی گیم کے

دوران میں کسی نئی شرارت کی سکیم بنانے والے ہیں۔ یہ پونم وشاریہ ہے جو ایک نہایت عام اور نارمل انسان ہے اور میں وہ اجنبی ہوں جس کو ہوش سنبھالنے کے بعد تم نے پہلی بار راج محل کے پھاٹک پر دیکھا تھا جب میں کیمبرج سے لوٹا تھا اور تم پورٹ بلیئر سے واپس آئی تھیں اور تم نے اپنے ناچوں کی تفصیل ذہن نشین کرائی تھی۔ تم نے کہا تھا تم بلیو بیا ہوگی اور تم نے کہا تھا تمہارے گھر کے درختوں کے نیچے پریاں رہتی ہیں اور اس سارے وقت تم اپنے ذہن سے باتیں کرتی رہیں۔ مجھ سے نہیں۔ تم نے کہا تھا۔ سامنے جو جھیل ہے اس پر ہم روز ٹروڈلز سے ملنے جاتے ہیں۔ پھر تم ایلمر سے ملیں اور تم نے اپنے سوچنے والے دماغ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ میں مہا راج کمار کنال ہوں۔ یا پرانی دیو مالا کا کوئی اور کردار۔ تم اروشی تھیں۔" اور میر آرانی — "ایلمر نے تم سے کہا۔ تم لیڈی میر آبل ہو۔ قرون وسطےٰ کے کسی خواب زدہ قلعے کی شہزادی جو سر ایلمر۔ کنگ آرتھر کے کسی نائٹ کی منتظر ہے۔

"جبکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ یہ معمولی عام، سمجھدار آدمی ہے جو تم کو بیاہنے آیا ہے۔ خدا کے لئے بتاؤ کہ آخر اب تک ہم کیا کرتے رہے ہیں۔ کیا سوچتے رہے ہیں۔ اپنے لئے فیصلہ کرنا کتنا اذیت ناک ہے۔ تم کیوں چاہتی ہو کہ مجھے ہر چیز سمجھنی چاہیے۔"

میر آرانی نے بڑی ترتیب سے بہت سارے پھولوں کا انبار اپنے سامنے لگا لیا اور انہیں منتخب کرتی رہی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو کرنل فواد احمد" اس نے کہا "تم نہیں سمجھ سکتے۔"

"خدایا" فواد اٹھ کر دریچے میں جا بیٹھا "یہ سب بکواس ہے میر آرانی۔ بالکل چنڈو خانہ ہے۔ میں کیا سمجھ سکتا ہوں جبکہ ہر چیز فہم سے بالاتر ہے۔ تم اور

میں۔ اور یہ ساری کائنات۔ اور اب تم اس سے بیاہ کرلوگی اور تمہارا گھر ہوگا جس میں پونم و شاریہ کے بچے کھیلا کریں گے۔"

"میں تم سے اتنی ہی شدید نفرت بھی کرسکتی ہوں فواد نسیم احمد"— میرا نے آہستہ سے خود کو مخاطب کیا۔ ہر چیز وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ازل سے ہوتی آئی ہے۔ انسان پیدا ہوں گے۔ بڑے ہوں گے۔ ایک دوسرے کو پسند کریں گے۔ ایک دوسرے کو فراموش بھی کریں گے۔ لیکن یہ دیوار— یہ دیوار جو سامنے کھڑی ہے کبھی نہ گرے گی— میں ہمیشہ غیر محفوظ رہوں گی۔ فواد نسیم احمد تم بھی میری حفاظت نہیں کرسکتے۔

"اینٹ کے پتے ترپ بن گئے ہیں—" پھر اس نے گنگنانا جاری رکھا۔

"میرا!" لیلےٰ اور اسٹیلا نے برآمدے میں آکر آواز دی۔ پھر وہ تینوں ندی کے رُخ برساتی میں آکر کھڑی ہوگئیں۔

"تم مسٹر و شاریہ کے ساتھ جا رہی ہو۔" کرنل بلگرامی نے فیصلہ کن انداز میں اسے حکم دیا۔ "ابھی انھوں نے لکھنؤ فون کیا تھا۔"

"ہاں۔ تم مسٹر و شاریہ—" لیلےٰ نے ایک فرمانبردار بیوی کی طرح اپنے شوہر کا حکم دہرانا چاہا۔

"میں فواد کے ساتھ واپس جا رہی ہوں۔" میرا نے کہا۔ تاکہ فواد تم میرے سامنے اپنی ہار نہ مان سکو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ہم شادی کرنے کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ لیکن پچھلے دو گھنٹوں سے یہاں ہر طرف مستقل تقریریں ہو رہی

ہیں۔" اس نے بور ہو کر فواد کو مخاطب کرنا چاہا۔

"تم مسٹر وشاریہ کے ساتھ جاؤ گی۔" کرنل بلگرامی نے غصے سے خاص کیولری کے انداز میں فرش پر پیر پٹکے اور ان کی مونچھوں سے چنگاریاں نکلیں۔ "مسٹر وشاریہ۔" انھوں نے آواز دی۔

لیکن مسٹر وشاریہ کافی دیر ہوئی وہاں سے رخصت ہو چکے تھے اور اس وقت لکھنؤ روڈ پر کافی دور نکل گئے تھے۔

"فواد۔" ضدی بچوں کی طرح کرنل صاحب کی بات کاٹ کر ہیرا نے پھر پکارا لیکن فواد بھی جا چکا تھا۔

۴۷

ییتی کے باغ میں سے نکل کر فوادِ ساحل پر آیا۔ کار ایک طرف روک کر اُس نے بے اعتنا پانی پر نظر ڈالی اور اسے ایک طرح کی تقویت کا احساس ہوا۔

اب تک میں ایک خیال تھا۔ اب میں پھر فواد ہوں۔ اب میں تم کو ایک خیال میں تبدیل کر کے سایوں کے سپرد کرتا ہوں۔ میرے اور تمہارے درمیان محض اتفاقات کا ایک اجنبی پل تھا جسے میں نے ایک اور اتفاق کے ذریعے ٹوٹ جانے دیا۔

درختوں کے پتے سرسراتے رہے۔ گویا اس کی باتوں کا زیادہ نوٹس نہ لیتے ہوں۔ اس نے جھک کر پانی کو چھوا۔ اور اس کا اطمینان یکلخت پھر رخصت ہو گیا۔ ہوا خوفناک ہے، اس نے محسوس کیا اور وقت میں ہلاکت ہے۔ میرے دماغ میں صرف تم ہو اور میری روح آنکھیں کھولے پوری طرح جاگ رہی ہے اور اب کسی طرح سونے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ کار کی طرف جا کر وہاں سے روانہ ہونے کی اس نے پھر ہمت کی۔ ابھی عناصر کی خاموشی؛

بہرحال رفاقت اس کے لئے موجود تھی۔ خلا نے اسے مدعو کیا۔

دلّی۔ اسے یک بیک خیال آیا۔ دلّی واقعتاً اتنی دور نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے۔ وہاں ریاض ہے۔ اس سے مل کر وہ نادرہ سے ملاقات کی غرض سے واشنگٹن جائے گا۔

پونم وشاریہ کی کار کے پیچھے پیچھے اس کی کار بھی سڑک پر آگئی۔

رات کے دھارے اور بڑھتے ہوئے فاصلے نے پچھلے سارے انسان، سارے ایسوسی ایشن یک قلم مسترد اور موقوف کر دیئے۔

بے حد آسان — اس نے سیٹی بجا کر کار کی رفتار تیز کرتے ہوئے سوچا — بھاگ نکلنا دراصل کس قدر آسان بات ہے۔ فیصلہ کرنا اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ اور یہ زندگی کا صرف ایک حصہ تھا۔ ہزاروں لاکھوں انسان ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں دنیائیں۔ اتنے سارے قصّے۔ واقعے۔ جذباتی تجربے مائی لفٹ فُٹ — اسے خوشی ہوئی کہ وہ اتنے سارے لوگوں سے، کسی سے بھی وابستہ نہیں۔ اپنا ذاتی معاملہ وہ ہمیشہ خود ہی رہے گا۔ کائنات نے پھر ادگھنا شروع کر دیا تھا۔

وسعت نے اسے دوبارہ اپنی طرف بلایا اور خوش آمدید کہا۔

۳۸

اب میں دوسرا فیصلہ کرتی ہوں۔ میرا نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔ مجھے الموڑے ٹرنک کال کرنی ہے۔ اس نے ایکسچینج سے کہا۔

(وہ کانپور سے واپس آچکی ہے۔ کل صبح غالباً پونم وشا ریہ ہاتھ میں منقش تلوار لئے اور صافہ باندھے برساتی کی سیڑھیاں چڑھے گا اور بابا کے پاؤں چھوئے گا۔

کل صبح گوپال پور کے علی بہادر کو ضمانت کی رقم داخل کرنی ہے جو وہ کہیں سے حاصل نہیں کر سکتا (اس نے سوچا تھا۔ فواد اور وہ مل کر کسی طرح علی کے لئے روپیہ فراہم کریں گے۔ اب اس سمے سے، اس کو اپنے راستے پر خود چلنا ہے)

"ہلو — ہلو — ٹنگر دادا —؟ اماں دیدی —؟" اس نے رک رک کر کہا۔ "اماں دیدی میں معاہدہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے بعد میں دو سال تک ٹروپ میں بھی شامل رہوں گی۔ آپ مجھے جلد از جلد کنٹریکٹ کا کتنا روپیہ فوراً بھیج سکتی ہیں؟"

"میرا بی بی! یہ تم ہو۔" بھاؤ یو برمن جی نے جواب دیا "بی بی۔ سنٹر تو بند کر دیا گیا۔ سب لوگ مدراس روانہ ہو چکے ہیں۔ فلم کی کاسٹ مکمل ہے۔ اب کوئی نیا کنٹریکٹ نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی دادا کوئی توڑ بھی نہ کریں گے۔ کیونکہ سب لوگ فلم میں جٹے ہیں۔"

اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کھول کر انہیں دیکھا۔ وقت کا جوالا مکھی اب خاموش ہو جائے گا۔

"میرا!" اروِن نے آواز دی۔ "تم کہاں ہو؟" وہ سگریٹ سلگاتا گیلری میں آیا۔ "تازہ خبر کیونکے یہ ہے کہ عالیہ باجی شادی کر رہی ہیں۔ انھوں نے ابھی آکر ہم لوگوں سے کہا۔ کہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ انہیں صاحب سے بیاہ کر رہی ہیں جو بہار میں کسی بہت بڑی زمینداری کے مالک ہیں اور دو ہزار تنخواہ پاتے ہیں۔ وہ آتے ہی اپنے روپے سے ساری بگڑی بنا لیں گے اور نواب رضا قاسم کا دماغ بھی ٹھیک کر دیں گے" اس نے خوشدلی سے سگریٹ کا دھواں میرا کے چہرے پر چھوڑا۔

"اچھا۔" وہ اطمینان سے ٹیلیفون کی میز کے پاس کھڑی رہی۔

"کیا بات ہے۔" اروِن نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ "تم ممی سے کہدو۔ پونم دشارہ صاحب کے ساتھ میری لگن کے انتظامات مکمل کر لئے جائیں۔"

"میرا رانی۔" اروِن نے اس کے قریب آکر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ماشاء اللہ سے سینٹ بننا چاہ رہی ہو۔ یہ بھی کچھ قربانی وغیرہ کا سلسلہ ہے۔ سوسائٹی کے قوانین کی فتح اور بیچاری خاموش کمزور ہندوستانی لڑکی کی شکست وغیرہ وغیرہ۔"

"بالکل نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اپنی مرضی سے تم کو اطلاع دے

رہی ہوں کہ میں یعنی کماری میرا تنی راج ونش ایم اے ایل ایل بی بیچلر آف میوزک، ماہرِ رقص ہندی ادب کی مشہور شاعرہ، بعوض سوشل سیکیورٹی، معاشی اور سماجی برتری اور ضمیر کے ظاہرا اطمینان کے، اپنی کامل رضامندی سے شری پونم ہیشور دستار یہ کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس پونا سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

"لیکن میرا ڈارلنگ! تم نے سوچ لیا ہے ـــ؟" اروِن نے ترحم انگیز انداز سے پوچھا۔

"اروِن کمار راجونش۔ آج سے میں سوچنا ختم کر چکی ہوں۔ آج کے بعد سے میں لیلے بلگرامی کی سی زندگی بتاؤں گی ـــ اور تمہیں اپنے ہاں پارٹیوں میں بلایا کروں گی۔ میرے پیارے اکلوتے بھائی شری اروِن کمار سے ملیے جو سوچنے کا بے حد شوقین تھا۔ وہ اپنے کمرے کی جانب چلی گئی (جو اروِن کو ایک لمحے کے لیے خاصا میلوڈرامیٹک لگا غضب خدا کا۔ کیا میرا کی سائیکولوجی بھی بالکل تباہ ہو گئی ـــ وہ اس نے ہڑبڑا کر میرا کے کمرے کا رُخ کیا)

"اروِن ـــ" مہندر چاچا نے اپنے کمرے میں سے آواز دی۔

"جی بابا ـــ" وہ گیلری میں سے اُلٹے پاؤں واپس ہوا۔

"تم لوگ جو باتیں کر رہے تھے۔ وہ ابھی میں نے سُنیں۔ میں باون سال سے اس دنیا میں زندہ ہوں۔ موت بہت جلد میرے نزدیک آ رہی ہے اور یہ پہلی ٹھکانے کی بات ہے جو میری زندگی میں وقوع پذیر ہو گی۔ میں اس طرح یہاں سے جانا چاہتا ہوں جیسے ابھی اٹھ کر گولف کھیلنے چلا گیا ہوں ـــ تم لوگوں کو مجھ سے خفا نہ ہونا چاہیے۔" مہندر چاچا نے آہستہ آہستہ کہا۔

"ہم کہاں خفا ہیں بابا ـــ" اروِن نے بچوں کی طرح آنسو روک کر جواب دیا۔

"بکو مت۔" انھوں نے پیار سے اُسے ڈانٹا۔ "میرا قصور کیا ہے ۔۔ یہ زندگیاں تمہاری ہیں۔ تمہارا زمانہ ہے۔ میں تو کچھ عرصے کے لئے تمہارا محافظ تھا محض لوکل گارجین۔ ۔۔ اور تم یہ نہ سوچنا (مع تکیوں کے سہارے بیٹھے رہے) کہ میں انت سمے کوئی نہایت رقت خیز تقریر کرتے ہوئے تم سب کو خدا حافظ کہوں گا۔ میرا اسے کہو کہ وہ یقیناً فواد سے شادی کرلے۔ لیکن میں جانتا ہوں ۔۔ میں جانتا ہوں کہ فواد کبھی اس سے شادی نہ کرے گا۔"

"بابا بیکار میں پریشان ہوتے ہیں۔" اروِن نے اور زیادہ سٹپٹا کر کہا۔

"فواد کہاں ہے ۔۔؟" انھوں نے آنکھیں کھول کر مطالبہ کیا۔ "کل سے اب تک علی اور سب لوگ برابر میرے پاس موجود رہے ہیں۔ لیکن وہ اب تک مجھے دیکھنے کیلئے نہیں آیا۔"

"فواد ۔۔" اروِن نے بروقت کوئی قابلِ قبول جھوٹ بولنا چاہا ۔۔ "دراصل خالہ بیگم اس کی شادی طے کر رہی ہیں۔ اس لئے اسے کل بردکھوے کے لئے ۔۔ وہاں ۔۔ کیا کہتے ہیں اسے ۔۔ جھانسی جانا پڑ گیا۔"

"جھانسی ۔۔؟ جھانسی میں کون ہے ۔۔؟" مہندر چاچا نے اب نسبتاً اطمینان سے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوال کیا۔ "میں نے ہمیشہ کہا کہ فواد کو اپنے گھر کی لڑکی راحیل سے بیاہ کر لینا چاہئے تھا۔ مگر کیا سر پھرے لوگ ہیں۔"

"جی ہاں۔ بابا۔" اروِن نے آہستہ سے کہا۔

"سنو ۔۔ اروِن بیٹے ۔۔" مہندر چاچا پھر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "تہذیبی رشتہ ناطہ۔ تصوف کے مسائل۔ قومی اور سیاسی یگانگت بالکل دوسری چیز ہے۔ لیکن دوسرے مذہبوں سے شادی بیاہ کے سلسلے قائم کرنے کا میں ابھی قائل نہیں ہوا ہوں۔ اگر ہمارا

علی بھی کسی غیر مسلم لڑکی کو بیاہ لائے تو مجھے اتنا ہی شدید رنج ہوگا۔ یہ بالکل ناقابلِ عمل ہے۔ بالکل ناقابلِ عمل —— لیکن اگر ایسا ہونا لازمی ہے تو میں کچھ نہ کہوں گا ——"

"بابا بیکار میں پریشان ہوتے ہیں۔" ارون نے پھر دہرایا۔

"گایتری منتر سناؤ —" انھوں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ "لیکن امریکن لہجے میں نہیں — جیسے کہ سناتن دھرم کالج کی طرح سے تمہیں پڑھنا چاہیے۔" پھر انھوں نے پُرمذاق انداز میں ایک آنکھ آدھی کھول کر گویا شک وشبے کی نظروں سے اسے دیکھا۔ "لیکن شاید تم سناتن دھرم نہیں ہو۔ نہ تم کانسٹھ ہو۔ تم سب کے سب نہایت قابلِ رحم فلسفی اور مسخرے بن کر رہ گئے ہو ——!!

ارون نے فرمانبرداری سے کشن چیئر پر بیٹھ کر جتنے بھی اشلوک اسے یاد رہ گئے تھے۔ جلدی جلدی دہرانے شروع کر دیے تا کہ بابا خوش ہوجائیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہر اندھیرے باغ میں جاکر دہاڑیں مار مار کر روئے۔ کیونکہ اپنے بابا پر وہ جان دیتا تھا۔

"کرمن کی گت نیاری رے اودھو ——" پوجا کے کمرے میں اندرا نے بھجن شروع کر دیا تھا۔

اس رات دو بجے جس وقت ابا جان کا انتقال ہوا تھا۔ اس سے ٹھیک ایک گھنٹہ پہلے مہندر چاچا بھی ختم ہو گئے۔

مہندر چاچا، یعنی راؤ بہادر مہندر کمار راج ونش ابھی ریٹائر نہ ہوئے تھے اور اگلے مہینے گورکھپور ڈویژن کے کمشنر ہو کر جانے والے تھے۔ تیس سال تک ہمارے اور ان کے گھرانے کا ساتھ رہا۔ صبح چھ بجے ان کی ارتھی اٹھائی گئی اور گومتی کے کنارے ان کے اکلوتے

لڑکے ارجن کمار نے شمشان گھاٹ پر اپنا آخری فرض انجام دیا۔

شری پونم بھیشور وشاریہ اگلے روز تعزیت کے لئے تشریف لائے۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ بہت رعب داب والے آدمی تھے اور نہایت رکھ رکھاؤ سے گفتگو کرتے تھے۔ دو دن بعد وہ پونا واپس چلے گئے۔

کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اپنے اور راج ونش خاندان کے ایک مشترکہ دوست کو خط لکھا کہ چند گوناگوں مجبوریوں کی وجہ سے میر انجمنی سے شادی کا ارادہ ان کو ترک کرنا پڑا ہے۔ گوناگوں مجبوریوں میں سے ایک دراصل یہ بھی تھی کہ فواد کے قصے سے قطع نظر، میرا جواب تک ایک کمشنر کی بیٹی تھی۔ اپنے باپ کی موت کی وجہ سے اب محض میرا رلچونش رہ گئی تھی

نمبر بائیس کو مقفل کر کے وہ سب چند مہینوں کے لئے ڈیرہ دون کے راج محل چلے گئے۔

۳۹

یہ کیسا سکوت ہے جیسے جو الا مکھی ہے جواب چپ ہے۔ رات کا ویرانہ۔۔۔ سڑکیں
جو اپنی ہیں۔ ہر کرنہ۔ ہر پتھر۔ مکانوں کے پور پچ۔ کھڑکیاں اندھیرے میں متحرک ہیں۔ وحشتناک
طریقے سے خاموش ہیں۔ سائے تاریک چھتوں والی گلیوں میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے
ہیں۔ ابھی ابھی جو انسان سامنے سے گزرا تھا۔ یہ کسی گلی میں جا کر مجھے قتل کرے گا۔ جو لڑکی
موڑ پر جا رہی تھی شاید اس نے پل پر پہنچ کر اپنے آپ کو دریا میں گرا دیا۔ مندر کی گھنٹیاں
رات کی اسی خطرناک اسکیم کے زیر اثر اپنی آواز کی تکرار سن کر موربذ طریقے سے خوش
ہوتی ہیں۔ دلکشا کی دیواروں کے نیچے رات مجھے واجد علی شاہ کا بھوت ملا۔ ریذیڈنسی کے
انگریزوں کی روحیں اپنی اپنی قبروں کے پتھروں پر بیٹھ کر تاش کھیل رہی ہیں۔ سرخ پردوں والے
کمروں میں عجیب عجیب سازوں پر انوکھے راگ چھیڑے جا رہے ہیں۔ جن کو کسی نے نہیں سنا۔
میری تصویروں کے سارے رنگ پانی کی لکیروں کی طرح سڑک پر بہہ رہے ہیں۔ گھاس پر

گتے سُرخ زبانیں نکالے ہیں۔ شہر کی دور افتادہ گلیوں میں وہ سارے کردار زندہ ہو گئے ہیں۔ جنھوں نے سرور کے مرقعوں کو آباد کیا تھا۔ سبزی منڈی میں، چوک میں کسی بسنز رنگ کے بلند دو منزلہ مکان میں رات کے اسی لرزہ خیز طلسم کے ماتحت کسی رقاصہ کے گھنگروؤں کی آواز نکلتی ہے۔ ایسراج پر کسی نے گانا شروع کر دیا ہے۔ ساون جھڑ لاگے ہو دھیرے دھیرے —

چُنر موری بھیجے ہو دھیرے دھیرے۔ دھیرے دھیرے —

خداوندا — میں نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے ہیں — رات نے مجھے محصور کر رکھا ہے۔ میں کہیں نہیں جا سکتی۔

لیکن وقت زندہ ہے۔ ہمیں ختم کر رہا ہے۔

وقت لحظہ بہ لحظہ آگے بڑھ رہا ہے۔

سن انیس سو سینتالیس۔ پھر ایک اور مستقبل ہے جس کی اور ایک پل بنا کر ہم لوگ جانا چاہتے تھے۔ لیکن وہ پل ایک دھماکے سے ٹوٹ چکا ہے۔ علماء اپنی بحثیں خود نہیں سمجھ پائے۔ سیاستداں اور فلسفی اچکّوں کے ساتھ برج کھیلنے میں مصروف ہیں۔ چنانچہ میں بھی پھر ان ہرے جھنڈوں کے نیچے موجود ہوں۔ ہمارے پاس تجربہ نہیں۔ اور ہم کتنے کم عمر تھے۔ کھلتے ہوئے محفوظ پھول۔ بدقسمت پتّے جو کل ٹوٹ جائیں گے۔ جو ہوا کے سینے میں میری آواز۔

حسبِ معمول، یہ دہرہ ہے۔ برآمدے کا سفید جنگلہ۔ سیب کی ٹہنیاں۔ "آشیانے" کی سُرخ جگمگاتی ہوئی چھت۔ نیلا کہرہ اور بارش۔ کوہستانی جھیلیں اور ندی جس کے کنارے پرانے عزماں رداوی آنا کے دالتس اور بیتے زمانے یاد کرتے ہوئے

چپ چاپ ٹہلتے ہیں۔

آرچ بشپ کے باغ میں سُرخ پھول لہلہا رہے ہیں۔ جہاں آئمر جینوا کی کہتریں کا مطالعہ کرتا ہے اور خدائے قدوس کے مینٹش اپنے عقیدے سے متزلزل کر رہے ہیں۔

میں یہ سب کچھ بھول کر بہت خوش ہوں گی۔

میرے لئے گھنٹیاں بجاؤ۔۔ میرے لئے گھنٹیاں بجاؤ۔

۴۰

"تم نے ویسپرز کی گھنٹیاں سُنیں ـــ؟" میرا نے پُرسکون آواز میں کہا

میں نے بے خیالی سے دہرایا

دل میں بے چینی اور محبت کا رنج ہے۔ کہ سنسناتی ہوا شور مچاتی ہوئی گذر رہی ہے۔ دن بھر اور رات بھر، میں اس سرخ صوفے پہ بیٹھی ہوا کے چلنے اور پانی کے بہنے کی آوازیں سُنتی رہتی ہوں ـــ میرا نے کہا

اس نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ آبشار کا شور تیز ہو گیا۔

بالآخر الفاظ کا ذخیرہ اب ختم ہو گیا ہے۔ دماغ میں محض ایک خلا ہے۔ لیکن میں تم سب کو اپنی شام کی دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ میں نے سوچا

دفعتاً ارنسٹ اندر آیا اور خاموشی سے دیوان کے ایک کونے پہ بیٹھ گیا۔

ـــ یہ میرے ہاتھ ہیں۔ ان کو دیکھو ـــ خالی خالی نگاہوں سے وہ اپنی انگلیوں کو

دیکھتا ہے۔ سنو ــــ سات سال تک ــــ سات سال تک ان ہاتھوں کو معطل کر دیا گیا تھا۔ سات سال میں تمہارے اس خوبصورت راج محل کے پیچھے جنگلوں میں نظر بند رکھا گیا ـــ میں نے کسی کا کیا جرم، کیا نقصان کیا تھا۔ ان ہاتھوں سے میں نے محض آرٹ کی تشکیل کرنا چاہی تھی۔ اب شاید میں بھی بہت جلد مر جاؤں ــــ تم مجھ کو اپنی شام کی دعاؤں میں یاد رکھو گی؟" اُس نے جھک کر مجھ سے سوال کیا۔

"آج مجھے مریم صدیقہ کی خانقاہ کے باغ میں خاموشی سے ٹہلتا ہوا ایلم رکیسٹن نظر آیا تھا (وہ غالباً یہاں گرمیاں گذارنے آیا ہے) کیا ــــ کیا ہم سب ایک دوسرے کے لئے پراسرار شخصیت کر سکتے ہیں؟" اس نے کچھ دیر بعد پھر کہا۔

"دیکھو ــــ" میں نے اس کے قریب آ کر افسردگی سے اس سے کہا۔ "ہم اپنے تصورات کو کتنی مضبوطی، کتنی شدت اور آن سے سنبھالے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کو اپنے ناچ کی لَے، تصویر کے رنگ اور الفاظ کے سحر میں ڈھالا۔ میرا کی یہ کویتا میں کس کام آئیں گی ــــ ہم اپنے آپ کو کسی طرح بھی دوسروں تک نہ پہنچا پائے۔ میں ہنس کے اوراق الٹتی پلٹتی رہی ــــ آرٹ ــــ یہاں آرٹ نہیں ہے ارنسٹ برومیل ــ جرم بھی غلطیاں ہیں۔ زندگی کی مجبوریاں اور زیادتیاں ہیں۔ مختلف شخصیتیں ہیں۔ تم جرمن ہو میں مسلمان ہوں۔ میرا ہندو ہے۔ ایکیر یطانوی ہے۔ یہاں آرٹ کا کیا تذکرہ۔ رُوح نہیں ہے۔ ابدیت نہیں ہے۔"

یہ دتیمرہ ہے۔ وہی جگہیں۔ مہابلیپ کا وہی ایک دور۔ اور رسپنا اُٹھلاتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ راحیل دریچے میں کھڑی شام کی نارنجی روشنی کو دیکھتی رہی۔

نیرا نے اس کے نزدیک کھڑے ہو کر بے خیالی سے دہرایا۔ "سنو۔ ویسپر کی گھنٹیاں

بج رہی ہیں:

"میرا — میرا زینا — میرا ایل — گھنٹیوں کی گونج ٹھہر گئی —

"ماریا زینا —" ایمر نے سیب کے پتوں کو روندتے ہوئے دریچے کے پیچھے آکر کہا۔

"ہاں - تم بھی اندر آجاؤ ایمر - آج ۹ رجون ہے اور ہم غالباً زیادہ عرصے تک اس طرح زندہ نہ رہ پائیں گے —" اسٹیلا نے دیوان پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ایمر کمرے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا جو باغ میں اترتی تھیں "سنو۔ سینٹ این" اس نے جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے حسب معمول مجھے بہت غور سے دیکھ کر جیسے کچھ پہچاننے کی کوشش کی: "وقت بہت تیزی سے بھاگتا جا رہا ہے اور میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ سنو" — اس نے رک کر سوال کیا: "سنو۔ تم نے کبھی روح القدس کے خلاف گناہ کرنا چاہا ہے —؟"

زندگی کے اس برفستان کی تاریکی میں ہم عمر بھر چلتے رہے۔ وسعت کی اس دیوانگی میں اس روشنی نے اپنی بے نور آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور ہم کوئی راستہ تلاش نہ کر پائے اور ہمارے باوجود آج کی تاریخ آن پہنچی۔ اب ہم اس طرح کیوں گھٹتے ہیں تم کیوں نہیں جا کر صدیقہ مریم کے باغ میں ٹہلتے — ہمارے گناہ کتنے ہیں۔ کتنے ہیں —

ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھہر گئی ہے۔ ہم خاموشی سے اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔

لیکن مہاکلپ کا دور رہے گا — ابدیت رہے گی — رحیل نے ندی کے

پانی کو دیکھا۔

آدھی رات پربھو درشن دیجیے، یمونا جی کے تیرا ــــ شام کی روشنی میں نارنجی ساریاں پہنے وہ سب دفعتہً دریچے کے سامنے آگئیں۔ ان کے ہاتھوں میں تان پورہ، کھڑتال، آرتی کی تھالیاں اور تیل کے جلتے ہوئے دیوٹ تھے۔ انند مرتی ماں کی پوجا جو راج محل میں برسوں سے ہوتی آئی تھی۔ اس کا سمے آج بھی نہ بدلا تھا ــــ اندرا جوگ مایا، ریحانہ طیب جی، میرا النی، وہ سب سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئیں۔ ایٹمرا ایک ستون سے سہارا لگائے اپنی جھلملاتی آنکھوں سے ان کو دیکھتا رہا۔

من چاکر راکھو جی ــــ من چاکر راکھو جی ــــ راحیل نے دہرایا ــــ دلسراج کے تار۔ طبلے کے بول۔ پیانو کا "سی مائنر" ــــ میری روح ان کے ساتھ ہے۔ لیکن کہیں دور چلی گئی ہے ــــ میں واپس آؤں گی۔ میں تم کو ڈھونڈوں گی۔ مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ مجھے تم سے یہ ساری باتیں کہنی ہیں۔

ہے گوبند راکھو جرن اب تو جیون ہارے ــــ اب تو جیون ہارے۔ اندرا کی آواز اب جارہے ہیں پھیل گئی ہے۔ لرزاں ہے۔ گونجتی جارہی ہے۔

گوپالا ــــ گوپالا ــــ

اب تم کہاں ہو ؟

اب تو جیون ہارے ــــ یہ میری روح کا گیت ہے۔ روح تم کہاں ہو۔ میں کھو گئی تھی روح نے جواب دیا۔ ورندابن میں بھی میں تم کو نہ ڈھونڈ پائی۔ آدھی رات کو پھولوں کے بڑھنے کے سمے، برکھا کے پہلے قطروں کے ساتھ، میں نے تمہارے وجود کو اپنے میں محسوس کیا ہے۔ تم گوپالا ہو ــــ میں تم کو پاؤں گی ــــ راحیل دریچے میں سے ہٹ گئی۔

اندرا کا گیت جاری رہا۔ اروَن الیسراج بجا رہا تھا۔

راودھیکا ۔۔۔ گیت نے کہا ۔۔۔ میں چل رہی ہوں ۔۔۔ میں چلتی رہوں گی ۔۔۔ میں چلتی رہوں گی ۔۔۔

مجھے تمہارے قریب پہنچنا ہے۔

لیکن اس وقت میں کہاں ہوں ۔۔۔؟ کلجنت راحیل نے چاروں اور دیکھا ۔۔۔ اور اپنے ہاتھ دریچے کی سفید چوکھٹ پر پھیلا دیے ۔۔۔ گوپالا ۔۔۔ میں اس وقت کہاں ہوں ۔۔۔؟ تم کہاں چلے گئے ہو ۔۔۔ کیوں چلے گئے ہو ۔۔۔

اب نرجیون ہارے ۔۔۔ سندھ کے کنارے ۔۔۔ ہے گووند۔ ہے گووند ۔۔۔

اندرا نے گایا۔ اب نرجیون ہارے ۔۔۔

"نرا تری ۔۔۔" اروَن نے آنکھ بند کر کے کہا: "کیسی سہانی روشنی ہے۔ تم لڑکیاں ۔۔۔ آج نہ ناچو گی ۔۔۔؟ جو عمر بھر ناچتی آئی ہو ۔۔۔" اس نے انگلی اٹھا کر سوال کیا۔

اروَن، تھرڈ کیولری کا منقش یونیفارم پہنے بامٹیں کرٹ کی ساری زرنگار زنجیریں لگائے اور کلوک اوڑھے خاموشی سے مسکراتا تھا۔ اب وہ بالکل خاموش ہے۔ (اور سوچا انھوں نے اب تک کیا کیا ۔۔۔ للہ بتلاؤ بہ! تنے انگریزی گانے کیوں گاتے تھے۔ آئی آئی پی پی۔ وہ پہاڑوں پر سے اترے گی ۔۔ وہ گلابی پاجامہ پہنے آئے گی۔ آئی آئی پی پی۔ ہندوستان کے اوپری متوسط طبقے کی یہ وہ نسل تھی جو انگریزی گورنسوں اور مورس ناچوں کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ عجیب ترحم انگیز اور مضحکہ خیز دور رہا ہے یہ لوگ زندہ رہے تھے۔ اپنے آپ کو یہ ہندوستان کی پرانی فیوڈل تہذیب کا وارث بھی گردانتے تھے اور ہر وقت اپنی تعریف

کرنے میں معروف رہتے تھے۔ اب عنقریب یہ لوگ اپنی اس سارے تہذیب و تمدن کے بکھیڑے کو چھوڑ کر سرحد پار بھاگنے والے تھے۔ فواد، ان ہی میں سے ایک پہلے ہی سرپٹ نکل گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے جذباتی اور ذہنی طور پر اس منظر سے الگ ہو کر میں نے سوچا کہ اگر میں ایک ترقی پسند تنقید نگار ہوتی جو کہ صد افسوس کہ میں نہ تھی، تو اپنی زندگی کے اس ویژن پر یوں روشنی ڈالتی۔ میں نے ایک آنکھ کھول کر رنج کی نظروں سے اپنی پیاری علم زادہ بہن اسٹیلا عباسی کو دیکھا۔ لڑکیاں دیئے اٹھائے گھاس پر آ گئیں۔ پوجا ختم ہو رہی تھی۔ آخری گھنٹی جو آپ نے بجائی۔ آخری گھنٹی جو ——

"گویا اب ہم اپنا اظہار کر سکتے ہیں ——" ایک پیڑھی پر بیٹھ کر پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے میرابائی بولی۔

"میرا آبل —— میرا آبل ——" ایلمرسٹون کے سہارے بیٹھا رہا۔ "میں تم کو دیکھتا رہوں گا۔ آندھیوں اور طوفانوں میں میں تمہاری آواز سنتا رہوں گا۔ میرا آبل مجھے یہاں سے نہ نکالو۔ میں تمہارے وجود کا ایک حصہ ہوں۔ میں تم سب کے بنا کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں اپنے الطار پر تمہاری تصویریں سجاتا ہوں۔"

(اظہار —؟ کردار نگاری؟ اوپیرا؟ بیلے۔ میلوڈرامہ۔ ہلکی کامیڈی ناول کا درڈ کی طرز کی ——؟ یا ابسن۔ گالزوردی۔ واٹ ناٹ۔ واہ۔ واہ —— واہ۔ اس میں کیا فرق ہے صاحب۔ آپ مس راج ونشن ہیں۔ ہیرانو۔ مس حمیدہ بھی ہیرانو ہیں۔ مس عباسی بھی۔ واہ واہ ماشا اللہ ہے۔ کرنل راجونشن ٹینر ہیں۔ عمر بھر اس کے علاوہ آپ نے اور کیا کیا ہے)

کرنل راجونشن کی اسٹین گنیں باہر موجود ہیں۔ جی ہاں۔ آپ جھک مارتے ہیں قبلہ

سکھوں نے دھاوا بول دیا ہے ڈون ویلی پر۔ نزدیک کی ہمسایہ سکھ ریاستوں سے کمک پہنچتی ہے۔ جیپل ہل بیٹھ کر ایلمر کیشن یو کرانسٹ کو ٹکٹکی باندھے تک رہا ہے۔ خداوندا یہ تیرا خون ہے۔ جس میں ہم مرتے ہیں۔ یہ تیرا گناہ ہے جس میں ہم زندہ ہیں۔

یہ ہماری ازلی اور ابدی قربان گاہ ہے۔ یہ ہماری ازلی اور ابدی اسٹیج ہے۔ یہ ہمارے بھجن ہیں۔ یہ ہمارے گیت ہیں۔

سڑکوں پر خون کے نالے بہہ رہے ہیں ہمالیہ کی شفاف ندیاں ارغوانی ہیں۔ ہمالیہ کی اندربالا رسیتنا مدھم سروں میں بہہ رہی ہے۔ یہ میرا بہت پیارا آشیانہ ہے جو میرے باپ نے بنایا تھا۔

اسٹیج — ۔ کوالٹی اسٹریٹ ؟ ؟ یہ کوالٹی اسٹریٹ کے سارے کردار ہیں۔ ریاض تم کہاں ہو۔ تم نے یہ سارے کردار دیکھ لئے تھے۔ ساحل دریچے میں سے ہٹ آئی۔ ارنسٹ اس نے سیڑھیوں پر آکر آہستہ سے آواز دی۔

لیکن ارنسٹ بروملی کو اب ایسی چپ لگی ہے کہ وہ نہیں بولتا۔ وہ خاموشی سے سنجیدگی کے ساتھ شمعدان اکٹھے کر رہا ہے۔ کمروں کے سارے دبیز نیلے اور سُرخ پردے نکال کر اس نے باہر لا ڈالے ہیں نشست کے کمروں کے تخت اور دیوان باہر جن کر ہتھوڑے اور کیلیں سنبھالے باغ میں بچوں کے سے انہماک کے ساتھ وہ اسٹیج تیار کر رہا ہے۔

"اب میرا ناچے گی — میاں صاحبزادے"۔ ارنسٹ بروملی نے اپنے زرد بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر سے ہٹائی اور خوشی سے نظریں اٹھا کر سب کو دیکھا، اور ڈنگل پہنے، ہاتھوں میں اوزار لئے پرانے مشاق اور اپنے کام کے عاشق اسٹیج ڈائریکٹر کی طرح

گویا ابھی ابھی وہ بمبئی ٹاکیز کے کسی اسٹوڈیو سے باہر نکلا ہو۔ سیڑھیوں پہ آ کر اس نے علی اور اروَن کو آواز دی۔

اروَن نے اجنبی نگاہوں سے اس کو دیکھا "کیا بات ہے ارنسٹ — تم کیوں تھک رہے ہو۔ جا کر سو رہو۔ ڈاکٹر نے تم کو مکمل آرام کا حکم دیا ہے۔"

اس نے ضدی بچوں کی طرح اپنے ہاتھوں کو رومال سے رگڑ رگڑ کر انہیں غور سے دیکھا — سات سال — اس نے دہرایا۔ سات سال ان ہاتھوں کو مفلوج رکھا گیا۔ سات سال سے یہ ہاتھ اسٹیج کے پردوں کو چھونے اور مناظر کی تخلیق کے لئے بیتاب رہے۔ اس نے مڑ کر آہستہ سے میرا کو پکارا۔

لڑکیاں سیڑھیوں پر آ گئیں۔ اس نے ان کے لباس پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ "اب ہم ایک گرینڈ ریہرسل کریں گے۔" ریہرسل روم کی پرانی آواز میں اس نے سب کو مخاطب کیا۔ پھر اس کا چہرہ خوشی سے تمتمایا۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ گویا کاسٹ کے افراد کو ریہرسل کا پروگرام بتاتا ہو — "پھر ہم بیلے بنا کر ڈیرہ بی کریں گے میرا آرائی۔ اگر کلیتا بن گیا تو کیا دکھ ہے۔ ہم ایک اور کلیتا بنائیں گے۔"

"اب ہمیں پہاڑیوں کے پرے گولیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔" علی نے اروَن سے کہا۔

"پھر ہم مسوری جا کر پرانے وقتوں کی طرح کوئی دن ایکٹ پلے پیش کریں گے۔ ہیک مینز ٹھیک رہے گا؟ مسز ہیک مینز کے کیا حال چال ہیں" — وہ علی کی بات کی ان سنی کر کے کہتا رہا — "آج کل کون سا ڈراماٹسٹ تم لوگوں کو پسند ہے؟ میں نظربندی کے زمانے میں ڈرامے پر ساری نئی کتابیں پڑھتا رہا ہوں۔ میں لاعلم

نہیں رہا۔"

"ارنسٹ ـــ" راحیل نے دریچے میں آکر آہستہ سے کہا: "تمہاری اسٹیج اور ہمارا ناچ دیکھنے اب کون آئے گا ـــ ؟ کیا تم کو پتہ نہیں کہ آرٹ کے گرد نئی دیواریں اٹھادی گئی ہیں اور سڑکوں اور وادیوں میں خون بہہ رہا ہے ـــ ؟ بہت سے مر گئے ہیں ابھی اور مریں گے۔"

"ارنسٹ برومیل۔ کیا تم بھول رہے ہو کہ تم اور ہم سب ایک اندھیارے سے نکل کر دوسرے میں دھکیل دیئے گئے ہیں۔ زندگیاں جیل خانوں اور کنسنٹریشن کیمپوں اور ریفیوجی بستیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہیں۔ دو سال تک میں چکی پیسا کیا اور میں نے قوالیں بنیں لیکن اب بھی ہم اور تم وہیں پر ہیں۔" علی نے آہستہ سے کہا

"ارنسٹ برومیل۔ رات بہت آگئی ہے اور کل صبح جانے کیا ہوگا۔ نظربندی کے زمانے میں جس مرض کا شکار تم ہوئے۔ اس کی ہم کو اطلاع تک نہ ہوئی اور تم کو کرنل روجرز نے حکم دیا ہے کہ اب مکمل آرام کرو۔ اب ہم شاید کبھی اس طرح اکٹھے ہو کر ناچیں گے" میرا نے اسے جواب دیا۔ "ندی سُرخ ہو گئی ہے۔ بہت سے مر گئے ہیں۔ ابھی اور بہت سے مریں گے۔"

"ہندوستان کی مہارانیاں جو پولانیگری کے سے بال بنائے، نصف صدی تک سامنے مسوری کے ایوانوں میں جگمگاتی رہیں، اب خوف زدہ ہو کر اپنے اپنے رنگ محلوں میں جا چھپی ہیں۔ فنکاروں کو مارا جا رہا ہے۔ سیاستدان ڈنر کھا رہے ہیں۔ یہ تاریخ کا سب سے مضحکہ خیز دور ہے۔ بہت سے مر چکے ہیں۔ ابھی اور مریں گے۔" اسٹیلا نے کہا

رات کے اندھیارے میں ہم سب سیڑھیوں پر چپکے بیٹھے رہے۔

"شاید میں مر رہا ہوں —" کچھ دیر بعد ارنسٹ نے کہا۔ "مجھے ایک کمبل لا دو۔ میں تم سب کے پاس یہیں بیٹھا رہوں گا —"

کمبلوں، کشنوں اور پردوں کے انبار پر وہ ضدی بچے کی طرح اوڑھ لپیٹ کر چڑھ کے بیٹھ گیا۔

"ارنسٹ اندر آجاؤ۔" اندرا نے حسبِ معمول سب سے بڑی بہن کی حیثیت سے اسے حکم لگایا۔

دفعتہً اسے پھر تنفس کا دورہ پڑا۔

کرنل روجرز کو فون کرنے کے لیے علی مکان کی طرف لپکا۔ اتنے میں برابر میں آشیانے کے باغ میں یکلخت آگ بھڑک اٹھی اور سرخ روشنی اور دھوئیں نے ہر چیز کو اپنے بھنور میں سمیٹ لیا۔

۴۱

روشنی سے فضا منور ہو گئی۔ میں سیڑھیاں اتر کر ورانڈے میں آ گئی۔ جو میرے گھر کی طرف کھلتا تھا۔

"اروِن"۔۔۔ میں نے آواز دی "میرا گھر جل رہا ہے"۔

اروِن مرمر کی مورت کی طرح ساکت کھڑا رہا۔۔۔ وہ چند لمحوں تک مبہوت کھڑا میرے گھر کی طرف دیکھتا رہا۔ جہاں شعلے اب خوب بھڑک چکے تھے۔ اس کے بعد وہ جمے جمے مضبوط قدم رکھتا سیڑھیاں چڑھا اور میرے پاس آیا۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اس نے احمقوں کی طرح انگلی کا اشارہ کر کے کچھ کہنا چاہا۔۔۔ میں نے محض اس کے ہونٹ ہلتے دیکھے اور اس کی آنکھوں میں آگ تھی۔

پھر یکلخت ساری فضا دھوئیں سے معمور ہو گئی۔ بلوائیوں کی ہا ہا کار، زخمیوں اور دہشت زدہ انسانوں کی چیخیں۔ زندگی، روشنی اور امید کا خاتمہ ہو گیا۔ محض تباہی اس دم گھونٹ دینے والے

دھوئیں کے بگولوں میں زندہ رہی۔

"ارون ــــ میرے بھائی ــــ" میں نے اس اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر اٹھنا چاہا لیکن چاروں اور سے بہت ساری چیزوں نے مجھے دبا دیا تھا اور میری سانس رُکی ہوئی تھی۔

ہم کہاں ہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جہا کلپ کا یہ کون سا دور ہے۔ دھوئیں کے بادلوں کو اپنے چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے میں نے دیکھنے کی کوشش کی ــ کیا یہ نور اتری ہے اَرون میرے دلارے بھیا ــــ یہ کیسا چراغاں ہے ــــ کہیں سے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ کوشش کر کے میں خود کھڑی ہوئی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر میں نے سامنے دیکھا۔

مدھم اجالا تھا جس میں رفتہ رفتہ سارا منظر عیاں ہو گیا۔ دماغ نے جو ماؤف ہو گیا تھا آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کیا۔ یہ سامنے جو جلے ہوئے راکھ کے ڈھیر پڑے ہیں یہ "آشیانہ" ہے۔ جسے میرے مرحوم باپ نے مدتیں گذریں بڑے چاؤ سے تعمیر کرایا تھا اور آج ۹ر جون ہے اور آج اس سمے بالآخر ہم نے اپنی قسمت کا فیصلہ دیکھ لیا ہے۔

"ارون ــ" میں نے خوفزدہ ہو کر پھر آواز دی۔ "ارون۔ میری حفاظت کو آؤ ــــ دیکھو یک بیک یہ کیا ہو گیا۔ ارون کیا یہ قیامت کی رات ہے ــــ؟"

لیکن دھندلکے میں جو سایہ سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔ وہ دوسری طرف مڑ گیا۔

"ارون ــ" میں ڈرتے ڈرتے اس کی جانب بڑھی۔

سائے نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

وہ ارون نہیں تھا۔ وہ کوئی فوجی افسر تھا۔ نئے ہندوستان کی فوج کے بیس برس

افسروں میں سے ایک جس نے تھرڈ کیوٹری کی منقش زرنگار یونیفارم پہن رکھی تھی۔ ایک مرمر کی مورت کی طرح وہاں کھڑا تھا۔

"اسے۔۔ تم اب تک زندہ ہو۔۔" اس نے جھک کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے مجرموں کی طرح خوفزدہ ہو کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جو آگ تھی وہ لپکتے لپکتے اب سرد ہو چلی تھی لیکن موجود تھی۔ دفعتہً گویا اس نے کوئی فیصلہ کر لیا اور پوری طاقت سے اس نے مجھے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔

"میری پیاری دھرم بہن۔۔" اس نے نفرت سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ "سولہ سال تک تم میرے ہاتھوں میں راکھی باندھتی رہیں۔ لیکن آج کی رات میں تمہاری حفاظت کو نہیں آسکتا۔۔ تم نے ایک بار، دریا کے پل پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ کسی خوبصورت رات، جبکہ کائنات اپنے حسن کی تکمیل کو پہنچ چکی ہو گی اور زندگی کی کوئی خواہش باقی نہ رہ جائے گی تو تم خودکشی کر لو گی۔ کیا تم نہیں دیکھتیں کہ وہ مکمل رات آن پہنچی ہے۔۔" اس نے بیحد آزردگی کے ساتھ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "مجھے کہیں سے ایک ریوالور لا دو۔۔ آج کی رات کی خاطر تم نے مجھے سپاہی بننے کے لئے بھیجا تھا۔۔"

میں اسی طرح دہشت زدہ اس کے حکم کی تعمیل میں دبے پاؤں اندر گئی۔ اور گیسٹ روم کی الماری میں سے علی کا ریوالور نکال کر باہر واپس آئی۔

وہ سیڑھیوں پر منجمد بیٹھا تھا۔ تم کن کن باتوں کا بدلہ لینا چاہو گے ارون راجونش۔ دنیا نے ہمیں ہر طریقے سے دھوکہ دیا ہے۔

"مجھے صرف ایک ریوالور چاہئے۔۔" اس نے دہرایا۔

"لو۔۔" میں نے ہتھیار اس کے سامنے رکھ دیا۔ "تم تو مجھے بھی مار دو۔ اگر

اس طرح تم اپنے آپ کو مطمئن کر سکو تو میں بے حد خوش ہوں گی۔" میں نے کہا
رات کی ہوا کے ایک جھونکے سے شعلے پھر بھڑک اٹھے اور آسمان روشن ہو گیا۔
تب میں نے دیکھا کہ اس منظر میں کتنی خوبصورتی تھی۔ خوبصورتی کا انجام کس قدر
نظر فریب تھا۔ اپنا خوف بھول کر میں شعلوں کو دیکھتی رہی۔
"کیا تمہیں بھی نروان حاصل ہو رہا ہے ___؟" ارون نے طنزیہ آواز میں کہا۔
باغ کے درخت جل چکے تھے اور اب وہ فرنیچر باہر لا لا کر اس کے بون فائر
بنا رہے تھے۔ صوفے۔ قالین۔ ابا جان کی کتابوں کی الماریاں۔ ساری پرانی مانوس
عزیز چیزیں۔ روشنی میں ان کے چہرے دہک رہے تھے۔
یک بیک وہ جیسے کسی گہری نیند سے چونک اٹھا "آشیانہ جل رہا ہے"۔
وہ دہاڑا اور احاطے کی باڑ کی طرف دوڑا۔

نیم روشن باغ میں جو گولیاں چلیں۔ ان کی آواز سے سہم کر میں ایک ستون کے پیچھے
چھپ گئی۔ راج محل کے سارے باسی۔ وہ سارے انسان جو شام کو وہاں جمع تھے،
اس کے جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔
مکمل سناٹا چھا گیا۔
پھر اس سناٹے میں ارون کی آواز آئی ___ "دنیا میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ زندگی
کی معصومیت ختم ہو چکی"۔
میں زینے پر آ گئی۔ رات تیزی سے گذرتی جا رہی تھی اور آسمان پر صبح کاذب کا
ہلکا سا دھندلکا بکھر رہا تھا۔ کچھ لوگ، پربھات پھیریاں گاتے مندر کی طرف جا رہے تھے۔

"ادروِن ——" میں نے اسے آواز دی۔ "یہاں آؤ۔ دیکھو کہ پھول کھل رہے ہیں۔ ابھی موسم کے سارے سحر باقی ہیں۔ پھول۔ درخت۔ بارش۔ آسمان۔ زندگی ابھی باقی ہے۔"

"میں جا رہا ہوں ——" پیچھے سے آ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ "دنیا ختم ہو چکی ہے۔ تم مر گئی ہو۔ تلی۔ میرا۔ البرٹ سب نے ایک دوسرے کو نگل لیا ہے۔ اب کیا باقی رہا ہے" اس کی آنکھوں میں کرب اور نفرت اتنی گہری تھی جس کو میں نے اچھی طرح پہچانا۔

"لیکن ہم اب بھی زندہ ہیں ادروِن —— ابھی کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا" میں نے کہا۔

"لیکن آشیانہ جل گیا دیوانی لڑکی —— یہ تمہارے باپ کا گھر تھا جس کے باغ کے درخت جلا دیے گئے۔ ان درختوں کے نیچے پریاں کنڈل رقص کرتی تھیں۔ سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ سیاست نے سب کچھ ختم کر دیا۔" اس نے جواب دیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو —— تم ہم سب کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا تم کو یاد ہے کہ زندگی میں لیلیٰ بھی ہے جو تمہارے لئے محبت اور امن کا مظہر تھی۔"

وہ سیڑھیوں پر ٹھٹھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی روشنی نکلی۔ "تم پر خدا کی لعنت ہو ——" اس نے نیچی آواز میں کہا۔ "لیلیٰ کہاں ہے؟ لیلیٰ کہیں نہیں تھی۔ میں نے وجود کی بے رنگ واقعیت کو ایک اور خوبصورت لباس پہنا دیا تھا۔ یہ میرے ذہن کا قصور تھا۔ امن پرست دماغ ——!! زندگی میں صرف یہ ریوالور ہے ——" اس نے بڑے پیار سے ریوالور کو الٹا پلٹا۔ "خدا حافظ ——" اس نے مڑ کر کہا۔ "ممکن ہے اب

ہم کسی بہت خوفناک جگہ ملیں۔ جہاں اور زیادہ خون ہو اور زیادہ تباہی اور موت۔ پھولوں
اور محبت کے زمانے ختم ہوئے۔ مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں۔ دنیا کی بربادی کی طاقتیں
کو میرا انتظار ہے۔ کیونکہ میں نے اپنا آخری وژن دیکھ لیا ہے" اس نے آشیانے کے
جلے باغ اور ملبے پر نظر ڈالی۔

"ہارون سنو تو — ارژن — ارژن بھائی" وہ تیز تیز قدم رکھتا اندھیرے میں
ایک طرف کو چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑی۔

"خدا حافظ — خدا حافظ" اس کی آواز آئی۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں
خوف اور گھبراہٹ اور دکھ کے ساتھ بھاگتی رہی۔

آخر کو میں تھک کر ایک پتھر پہ بیٹھ گئی۔ اب اندھیرا کچھ کم ہو چلا تھا اور مدھم سا خنک
اجالا سارے میں پھیلا تھا۔

راستہ جس کے کنارے میں بیٹھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بہت دور تک لہراتا چلا گیا
ہے۔ اب اس پر سے متواتر طرح طرح کے لوگ گذر رہے تھے جن کو میں نے اب تک
نہ دیکھا تھا۔ بہت سی جانی پہچانی شکلیں بھی تھیں۔ وہ بنگالی تھے جنھوں نے ابھی ۹ رجون کا
اعلان سن کر میرے باپ کا گھر جلایا تھا۔ گوپال پور کے کسان تھے۔ فادر ایتھنی تھے۔ فواد
بھی تھا۔ پھر طرح طرح کی سواریاں گذرنی شروع ہوئیں۔ دہشت کے ساتھ میں سب کو دیکھتی
رہی۔ یہ قافلے ہیں جو دوسرے دیس سے آ رہے ہیں۔ دوسرے دیس کو جا رہے ہیں۔ کارواں
ہیں جو پچھلی صدیوں میں آئے تھے۔ شاہ غازی الدین حیدر کا رتھ تھا۔ روہیلہ سرداروں کے
گھوڑے تھے۔

اب میں نے ذرا غور سے آنکھیں پھیلا کر سب کو دیکھنا شروع کیا۔ منقش پالکی جو سامنے

آگر رکی۔ اس میں سے مہاراجہ بنارس اترے۔ وہ بنارس سے کلکتے جا رہے تھے اور راہ میں ہیسٹنگز سے ملنے کے لئے رُکے۔ پھر میں نے دیکھا کہ معظم منزل کے پرانے ہال کی ایک روغنی تصویریں سے نکل کر پرنانا ابا نے جھک کر مہاراجہ بنارس کو تسلیم کی اور انھوں نے نانا ابا کو خلعت عطا کی۔ پھر گلی میں شور مچا اور لارڈ ہیسٹنگز کی سواری گذری۔ اس کے بعد یکلخت گھری کالی رات چھاگئی۔

تب میں نے سُنا کہ ایک ویران امام باڑے میں بیٹھے میر انیس آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے غور سے دھیان دے کر سنا تو پتہ چلا یہ ع آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو —" کا اٹھارواں بند تھا۔ لوگ روتے رہے۔ رفتہ رفتہ یہ رونا سارے میں سا پھیل گیا۔ ساری کائنات چیخ چیخ کر رونے لگی۔

پھر رونے کے اس غل میں میں نے توپوں کو گرجتے سنا۔ پرنانا ابا کو گھسیٹ کر وہ بیلی گارڈ کے سامنے لا رہے تھے۔ اس توپ کے ساتھ ساتھ علی بھی گھسیٹا لایا جا رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اس شور میں ایلمر ریکسٹین کی آواز بھی شامل تھی۔ جس کو جنرل ہیولاک کوئی حکم دے رہے تھے اور وہ یس سر کہہ کر مستعدی سے جواب دیتا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ خون سارے میں بکھر گیا۔ آسماں پر شفق، زمیں پہ لالہ۔ رائیگاں یونہی تو — رائیگاں یونہی تو خونِ شہدا ہوتا ہے۔ ابا جان کی آواز آئی۔ ابا جان اپنے کمرے کے دریچے میں بیٹھے اپنا یہ شعر گنگنا رہے تھے۔ رائیگاں — رائیگاں — رائیگاں — تلواروں کی جھنجھناہٹ، توپوں کی گرج اور گھوڑوں کی ٹاپیں مجمع کے شور میں گھل مل گئیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے اپنے محافظین کے بینڈ نے "گوڈ سیو دی کوئین" بجایا اور ہم سب اپنے سیاہ ٹیونک پہنے ایک قطار میں کھڑے ہو کر "اون ورڈ کرسچین سولجرز" گانے لگے۔ یہ کانونٹ کا

میدان تھا اور ہر طرف کاغذی یونین جیک کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ شور زیادہ ہوا اور بھاری آوازیں اس میں تحلیل ہو گئیں اور ایلمر ریکسٹن سامنے آگیا۔ اس نے جنرل ہیولاک کی فوج کی وردی اتار دی تھی اور ڈریس سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے جھک کر کہا: "ہاؤ آر یو ہائی ڈیئر پریسیڈنٹ اینڈ —— مائی ڈارلنگسٹ نیرابلی" —— اور اس نے گجرے کے پھول بڑے شولری کے انداز میں پیش کیے۔ تب میرا چھن چھن کرتی سامنے آئی اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے جھک کر اسے پیار کیا اور ایشیائی کانفرنس کے نمائندوں نے تالیاں بجائیں اور علی کو دیکھ کر جو ایک کونے میں چپکا کھڑا تھا۔ ارل ماؤنٹ بیٹن آف برما نے پوچھا —— "یہ کون ہے ——؟" اس پر بہت زیادہ شور مچا اور افراتفری پھیلی اور خون کے چھینٹے میرے منہ پر آن گرے —— اور میرے ہونٹ سرخ ہو گئے۔ میں چیختی رہی لیکن کسی نے میری آواز نہ سنی۔ میں نے تاریکی میں بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن انھوں نے مجھے ایک درخت سے باندھ دیا۔ یہ شاہ بلوط کا درخت تھا جو آج محل اور آشیانے کے حلقے کے درمیان اگا ہوا تھا۔ پھر انھوں نے میرے باپ کے گھر کا سامان باہر نکالا۔ اور اطمینان سے اس میں آگ لگانی شروع کر دی اور سارا عالم کون و مکاں سب روشن ہو گئے۔ اس روشنی میں ایک سائے کا ہاتھ میری جانب بڑھا۔ "تم کو مر جانا چاہیے —— تم اب تک زندہ ہو ——؟" اس نے کہا۔ "مجھے تم مار دو گے؟" میں نے افسوس سے پوچھا مجھے اس کا بہت رنج ہوا کہ میں مر رہی ہوں۔ "میں یقیناً تم کو مار ڈالوں گا۔ لاؤ میرا پستول۔" "تم دیوانی آواز نے کہا۔" تمھاری ان احمق انگلیوں نے بہت دنوں ستار اور تان پورے کے تاروں اور پیانو کے پردوں کو چھوا۔ قلم اور رنگ کے برشوں کو تھاما اور ناچ کے مدرا دکھائے۔ اب تم کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جب انگلیاں ساکت کر دی جائیں تو کیا لگتا ہوگا

تم کو یقیناً یہ انکشاف بھی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ تمہیں وجود کے رازوں کو منکشف کرنے کا بہت شوق رہا ہے ـــ میری انگلیوں کو کسی ٹھنڈی چیز نے چھوا۔ یہ میرے پیارے بھائی علی کا ریوالور تھا جو میں نے اپنے اتنے ہی پیارے دھرم بھائی کے ہاتھ میں دیا۔ اس دھرم بھائی کی دیوانی آواز نے پھر میرے خوفزدہ کانوں میں زہر ابایا۔ "تم مر و گی ـــ پھر میں سب کو ختم کروں گا ـــ میں نے اپنا وژن دیکھ لیا ہے" ـــ "ارون ـــ !! اب میں سمجھی یہ تم ہو" میں بہت خوش ہو کر چلائی ـــ اور اندھیرے میں میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا۔ اس ہاتھ کو تھام کر میں عمر بھر درختوں پر چڑھی تھی۔ پگڈنڈیوں پر دوڑی تھی۔ اور گت کی تال اور لے کے ساتھ ناچی تھی۔ اس ہاتھ اور میرے ہاتھ کے درمیان سرد لوہے کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ ارون ـــ ارون ـــ ارون ـــ آخر کار میں خوب زور سے چیخی ـــ اور پھر میں نے بہت زیادہ سہم کر آنکھیں کھولیں۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ میں وہیں راج محل کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوں اور سامنے مکمل تاریکی ہے۔ پو پھٹتے سمے کا جو اجالا ابھی پھیلا تھا۔ وہ پھر رات کی اتھاہ سیاہی میں ڈوب گیا تھا۔ آشیانے کے باغ میں آگ کی جو روشنی بھڑکی تھی وہ بجھ چکی تھی۔ جلی ہوئی راکھ کے ذرے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا میں ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔

دہشت نے مجھ پر جو غلبہ کیا تھا۔ اس سے میں نے خود کو بچانے کی کوشش کی۔ "ارون" میں نے ہمت کر کے آواز دی ـــ "ارون تم یہاں بھی چلے گئے ہو واپس آؤ" سیڑھیاں اتر کر میں باغ کی سڑک پر آئی ـــ ارون کی اسٹیشن کار کے تیزی سے گذرنے سے راستے پہ ٹائروں کے جو گہرے نشان رہ گئے تھے۔ میں نے انہیں دکھ سے دیکھا۔

ارون راجونش ـــ میں نے پیار سے سوچا ـــ اس اتھاہ پیار سے جو صرف

ایک لڑکی، ایک بہن محسوس کرسکتی ہے ۔۔۔ تم چلے گئے ہو۔ لیکن ابھی حیات کے اور قافلے آئیں گے اور لڑائیاں لڑیں گے اور فتحیں حاصل کریں گے۔ تم کو اتنا افسردہ نہ ہونا چاہیے تھا تم اور میں تو وہ قافلہ تھے جو وادی گنگا کی وادیوں سے آیا تھا جس نے یورپ کے چرچ سجائے تھے جس نے قرطبہ کو آرائش دی تھی۔ تم نے تو بلوڈ ٹیوب بھی کمپوز کیا تھا مجھ کو مارنے کی خواہش کرتے وقت تم بھول گئے کہ مجھے قرون میں بھی قتل کیا گیا تھا۔ مجھے تو بارہا سارے یورپ میں صلیب پہ جلایا گیا۔ لیکن میں برابر زندہ رہی۔ قرطاجنہ میں تم میرے ساتھ تھے۔ بابل میں ہم نے اکٹھے باغات آباد کئے تھے۔ ایلورا میں غاروں کو منقش کیا تھا۔ متھرا نگری میں تم نے بانسری بجائی اور میں نے تم کو مکھن چرانے کی ترغیب دی۔ میں نے صدیقہ مریم کے ساتھ اس کے بیٹے کی عبادت کی اور اس کے پیر اپنے بالوں سے دھوئے ۔۔۔ تم بھول گئے کہ صدیقہ مریم کے بیٹے تم خود ہو ۔۔۔ تم اور میں حیات کی ابدی روح ہیں۔ ساری انسانیت کی اجتماعی طاقت ہیں ۔۔۔

میں یہ سب اس سے کہنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کو یہ خیال بھی نہ رہا ہوگا کہ اس کے اور میرے وطن کی یہ آخری مشترکہ رات تھی جو میں نے وہاں گزار دی۔ اس کے بعد اور راتیں آئیں گی اور دن ۔۔۔ لیکن وہ وطن مرحوم کی نئی سرحدوں کے دونوں جانب جداگانہ حیثیت سے طلوع ہوں گے۔

خدا حافظ آشیانے

خدا حافظ راج محل

خدا حافظ اودھ راج ونش

۴۲

اور اب ہم ان اچھوتے بجاتی لڑکیوں، ان کھنکارتے ہوئے براہمنوں، اس گنگا، ان سارے الوہی مناظر کو چھوڑ کر آگے جا رہے ہیں۔ ابا جان آپ نے بالکل غلط کہا تھا کہ بنارس کی صبحوں اور موسم کی ان کیفیتوں کو کوئی ہم سے نہیں چھین سکتا۔ یہ ہماری اپنی ہیں اور ہمارے وجود کی کیفیت کا ایک لازمی جزو ہیں۔ ابا میاں آپ کے تو انقلاب کے سارے خواب بھی کچھ غلط ہی ثابت ہوئے۔

اب جبکہ ہم عیش باغ میں آپ کی موتیا کی جھاڑیوں کے پاس آپ کو خدا حافظ کہنے آئے ہیں۔ شاید آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم پہ کیا بیتی اور کیوں ہمیں آپ کو چھوڑنا پڑا۔ ہمارے اور اس مٹی کے درمیان جس میں سے آپ پیدا ہوئے اور جس میں آپ کو چھپا دیا گیا ہے۔ اب ہزاروں میل کا فاصلہ اور صدیوں کی تنہائی کا بُعد ہو گا۔ اب ہم ایک دوسرے کے لئے غیر ملکی ہیں۔

کیونکہ ہم ترکِ وطن کر رہے ہیں

کس قدر تمسخر انگیز کس قدر قابلِ رحم !!

کیا میں اس بنچ پر بیٹھ کر، اس پرانی ندی کے کنارے، اس قدیم امام باڑے کے سائے میں جبکہ سورج آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے، اپنا، اپنے آباؤ اجداد کا مرثیہ لکھوں گی -؟

کیونکہ ہم بے حد نااہل ثابت ہوئے۔ ہماری نسل اس بار کو نہ اٹھا سکی۔ جو ابا میاں تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے ہمیں سونپا تھا۔ ہم تمہارے معیاروں پر جو انسانیت، شرافت، اور تہذیب کے معیار تھے پورے نہیں اتر سکے اور اس لئے اب ہم جا رہے ہیں۔ آگے نئی دنیاؤں میں۔ شاید ہم وہاں کچھ کر پائیں۔

یہ شہر کے مضافات ہیں جن پر سورج غروب ہو رہا ہے۔ کچی سڑکیں۔ ادھر کے کھیت۔ ندی۔ ہٹ۔ پرانی فصیلیں اور امام باڑے۔ یہ خاک آلود سڑک جو عیش باغ کے برابر سے گزر رہی ہے، گوپال پور کو جاتی ہے۔ یہ بیل گاڑی جو دھیرے دھیرے کچی سڑک پہ چلتی ہوئی اس طرف آ رہی ہے۔ غالباً یہ گوپال پور کے کسی باسی کی ہے۔

گوپال پور -- ؟

گوپال پور کو بھی ابا میاں ہم نے چھوڑ دیا۔

جہاں کھیت تھے۔ جنہوں نے صدیوں کا دکھ، صدیوں کی مصیبتیں اپنے اوپر جھیل لی تھیں۔ کھیت جو ہماری زندگیوں کے گواہ تھے۔ ہمارے ہمدرد اور رفیق تھے۔ ہمارے گرو تھے، جنہوں نے رات کے سناٹے میں ہم سے کہا - میرے بیٹو۔ دکھ نہ کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہمیں چھوڑنے، ہمیں بھول جانے پر مجبور ہو جاؤ۔ لیکن ہم تمہارے ساتھ رہیں گے۔ تمہاری روح میں رچے رہیں گے۔ ہم تمہارے وجود کی ساری گمبھیرتا کے مظہر ہیں۔ ہم کو

ایک دوسرے سے کون چھین سکتا ہے۔

یہ لوگ — یہ سیاست — وہ گیہوں کی بالیوں نے حقارت سے سر ہلا کر پوچھا یہ لوگ جو تم کو ترکِ وطن پر مجبور کر رہے ہیں — یہ تم نے ان کو کیوں نہ بتایا کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال کر انھوں نے زندگی کے ابدی سکون کو زندگی سے بیدخل کر دیا ہے۔ پھر ہوا رام گنگا پر سے قہقہے لگاتی ہوئی آئی اور اس نے کہا رنج مت کرو — دکھوں کی سلطنت بہت وسیع ہے۔ لیکن پھر ہوا نے کہا۔ میں غلط کہتی تھی۔ تم کو تو نئی دنیاؤں میں گھل مل جائیں گے۔ لیکن ہم کیا کریں گے۔ گوپال پور کا کسان کیا کرے گا۔ سارے ہندوستان کا کسان کیا کرے گا جس کو تم یہیں چھوڑے جا رہی ہو۔ اسے انھی کھیتوں پر زندہ رہنا اور یہیں مرنا ہے۔

کیونکہ تم جا رہی ہو۔ لیکن اسے اپنے ان مسجدوں اور ان امام باڑوں کی حفاظت کرنی ہے۔

سورج ڈوب چکا ہے۔ امام باڑے کے سائے طویل ہو گئے اور بہت گہری کالی رات ہمارے سامنے ہے۔

خدا حافظ رام گنگا

خدا حافظ گوپال پور

خدا حافظ ابّا میاں۔

چشم و چراغ — تم، راحیل بلگرامی، کیوں یہ پہچاننا چاہتی ہو کہ ہم کون ہیں —" اس نے ذرا غصے اور نفرت سے کہا —" واپس جاؤ — واپس جاؤ۔"

"گریدومن —" ایک بین الاقوامی شہرت والی خاتون نے برآمدے میں داخل ہوتے ہوئے راحیل کو دیکھ کر تعریفاً سرگوشی میں کہا۔ کتنی باوقار اور سنجیدہ — مس سارا بھائی کے ہمراہ یہ اکثر ہندوستان سے یہاں آتی رہتی ہیں اور ان کو میں نے ہمیشہ مجمع کے اسی گوشے میں اسی خاموشی کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔ ہماری لڑکیوں کو بھی دراصل یونہی ترقی کرنی چاہیے۔ خواتین کی جس انٹرنیشنل کلچرل کانفرنس کے لیے میں کل صبح اسٹاک ہالم جا رہی ہوں، اس میں یہی نکتے پیش کرنی والی ہوں کہ —" وہ باتیں کرتی لاؤنج کی طرف چلی گئیں۔

"گریدومن —" دوسرے دروازے سے ریاض داخل ہوئے اور بار پر فواد کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ "تم نے ڈریس کوٹ کیوں نہیں پہنا —" انھوں نے انگلی اٹھا کر سوال کیا۔

"جی —؟" راحیل نے آنکھیں پوری طرح کھول کر چاروں اور دیکھا۔ میں کہاں ہوں — گوپالا — تم اس وقت کہاں ہو — کیا سوچ رہے ہو — کہاں جانے والے ہو۔

"گوپالا سوامی آئینگر —" فواد ایک اخبار سامنے سے سرکاتے ہوئے دہرایا

"مادموزیل — یہاں سب تیسی ہیں۔" ہنگیرین بارمین نے دروازے کے قریب آ کر معذرتاً پھر دہرایا۔

راحیل آہستہ آہستہ متوازن قدم رکھتی برآمدے کے باہر چلی گئی۔

"مادموزیل کے ملک میں مکمل خشک سالی طاری کر دی گئی ہے۔" راحیل کو باہر جاتا دیکھ کر بارمین نے رنج سے سر ہلا کر ریاض سے کہا: "یہ دیکھیے۔" اس نے اخبار سامنے

سرکا دیا۔

"میر آئینگ کی تقریر بھی پڑھو —" فواد نے پھر بلا وجہ گرج کر کہا۔

ریاض بے دھیانی سے اخبار کے اوراق پلٹتے رہے۔

"سر ہڈ گر نکیشن کا انتقال ہو گیا جن کو ملکۂ معظم نے میرے بیچارے تقسیم شدہ صوبہ پنجاب کا گورنر نامزد کیا تھا — ایمر کے والد —" ریاض نے خبروں کی ایک سرخی پر رکتے ہوئے اسی بے خیالی سے کہا۔

فواد چپکا بیٹھا گلاس کے بلبلوں کو دیکھتا رہا۔

"کس مراقبے میں ہو —" ریاض نے اکتا کر پوچھا

"تمہارے اس لفظ 'میرے' پر غور کر رہا ہوں — میرا بیچارہ صوبہ" فواد نے قناعت سے جواب دیا۔

"جہنم میں جاؤ" ریاض نے اطمینان سے کہا

فواد اسی پہنچے ہوئے انداز سے خاموش بیٹھا رہا۔

"بیچارہ ایمر نکیشن —" ریاض نے اخلاقاً ہمدردی ظاہر کی۔

"کافی والدین نے پچھلے دنوں انتقال کیا ہے۔" فواد نے اسی اطمینان بخش آواز میں کہا "مثلاً میر انٹنی کے والد — انکل راج موہن عرف ہندر چاچا۔"

میر انٹنی — ریاض نے اپنے ذہن میں اس نام کو الٹا پلٹا — میں میر انٹنی ہوں۔ جو ابھی سیاہ کوک پہنے سامنے کے دروازے سے داخل ہوں گی۔ سادھو سنت سبھی دیوانے من سے ہار کو دیہ نانے — میر انٹنی سب سے پوچھے۔ دکھ میں کس کا ساتھ۔"

اس کے ذہن پر اس وقت وائٹ ہارس کا گہرا دھندلکا چھاتا جا رہا تھا۔

"کیا تمہارا خیال ہے مجھے میرا کو تعزیت کا ایک عدد خط لکھنا چاہئے۔ دراصل مبارک باد اور تعزیت کے خط لکھنا سخت مشکل کام ہے ــــ اتنا عرصہ گذر گیا میں نے میرا کو اب تک تعزیت کا خط نہیں لکھا ــــ تمہارا خیال ہے مجھے میرا کو ٹرنک کال کر کے اظہارِ افسوس کر دینا چاہئے ــــ؟" نواد اسٹول پر سے اٹھ کر ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا ٹیلیفون بوتھ کی سمت چل دیا۔

"میرا ــ" وہ ٹیلیفون میں ناک ٹھونس کر دھاڑا۔ "دنیا میں ہجار دل اور اتنا شور مچ رہا ہے کہ اب تم میری آواز بھی نہیں سن سکتیں ــــ؟"

"میرا آرانی اب یہاں نہیں ہے نواد میاں۔" دوسرے سرے سے ایک مدھم آواز آئی۔ "ٹری ونڈرم گوالا لمپور۔ بولیویا ــــ وہ کہتی تھی وہ جانے کہاں کہاں جائے گی۔ ناچتے ناچتے اور اپنے گیت گاتے گاتے وہ کائنات کے آخری سروں تک پہنچے گی۔ وسعت کے کناروں تک پہنچ کر نئے رقص تخلیق کرے گی۔ تم اس کے حیا انگمار کنال تھے۔ لیکن تم کو اپنے مطلوبہ دیس میں پہنچ کر غالباً اپنی آنکھیں واپس مل گئی ہوں گی۔ خدا حافظ نواد میاں!"

وہ اسٹول پر چپ چاپ آنکھیں بند کئے بیٹھ گیا۔

کمروں اور برآمدوں میں شام کا مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ راحیل اپنی اسٹاف کار میں جس پر ترنگا لہرا رہا تھا اپنے ہائی کمشنر کے ہاں واپس جا چکی تھی۔

کرنل و مسز بلگرامی ایک میز کی سمت جا رہے تھے۔

میرا۔ راحیل۔ ریاض کے ذہن کا دھندلکا گہرا ہوتا گیا۔ پدما۔ پدما۔۔۔

اچانک سامنے کی میز پر، اتنے انتظار، اتنی مدتوں، اتنی صدیوں بعد، اسے پدما نظر آئی۔

بار پر سے اٹھ کر وہ ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتا ییلٹے بگا امی کی کرسی کے قریب پہنچا۔
"آپ کون ہیں ۔۔۔؟" تحکمانہ لہجے میں اس نے مطالبہ کیا۔
"جی ۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ غالباً میرا آپ سے تعارف نہیں۔" ییلٹے نے اخلاق سے جواب دیا۔

وہ ایک کرسی کھینچ کر اطمینان سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بالآخر یہ بدمانی۔
"یہ سب ہمارے لکھنؤ کے پرانے دوست ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسا اتفاق ہوا کہ تم کبھی ان لوگوں سے وہاں نہیں ملے ۔۔۔" فراز نے قریب آ کر کہا۔ "میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا صرف آپ کو جاننا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے کبھی نہیں ملیں۔ کہیں نہیں ملیں۔"

ییلٹے تعجب سے اسے دیکھتی رہی۔ اردن راجونش ۔۔۔؟ یہ اردن راج ونش نہیں ہے۔ یہ کوئی اجنبی ہے جو یک بیک اس کے پاس آن بیٹھا ہے اور اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"آپ دونوں کسی روز تشریف لا کر ہمارے ساتھ شام کی چائے پیجئے ۔۔۔ آج کل اجلی بھی ہمارے یہاں آئی ہوئی ہیں۔" اس نے بڑے اخلاق سے فراز کو مخاطب کر کے کہا۔

۴۴

ایک جم خانہ سے دوسرے جم خانہ تک ـــــ محمد باغ کلب ـــــ لاہور و کراچی جم خانہ ـــــ زندگی بے حد ترتیب و ہمواری سے گذرتی جا رہی تھی۔ ملک کی تقسیم کا ایڈونچر خاصا دلچسپ رہا۔ جبکہ راتوں رات ایک ڈیکوٹا میں جیسے کوئی بوٹلش لاش کی اڑا رہی تھی۔ کانپور سے لاہور آنا پڑ گیا تھا۔ اس کے علاوہ مطلق کوئی فرق، کوئی انتشار زندگی میں نہ آیا تھا۔ تقریباً وہی لوگ تھے۔ وہی مجمع اور نئے اور دلچسپ انسان بھی گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ ان چیزوں سے۔ اس نے برآمدے کی ریلنگ پر جھک کر سمندر کو دیکھتے ہوئے خیال کیا۔ ان چیزوں سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے اور دلچسپی بھی۔ سڑک کی نیلی روشنیاں اور پچھلے برآمدے۔ وہ اندھا اینگلو انڈین بڈھا جو حضرت گنج کے برآمدوں میں سیکسوفون بجا کر بھیک مانگتا تھا ـــــ زندگی میں ان لوگوں سے بھی ملتی ہوں جن کے وجود سے مجھے بالکل واقفیت نہیں ـــــ ان سب میں مل کر ان کے ساتھ میں زندہ ہوں

لیکن جو کچھ یہ میں سوچتی ہوں۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔ اپنے اپنے بیتے زمانے سبھی کو یاد آتے ہیں۔ اردن کی طرح کے بہت سے لوگ ہوں گے۔ جنہوں نے اسی طرح اور بہت سے انسانوں کو متاثر کیا ہو گا۔ وہ بیگم بلگرامی ہے۔ جو بیحد کامیاب اور دلچسپ پارٹیاں دیتی ہے۔ ریاض سے باتیں کرتی ہے — وہ بالکل کوئی خاص، منفرد، علیحدہ ہستی نہیں ہے — وہ ریلنگ پر جھکی رہی۔ شام کی روشنی میں درختوں کا رنگ تبدیل ہوتا گیا۔ بیگمات کے رنگ برنگے اوورکوٹوں کی طرح جو بونڈ اسٹریٹ میں خریدے گئے ہوں گے — نیلا۔ سبز نارنجی۔ آسمانی — لیکن مجھے بونڈ اسٹریٹ سے بھی کوئی اتنی زیادہ دلچسپی نہیں۔ مجھے سوسائٹی میں اپنی کامیابی پسند ہے۔ مجھے اپنے گھر، اپنے بچے اور اپنے شوہر سے محبت ہے اور میں نے اردن راجونش کو چاہا ہے۔ لیکن جب میں مر جاؤں گی تو کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ میرے دل و دماغ پر یہ سب بیتا۔

درختوں کی ہمنشینی — ریاض نے ریلنگ پر جھک کر اپنے آپ سے کہا۔ شاید یہ آخر کار امن کا دن ہے۔ تم میرے قریب ہو اور مجھے زندگی کی ابدی مسرت، سادگی اور آرام کا احساس ہے — مجھے اس سے کیا غرض کہ ماؤزے تنگ نے اپنی کل کی تقریر میں کیا کہا — غالباً آج پوپی ڈے ہے اور لڑکیاں چھوٹے چھوٹے جھنڈے اور پوپی فروخت کرتی پھر رہی ہیں۔

امن — مکمل سکون — اس نے سامنے کے منظر پر نظر ڈالی — سفید بادبانوں والے یاٹ لہروں پر تیرتے پھر رہے تھے۔ سامنے بوٹ کلب کی ریت پر رنگین چھتریوں کے نیچے جن پی جا رہی تھی۔ فضا میں پرندے چکر کاٹ رہے تھے۔

"مجھے ان چیزوں سے ڈر لگتا ہے" — لیلیٰ نے اپنے آپ سے کہا۔

سامنے کی پہاڑی پر سے تین لڑکیاں اس کی جانب آ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر خلیق تبسم کے ساتھ وہ ان کے استقبال کے لئے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔

سادے کپڑوں اور معمولی شکلوں والی ان لڑکیوں نے ذرا ہچکچاہٹ سے اس کو دیکھا ـــ

"اندر آیئے ـــ یا آپ کو بوٹ کلب جانا ہے ـــ بوٹ کلب جانے والے اکثر راستہ بھول کر ادھر آ نکلتے ہیں ـــ" اس نے ہاتھ بڑھا کر بے حد اخلاق سے کہا ـــ

"جی نہیں ـــ" ایک لڑکی نے ذرا جھینپ کر کہا۔ "میں یہ کاغذ لائی ہوں۔"

"کاغذ ـــ؟"

"جی ہاں ـــ آپ کو امن پسند ہے؟"

"جی ـــ؟" لیلٰے کی بالکل کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کیسا بیوقوفی کا سوال ہے۔

"آپ دنیا میں جنگوں کا خاتمہ چاہتی ہیں ـــ؟ غربت کا خاتمہ چاہتی ہیں ـــ؟" لڑکی نے ذرا اور ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ گویا اسے اس خوبصورت اکمخواب میں ملبوس عورت سے ایسے بے تکے سوال نہ کرنے چاہئیں۔

"خاتمہ ـــ؟ خاتمہ تو کسی چیز کا بھی نہیں ہوتا۔ جاڑے آتے ہیں۔ تب بھی جنگ ہوتی ہے۔ گرمیاں آتی ہیں تب بھی۔"

ـــ لیکن بہرحال ـــ اسے ان باتوں سے کیا مطلب۔ اخباروں اور رسالوں میں وہ فقط ووگ دیکھتی تھی۔

"اس کاغذ پر بیگمات نے دستخط کئے ہیں۔" لڑکی نے ایک رول اس کے آگے

بڑھاپا۔

لیلےٰ نے اپنے سفید ہاتھوں میں کاغذ تھاما۔

"اس پر لکھ دیجئے۔"

اس نے اپنا نام لکھا۔ کاغذ پر اپنا نام لکھا ہوا اسے بے حد انوکھا لیکن خوبصورت معلوم ہوا: بیگم لیلےٰ بلگرامی۔ یہ کاغذ ساری دُنیا میں عجیب عجیب ہاتھوں میں جائے گا۔

"شکریہ، خدا حافظ۔" پہاڑی پر جاکر لڑکیاں دوسری سمت مڑ گئیں۔

لیلےٰ اپنے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ان کو پہاڑی کی اوٹ میں اوجھل ہوتا دیکھتی رہی۔

پانی کے کنارے رقص کے لئے جو چبوترہ بنا ہوا تھا، اس پر کسی نے اکارڈین بجانا شروع کر دیا۔

۴۵

اور یہ ارون کا خط ہے جو اس نے دہرہ دون سے جانے کے بعد ہندی میں لکھا تھا۔ جس وقت اس نے یہ خط لکھا۔ وہ سکندرآباد کی چھاؤنی میں بیٹھا تھا اور فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سہارا اس کے بعد اب میں دنیا کی ہر برائی اور ظلم کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بدلے ہوئے زمانے، بدلی ہوئی تہذیب اور بدلی ہوئی اقدار کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی وہاں اسی کوشش میں مصروف ہوگی۔ میں پوری سعی یہ کر رہا ہوں کہ اس طرح کامیاب رہوں۔ میں پرانا ارون راجو نش نہیں ہوں۔ وہ دماغ جو صدیوں تک سلگتا رہا۔ اس پر ایسے چھینٹے تم سب نے مل کر ڈالے ہیں کہ اب یہ سلگنا ختم ہو چکا ہے۔ یہ خط میں نے اس لئے لکھا ہے۔ کیونکہ میں ڈرپوک ہوں۔ نہایت بزدل اور کمینہ۔ زندگی کے اس نئے راستے پر جو دھکیل دیا گیا ہوں۔ اس سے مجھے ڈر لگتا ہے اور واپس لوٹنا بھی اصول کے خلاف

ہے۔ جب تم کو نیلمے ملے تو اسے بتلانا کہ بہت جلد وہ بھی وہی راستہ اختیار کرے گی یا کر چکی ہوگی۔ جس پر اب میں چل رہا ہوں۔ ضمیر کا اطمینان کہیں نہیں ہے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارے کردار جو زندگی کی ابدی معصومیت کے آئینے تھے۔ اس تاریکی میں ادھر ادھر نکل گئے ہیں۔ ہمارے دل دماغ میں اتنے عرصے میں آندھیاں چلتی رہیں۔ ان کے شور کو کسی نے نہ سنا اور اس باہر کے طوفان نے ان کو بالکل دبا دیا۔ میں جذباتی تو خیر بالکل نہیں ہوں۔ لیکن میری پیاری دھرم بہن۔ میرا یہ خط تم کو شاید بہت بڑا میلو ڈرامہ معلوم ہو۔ اس لیئے اب مجھے رخصت کرو۔ کیونکہ میں اتنی بڑی جلاوطنی پر جا رہا ہوں۔۔

خدا حافظ۔ تمہارا اپنا ارون۔

جس روز مجھے اس کا خط ملا، اسی روز اتفاق سے نیا اونلکر آیا تھا۔ اس کے اوراق الٹتے پلٹتے میں مجھے ایک نئی تصویر نظر آئی جس کے نیچے لکھا تھا — یہ وہ ہینڈسم ارون راج ونس ہے جو ہندوستان کا سب سے کم عمر بریگیڈیر ہے اور ہندستان کا سب سے ہر دلعزیز نوجوان افسر۔ ملک کو اس سے بہت بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

تصویر کو میں نے احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔

۴۶

"میں نے آپ کی تصویر دیکھی تھی کہیں کہیں؟ کچھ کم سن ہو گے — مس بلگرامی —" پروین عنایت اللہ نے راحیل سے کہا۔

"واقعی —؟!" راحیل نے اخلاقاً جواب دیا۔

"جی۔ اسٹیلا کے البم میں — لیکن وہ البم اپنا بہت چھپا کر رکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خاندانی البم اور اس کی پرانی تصویروں کا اجنبیوں کو دکھانا — ایک قسم کی — ایک قسم کی توہین ہے —" پروین نے ذرا جھجک کر کہا۔

"اچھا —؟ یہ کہتی تھی وہ —" راحیل نے بے خیالی سے پوچھا۔ "توہین کس کی — اجنبیوں کی یا خاندانی البم کی —؟"

"ہا ہا — ہا — آپ بے حد پُر مذاق ہیں مس بلگرامی — میرا مطلب ہے پرانی چیزیں، خاندانی عظمت اور پرانی یادوں میں ایک طرح کی تقدیس سی ہوتی ہے اور اس تقدیس

کے احساس کو انسان دوسروں پر امپوز نہیں کرنا چاہتا — ظاہر ہے دوسروں کو اس سے کیا ہمدردی —"

"ظاہر ہے —" راحیل نے بالکل اتفاق کیا۔

"اور تقدیس — اور — اور ایک طرح کا ترحم سا ہوتا ہے —" پروین عنائت نے ذرا سوچ کر کہا — "جو پرانی چیزوں سے چپکا رہ جاتا ہے۔"

"سنیئے —" راحیل نے یکایک چونک کر کہا "آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہیں —؟"

"کچھ نہیں — کچھ بھی نہیں —" پروین نے سٹ پٹا کر کہا۔

"پروین" جعفر نے اوپر سے آواز دی "کیا تیرنے کے لئے نہیں چل رہی ہو —؟"

"چلو —" اس نے جلدی سے کہا — "اچھا خدا حافظ — مس بلگرامی — شام کو کلب آئیے گا —"

"یقیناً — خدا حافظ —" راحیل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

پتوں میں جو روشنیاں جھلملا رہی تھیں، ان کا عکس پانی کی سطح پر پڑ رہا تھا۔ کلب کے مختلف حصوں میں گیسٹ نائٹ کا بہت بڑا مجمع تھا۔ لیکن یہ جگہ نسبتاً پُر سکون تھی۔

راحیل اپنے سیاہ بالوں کو جو سمندری ہوا نے پریشان کر دیئے تھے۔ بالوں سے ہٹاتی ہوئی گھاس پر آگئی۔ آسمان پر ستارے جل رہے تھے۔ لیکن ہوا میں خنکی تھی۔ تمہارا خدا میرا خدا ہے۔ تمہاری قوم میری قوم ہے۔ اس نے پتوں کو چھوا۔ یہ تمہاری سرزمین ہے۔

نیلے رنگ کا سوزن کاری کے یہاں تیار شدہ اسٹریم لائینڈ جوڑا پہنے ایک لڑکی قریب سے گذری — یہ جلد شادی کرلے گی اور غالباً پشاور یا پنڈی کے قریب کسی فوجی مقام پر اپنے شوہر کے ساتھ رہا کرے گی — اسے دیکھ کر راحیل کو خیال آیا۔

میزوں کے نصف دائرے کے قریب کھڑے ہو کر بینڈ کے اطالوی وائلینسٹ نے کوئی پرانا نغمہ بجانا شروع کر دیا۔

"دینامار کو رونی ہماری دلکش مہمان کو سرینیڈ کر رہا ہے۔" ایک صاحب نے جھک کر راحیل کو مخاطب کیا۔ وہ جواباً اخلاق سے مسکرائی۔

"راحیل ڈارلنگ —" اسٹیلا نے قریب آ کر اس سے کہا۔ "تم نے ان بزرگوار کو دیکھا جو اس پیڑ کے نیچے فواد سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں ان سے شادی کر رہی ہوں۔ بے حد سویٹ انسان ہیں۔ ان کی امی نے ان سے کہا کہ سگریٹ نہ پیا کرو۔ انھوں نے ترک کر دیے۔ تاش بھی نہیں کھیلتے۔ اپنی خالاؤں کو پابندی سے خط لکھتے رہتے ہیں۔ جو حیدرآباد دکن میں کہیں رہتی ہیں —"

"میجر جنرل راج ونش کے ڈویژن نے آخر کار پانچ اضلاع پہ قبضہ کر لیا۔ ہلاک شدگان کی —" کسی نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیوگرام کا سوئچ بند کر دیا۔

راحیل بالوں کو ٹھیک کر کے درختوں کے جھرمٹ کی سمت آئی اور پھر ٹھٹک گئی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر ریاض کھڑے تھے۔

گوپالا — آخر کار میں تمہارے اتنے قریب آ گئی ہوں۔

وہ کلب کی عمارت میں انسانوں کی گہما گہمی تھی۔ موسیقی کا شور تھا لیکن اس وقت یہاں مکمل، خاموشی تھی۔ تکمیل شدہ سکوت۔

اس نے ریاض کو دیکھا۔ ایک لمحہ۔ لمحہ جو صدیوں نے تخلیق کیا تھا۔ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھتی رہی۔

ریاض لان کی طرف جا رہے تھے۔ درخت کے نیچے کھڑی ہوئی لڑکی کو انھوں نے

دیکھا۔ یہ راحیل تھی۔ انہیں خیال آیا۔ انھوں نے دوبارہ اس پر نظر ڈالی۔ ان نظروں میں کوئی پرانی مانوسیت نہ تھی۔

ریاض کی آنکھوں کو وہ ایک لمحے کے لئے دیکھتی رہی۔ ان آنکھوں میں کوئی پرانی مانوسیت نہ تھی۔ کوئی جانا پہچانا پن نہ تھا۔ مکمل، مکمل اجنبیت ـــ غالباً زمانے کے کسی دور میں، کسی حصے میں، وجود کی کسی سطح پر ہم تم سے ملے تھے۔ وہ نظریں کہتی معلوم ہوئیں۔

"ہلو راحیل بیگم ــ" ریاض نے بے حد اخلاق سے مسکرا کر کہا ــ "شام کیسی گذر رہی ہے؟ آپ کا پسندیدہ "لا پلوما" بج رہا ہے۔ آپ رقص کے لئے نہیں جا رہیں؟" ہاتھ میں گلاس لئے وہ روش پر مڑ گئے۔

جس طرح دو جہاز سمندر کی سطح پر لحظہ بھر ساتھ ساتھ ٹھہرنے کے بعد اپنی سمتوں کو چلے جاتے ہیں۔ ایک جا کر ہمیشہ کے لئے کسی محفوظ بندرگاہ میں قناعت سے لنگر انداز ہو جانے کے لئے، ایک مسلسل، مستقل گردش میں رہنے کے لئے۔ حالانکہ کناروں پر ان گنت محفوظ و دلکش بندرگاہیں موجود رہیں گی۔

اطالوی وائیلنسٹ مختلف حسین خواتین کی کرسیوں کے قریب جا کر سرینیڈ کرنے میں مصروف رہا۔

ریاض اپنے دوستوں کے گروہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت وہ لوگ نہایت تندہی سے یہ طے کرنے میں مشغول تھے کہ اس اتوار کو ایجنرز کی ہاؤس وارمنگ پارٹی میں شرکت کے بعد سیلو جی چلا جائے یا لمبر۔

ریاض حسبِ عادت باتوں کا مختصراً ہاں یا نہیں میں جواب دے کر سمندر کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے سگریٹ پیتے رہے۔

آج انڈین ہائی کمشنر کے ہاں کے کافی لوگ نظر آرہے ہیں۔ کسی نے کہا — آداب عرض ہے مسز مصرا — آئیے، تشریف رکھیے — تعظیماً اٹھتے ہوئے ہندوستانی خاتون کے لیے کرسی پیش کی گئی۔ قریب کی میز پر اسٹیلا عباسی اپنی دوستوں کے ساتھ آبیٹھی تھی۔ دونوں میزیں جوڑ کر کرسیوں کا دائرہ وسیع کر لیا گیا۔ باتوں اور قہقہوں کا شور دوگنا ہو گیا۔

انسانوں کی گہما گہمی ہے۔ راگ کا شور۔ موجوں کی آواز۔ لیکن گہرا مکمل سناٹا طاری ہے۔ اسٹیلا جو میرے قریب بیٹھی ہے اس کی آواز بہت دور سے آرہی ہے۔ ساری آوازیں کھو چکی ہیں۔ یہ اجنبی رات ہے۔ سامنے مستقبل ہے۔ ان گنت دن اور راتیں اور یہی آوازیں۔ یہی انسان۔ اب میرے گرد لہروں کا جو دائرہ قائم ہوتا رہتا ہے۔ وہ یکلخت غائب ہو گیا ہے۔ میں پانی کی تہہ میں پہنچ چکی ہوں۔ باقی کے سارے لوگ دور دور جزیروں پر بیٹھے ہیں۔ یہاں ایک لائٹ ہاؤس ہے جس کی روشنی کبھی کبھی ساحل پر آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ تیز۔ مدھم۔ تیز۔ مدھم۔ پھر مکمل تاریکی اور اس تاریکی میں اکثر رات کے پردے جگمگا اٹھتے ہیں۔

لائٹ ہاؤس کی اس روشنی کو دیکھو — جو ہم سب پر الگ الگ پڑ رہی ہے۔

"لیکن یہاں لائٹ ہاؤس کہاں ہے راحیل ڈارلنگ —" اسٹیلا نے تعجب سے کہا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئی۔

میں کنارے پر آگئی ہوں۔ لہروں میں جو دائرہ پیدا ہو گیا تھا ٹوٹ گیا ہے اور دنیا بہک گئی ہے۔

لیکن کیا ہوا۔ صنم کدے تو کبھی ویران نہیں ہوتے۔ خدا آتے رہتے ہیں جاتے

رہتے ہیں ـــ" ریاض اپنے ہونٹوں پر مطمئن تبسم لئے جھک کر لیلیٰ سے کہہ رہے ہیں۔

"ان کے الوژنز کلیر کیا ہوا؟ حسب معمول ختم ہو گئے؟"

"الوژنز۔" لفظ کے معنی نہ سمجھتے ہوئے لیلیٰ نے دہرایا

"ـــ انہیں یہ فکر ہے کہ ہم سے پھٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری" ـــ ابھی فون کر کے فیض سے پوچھو یہ واہیات شعر انھوں نے کیوں لکھا" میز پر مکہ مار کر جعفر کہہ رہا ہے

"یہ فیض نہیں ہے ـــ" اسٹیلا جھڑک کر کہہ رہی ہے۔

"اچھا ـــ میرا خیال تھا کہ ہر عمدہ شعر فیض کا ہوتا ہے ـــ" جعفر نے منہ لٹکا کر کہا۔

"یہ عمدہ شعر بھی نہیں ہے" اسٹیلا حسب معمول بگڑ رہی ہے۔ میں کنارے سے گر چکی ہوں۔ اب میں بالکل تہہ میں ہوں اور سطح کے اوپر سب کی آوازیں مجھے صاف سنائی دے رہی ہیں۔ ویژن پہ اب آخر کار گہری دھند چھا گئی ہے۔ یہ کوئی تیز دھار چیز ہے جس نے روح کو بے حد گہرا کاٹا ہے۔ ہمیشہ کے لئے زخمی کر دیا ہے اور لمحہ ختم ہو گیا۔ لمحہ جو کبھی حاصل نہ ہو گا۔ لیکن اس لمحے کا توازن، اس کا اپنا وجود ہمیشہ قائم رہے گا۔ بالآخر یہ میری موت کا گھنٹہ ہے۔ دھوپ، جو میں نے گلابی پھولوں کے درختوں میں سے چھنتی دیکھی۔ یہ انسان جو ابھی سامنے کی سیڑھیوں سے اترا۔ روش پہ چلا جس نے لیلیٰ بلگرامی کے ڈرائنگ روم میں اپنی شامیں بتائیں جس نے مسکرا کر روسی یا فرانسیسی سفیر سے باتیں کیں۔ اس کے وجود کا مقصد وہ خود نہیں ہے۔ لیکن وہ وہاں رہے گا۔ لیکن وہ وہاں رہے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ۔ گو فضا کی نیلاہٹ کم ہو چکی ہے۔ زندگی کی توقعات نے مجھے اندر سے کمزور کر دیا تھا۔ مجھے اپنی اہمیت کا اندازہ کرنے کی تمنا تھی۔ لیکن اس اہمیت کو محسوس کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں کس قدر کمزور ہوں ـــ میں دنیا کے سامنے بالکل محفوظ نہیں ہوں۔ وہ سب مستقل

باتوں میں محو ہیں۔ وہ طمانیت سے پیلٹے کی کرسی کے قریب گھاس پر بیٹھ گیا ہے اور اس کے ہونٹوں پر تبسم ہے۔ خاموش پسندیدگی کا پر اسرار جانا پہچانا تبسم۔ انہیں الفاظ کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان صرف مکمل خوشی کے لمحات ہی میں اس طرح خاموش رہ سکتا ہے اور تیسرا جو باہر موجود ہے۔ ان دو کی دنیا میں شامل نہیں۔ اس میز کے دوسری جانب وہ دونوں سادگی سے مسکرا رہے ہیں۔

اب کیا ہوگا۔ اس نے میز پر کہنیاں ٹکا کر اس سکون سے سوچنا شروع کیا گویا اس شیفون کی ساری کو کس رنگ میں رنگاؤں۔ چاروں طرف نہایت ٹھوس زندگی تھی۔ لوگ کھا رہے تھے اور شمپین پی جا رہی تھی۔ سامنے ایک دیوار پر کلب کے مختلف نوٹس آویزاں تھے۔ کونسی کتاب خریدوں۔ اگلے روز کی شاپنگ کا خیال کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ لیکن کتابیں یا غیر دلچسپ تھیں یا انتہائی تکلیف دہ۔ اٹیس کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ فیض ایک مستقل آزار ہے رکے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا ــــ

کیا اصل زندگی یہ تھی جو میں نے اب تک محسوس کی۔

لیکن وقت نے دفعتاً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ گلابی پھول میز کی سطح پہ نیچے گھاس پر جھک گئے۔ باہر وہ جگہیں ہیں۔ جہاں لوگ رات کو سوئیں گے۔ کھانا کھائیں گے۔ تفریح گاہوں سے واپس لوٹیں گے۔ آج کی رات اب آج کی رات نہیں۔ اس لمحے کے بعد سے وہ آنے والا پُر اسرار کل شروع ہو گیا تھا۔ کل جو ہمیشہ خوفناک رہے گا۔ سُرخ گلابوں کی مدھم روشنی کے سلسلے ہیں۔ ہیں غالباً یہی سوچتی ہوئی مروں گی کہ اور کیا تھا ــــ اور کیا تھا ــــ اور کیا تھا؟ صرف زندہ رہنے کا عمل۔ زندہ رہتے رہنے کا عمل۔ اس وقت اس کونے میں ایک لیمپ جل رہا ہے۔ زندگی میں جو کچھ اب تک ہوا۔ وہ ماضی کا ایک حصہ بن گیا۔ اب یہ میری موت

کا گفتہ ہے۔ لیمپ اور گلابی پھول۔ اور یہ انسان جو سامنے موجود ہے ــ خدا حافظ ــ
اس نے چپکے سے دہرایا۔ اور خدا حافظ ہیلنے بیگم ــ (وہ صبح کو بچوں کو ناشتہ کرواتی ہے۔ دوپہر کو اسکول ٹیلیفون کر کے آیا سے ان کی خیریت پوچھتی ہے۔ شام کو باہر جانے کے لئے ساری نکلوا کر استری کرواتی ہے۔ ایلیٹ کی نئی تنقید چھپی ہے جواب کی بار امریکہ سے نوشتے ہیں ریاض کو اتفاقاً قاہرہ کی ایک دوکان پر مل گئی۔ اور کیمبرج کے زمانے میں اس کی ایتھل مینن اور روز منڈلیہمن سے سخت دوستی تھی۔ لیکن یہ سب جان کر ہیلنے کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی نہ وہ کبھی اس سے اس قسم کا کوئی تذکرہ کرے گا) اس نے گلابی پھولوں کی ٹہنی کو چھوا ــ ہوا میں اس کے بال بکھر اُڑ رہے تھے۔ اس کی اصلی اور واقعی زندگی سے میں ہمیشہ علیحدہ رہوں گی ــ اس کی اپنی خالص ذاتی زندگی۔ گھریلو چیزیں۔ بل۔ زکام کے لئے کیلشیم کے انجکشن۔ اس کو کون سی سبزیاں پسند تھیں۔ کون سے رنگ۔ یہ کہ وہ بینگن شوق سے نہیں کھاتا تھا اور انتہائی نفاست پسند تھا۔ یہ اور بہت سی باتیں۔ اس کے اور میرے درمیان اس وقت میز، ان برتنوں اور ان پھولوں کی اسٹل لائف حائل ہے۔ میں یہ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نہیں کر سکتی۔ اچانک میں نے آخر کار موت دیکھ لی ہے۔ مکانوں اور باغوں کی اداسی جنگلوں پر سُرخ دھندلکا برس رہا ہے۔ یہ اس کی سرزمین ہے جہاں وہ اپنے باغوں، درختوں کے نیچے بیٹھ کر دفتر کا کام کرے گا۔ کتابیں۔ اس کے پسندیدہ سگریٹ۔ محبوب خوشبوئیں جھیلیں۔ درختوں کے نیچے سے گذرتے ہوئے سنسان راستے۔

قریب کی میز پر ایک خاتون دوسری خاتون سے مسلسل اپنے شوہر کے نئے عہدے کا ذکر کئے جا رہی تھیں ــ دراصل بہن، محمود صاحب کو تو فرصت ہی نہیں ملتی۔ ابھی آسٹریلیا سے لوٹے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ چلتے چلتے تین چار اور کوٹ اور بنا لو۔ لیکن اب تو

لندن پہنچ کر ہی خریدوں گی۔

وہ ان کی گفتگو سنتی رہی۔ ان ساری خواتین کے شوہروں کے کاندھوں پر نظامِ حکومت کا بار تھا۔ سب بے حد تشویش کے ساتھ ان کے "اوور ورک" اور "اسٹرین" کا ذکر کرتی تھیں سب کے چار چار یا چھ چھ بچے مری کے اسکولوں میں داخل کر دیئے گئے تھے۔

ذہن اور ذوق کی کائنات سے الگ حقیقی۔ واقعاتی زندگی میں یہی سب میرے ساتھی ہیں۔ انہی لوگوں میں مجھے اپنی عمر بتانی ہے۔ ان سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ نہیں۔ صبح و شام کے ان مناظر سے وہ ہمیشہ علیحدہ رہے گی۔ کائنات کے غیر شخصی خلا میں اس نے اپنے وجود کی نفی کو محسوس کیا۔

دنیا سے باہر، ماضی اور حال سے باہر، اپنے وجود سے باہر، میں کہیں بھی نہیں ہوں حالانکہ میں موجود ہوں۔ وہ سڑک پر نکل آئی۔ جہاں اس کی اسٹاف کار کھڑی تھی۔ تاریکی میں دوسری جانب کسی سفارت خانے میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ایک فوارہ چل رہا تھا۔ سب سو رہے ہیں اس وقت مجھے کوئی نہیں جانتا۔ لیکن میں موجود ہوں، رہوں گی ــــ

پھاٹک کے سامنے "کرڈ بلڈنگ" کی پلیٹ والی ایک اور کار آ کر رکی۔ "مس بلگرامی وائکا محل سے فون آیا ہے۔ آپ کا طیارہ رات کے دو بج کے پندرہ منٹ پہ یہاں سے اڑے گا۔" تاریکی میں سے کسی نے اس کو مخاطب کیا۔

"اچھا" اس نے جواب دیا۔ "چلو ڈرائیور۔"

خدا حافظ میرے پیارے انسانو ـــ اس نے اپنے آپ سے کہا ـــ زندگی میں کوئی اسرار نہیں ہے۔ ہر چیز بالکل عیاں ہے۔ عیاں اور واضح۔

خدا حافظ ـــ خدا حافظ۔

۴۷

کرسیوں کے نصف دائرے میں جو شام کے اختتام پر رفتہ رفتہ خالی ہو چکا تھا۔ صرف پدما بیٹھی رہ گئی ۔ اس نے اپنے سیاہ جوڑے میں سے ایک پھول نکالا اور کاہلی سے اس کی پنکھڑیاں الگ کرتی رہی۔

"ہلو ۔ یہ تم ہو ۔" اس نے آہستہ سے کہا اور میز کی سیاہ بلوریں سطح پر سے پھول ریاض کی طرف سرکا دیا۔

ریاض نے، آنکھیں جو جاگتے جاگتے، منتظر رہتے رہتے تھک چکی تھیں، وا کر کے پدما کو دیکھا۔

اصلیت محض یہ ہے کہ ریاض الدین احمد، کہ تم ساری عمر اپنے آپ کی پرستش کرتے رہے ہو۔ تم نے اپنے ذہن کی تصوراتی کائنات کو، اپنے وجود کے دوسرے حصے کو جو ہمیشہ بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ اور تم سے بچ کر آگے

نکل جانا چاہتا ہے۔ میرا لباس پہنایا تھا۔ تم کیوں نہیں دیکھتے۔ اس وقت بھی میں سُرخ ساڑی پہنے ہوں۔ اور میرے ہاتھ میں پوپی کے پھول ہیں۔ تم نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں ہیدونش کے ساتھ خوش نہیں ہوں اور اس بات سے تم دل میں کتنے مطمئن ہوئے ہو گے۔ نیلاٹے کے لیئے بھی شاید تم یہی سوچتے ہو گے وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں —— میں تم سے ہمیشہ دور رہی ہوں۔ اگر میں بھی تمہارے پیچھے بھاگتی۔ تو تم قطعی میرا نوٹس نہ لیتے —— افسوس یہ ہے کہ تم اس قدر غیر معمولی طور پر ذہین بھی تھے۔ تم لوگ یا ذہین ہوتے ہو یا اتو کے چھوٹے بھائی ہوسکتے ہو اور تم کو پتہ ہے۔ میرا پیارا شوہر ہیدونش مصرابھی اتو کا چھوٹا بھائی ہے —— اتنی مدتوں تک میں بالکل کنارے پر کھڑی رہی۔ لیکن اب میں واپس جا چکی ہوں۔ ہم سب واپس جا چکے ہیں۔

اس کا شوہر روش پر اس کی سمت آتا دکھائی دیا۔ دوسرے لمحے وہ اُٹھ کر اس کے ساتھ چلی گئی۔

دماغ کا دھندلکا سارے میں پھیل گیا۔

میری دوست۔ میری رفیق!۔ اس نے یکلخت جھک کر نیلاٹے کو دیکھا جو ابھی وہاں آکر بیٹھی تھی۔ میری دوست —— مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میری زندگی کے جھوٹ کیا تھے —— میری روح میں جو مٹی لگی ہوئی ہے اس کا تم کو اندازہ ہے؟ سائے جو ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں —— سائے جو محض شیشے، اور بلور، اور آبِ رواں اور بہار کی دھوپ

میں رہنا جانتے ہیں — ساری زندگی میں ان سایوں میں گھرا رہا — تم اتنی خاموش کیوں ہو — شاید تمہاری آرکیڈیا میں بھی مایوسیاں جھلکتی ہیں — ؟ میری رفیق — میں تمہارا جام صحت پیتا ہوں —

اس نے سُرخ پھول پر تھوڑی سی شمپین گرا دی۔ جو میز کی سیاہ بلوریں سطح پر پڑا تھا —

۴۸

پھر میں نے ہوا کی آواز سنی جو پانی پر سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ ہوا پہاڑوں سے ٹکرائی تھی اور سُرخ چٹانوں سے، جن پر ہری اداس بیلیں پھیلی ہوں گی۔ پھر یہ ہوا خاموش دور افتادہ شہروں پر سے گزری ہوگی اور کسی گلی میں کوئی انسان مر رہا ہوگا۔ اس کے اکیلے کمرے میں اس کا ایک جھونکا داخل ہوا ہوگا۔ پھر پرانے گرجاؤں کی اونچی موم بتیوں کی روشنی میں عبادت کرتے ہوئے سفید پوش راہبوں کے پاس گئی ہوگی۔ جبکہ چاندنی کی لکیریں کھڑکیوں میں سے اتر کے ٹھنڈے فرش پر پھیلی ہوں گی۔

اور پھر ہوا کا طوفان رک گیا اور ایک اور خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں پہلے ایک مبہم سی آواز سنی۔ یہ دریا آتش کی آواز تھی۔ جو رات کے ویرانے میں ایک سمت کو چلا گیا اور راحیل زمین پر کھڑی رہ گئی۔ اندھیرا اور روشنی اور راحیل۔

اور اب ہر طرف یہ ازلی اور ابدی تاریکی تھی، اور وسعت — تجربات سب پیچھے رہ گئے۔ امیدیں۔ خوف۔ بدصورتی۔ خواہشیں اتنی چھوٹی چھوٹی مسرتیں جن کی تکمیل کا خیال ہے مضحکہ خیز لگتا ہوگا۔ کہیں مہربانی نہ تھی۔ ہر سمت وحشت تھی۔ کوئی چیز بھی اپنی نہ تھی۔ وہ آنکھوں میں جو رنج، جو سچائی چھپی ہوئی تھی، اسے کسی نے دیکھا۔ آنکھیں جنہوں نے ہیگو پلاہ کا وژن دیکھا تھا۔

وژن —؟؟

راحیل۔ راحیل۔ تمہاری آنکھوں میں یہ بے رحمی کیوں جھلکنے لگی ہے۔ میں اس بے رحمی کو نہیں دیکھ سکتی۔ آرزو دیدی نے ملول ہو کر کہا۔

راحیل — کیا تم کسی چیز میں بھی یقین نہیں کرتیں —؟ ممکن ہے تمہارا وژن غلط رہا ہو — میں نے ہاتھ کنٹرول کرنے بستی سے اس سے پوچھا۔

اگر ذیاحق اب تمہارے پاس آئے —

اریاحق ہیں —؟؟ وہ کون ہے؟

راحیل کیا اب تم ہم سب سے نفرت کرو گی —؟ کہ تم کو وہ مہربانی وہ خلوص نہ دیا گیا جس کی تم مستحق تھیں۔ جس کی تم نے تمنا کی تھی۔ اگر زندگی بری ہے تو تمہیں اس سے بھی زیادہ برا بننا پڑے گا، اگر تم ایک بدقسمت ستارے کے زیر اثر پیدا ہوئی ہو تو میں — لیکن افسوس کہ قسمت کا وجود ہی نہیں ہے۔ صرف حیاتِ انسانی کا طویل سلسلہ ہے۔ یاد ہے۔ ایک مرتبہ میں نے کہا تھا۔ میں اپنی ساری کتابیں، اپنی ڈگری کی لوتن نائر بنا دوں گی اور اس کے گرد بیٹھ کر ہم آلہا اودل گائیں گے۔

میں نے وہ دروازہ اب تک نہیں دیکھا جس کے اندر میرا استقبال کیا جائے گا

کہ بالآخر یہ راحیل ہے۔ جس نے گلیوں میں پھرتے ہوئے بیمار کتوں اور اداس مظلوم انسانوں سے محبت کی ہے۔ جس نے ایک کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر اندر بجتی ہوئی سمفنی سُنی ہے۔ جبکہ وہ اس کمرے کے اندر خود کبھی نہ بلائی جائے گی۔

لیکن کائنات کے آرکیسٹرا میں ہم سب اکٹھے ہیں۔ یہ سامنے کا درخت جس پر زرد پھول کھل رہے ہیں۔ بارش کے پانی کی یہ جھیل جو سڑک پر بن گئی ہے۔ چبوترے پر کھڑے ہوئے اکیلا اطالوی جو اکارڈین بجا رہا ہے۔ تم اور میں —— راحیل واپس آؤ۔

پر راحیل چلی گئی۔ اس وقت اس کا طیارہ دہلی تک پہنچ چکا ہوگا اور اب ہم شاید اسے کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔

۴۶

اور ان تازہ خداؤں نے مجھ سے کہا۔ تمہارے راستے بند ہیں اور ساری زمین اب ہماری ہے اور میں نے سوچا یہی ٹھیک ہے۔ جب ہم اپنے دیوتاؤں سے بھاگ چکے ہیں تو ہم کو دوسرے دیوتا کہاں ملیں گے۔ صبح کو بریچز پہنے، زینب خالہ بریکفاسٹ کے لئے کمرے میں داخل ہوتی تھیں اور شام کو باغ کی ہر چیز سنہری ہوتی تھی اور دروازوں کے ریشمیں پردے آبشار کی طرح گرتے تھے۔

اب محض کوس موس کے فضول ہونے کا احساس باقی رہ گیا ہے۔

ایک ادھ پڑا خواب، تھوڑی سی بیمار نیند، میرے لئے چھوڑ دو۔ یہ نہ پوچھو کہ صبح کے دھندلکے میں سے اب کون آئے گا۔ دیوانے پرند فضا میں ہنس رہے ہیں۔ چوہے دیوتاؤں کی طرف بھاگ رہے ہیں، پھولوں پر موت کا سایہ ہے۔ کمروں میں خرگوش دوڑ رہے ہیں۔ کتے بھونکنا بھول گئے ہیں۔ خانہ زاد نوکر پینک میں ہیں۔ باقی دیوانے ہو چکے

ہیں۔ آسمان پر جو اڑتی ہیں اڑ رہی ہیں۔ رات کو بوگی میں آتا ہے۔

علی چپ چاپ سڑک پر چلتا رہا۔ نمبر بائیس فیض آباد روڈ — اس نے ایک پھاٹک کے ہتیل کے بورڈ کو غور سے دیکھا — پھاٹک میں تالا پڑا ہوا تھا۔ باغ میں بہت اونچی گھاس اگ آئی تھی۔

میری رانی۔ اس نے دل میں اسے مخاطب کیا۔ تم جدھر بھی جاؤ گی، تم کو اس راستے پر تنہائی ملے گی۔ تم کو تنہا سفر کرنا ہے۔ آوازیں، تصورات۔ وجود کا شور۔ وجود کی امڈتی خاموشی۔ تم ان چیزوں سے نہ بچ سکیں۔ اعصاب شکست۔ دماغ کے دھندلے بھوت جس طرح میں ان سب کی معیت میں رہا۔ کیا زندگی کا ماحصل محض یہی تھا؟ لیکن بالآخر اس مٹی پر چند منتقم خدا پیدا ہوں گے۔ اس نے نیلی گھاس میں چھپی ہوئی مٹی کی خنکی کو محسوس کیا۔ آفاق کے اس ابدی انتشار میں جو روحیں تخلیق ہوئیں ہیں ان سب سے زیادہ واش آؤٹ ہوں۔

تم کون ہو — ؟ ایک آدمی نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔

انتہائی واش آؤٹ — اس نے کہنا چاہا ”علی —“ اس نے جواب دیا۔

”تم کو پتہ ہے —“ اس نے چاروں اور دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں رنج سے کہا ”ہم صرف اپنے کھیتوں اور گلیوں کا سکون چاہتے تھے اور اپنے گیت۔ اب یہاں کیا رکھا ہے۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا ”آگے جاؤ — آگے نئے ملک ایجاد کئے گئے ہیں۔ بموں کے کارخانے بن رہے ہیں۔ قومی ’کلچر‘ کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا ہے۔ آگے جاؤ۔“

”کریں گے اہلِ نظر — کریں گے اہلِ نظر —“ دوسرے اس کے ساتھی نے بے دلی سے گنگنانا چاہا۔

اوم شانتی ___ اوم شانتی ___ ایک برہمن کھنکار کر اپنا راستہ چلتا رہا۔

علی ایک سنگِ میل پر بیٹھ گیا۔ ابھی شام ہونے میں دیر تھی اور دوپہر کی دھوپ سیاہ ہو گئی تھی۔

دیواروں پر مختلف پوسٹرز لگائے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں چھوٹے چھوٹے جھنڈے اور پوپی کے پھول فروخت کرتی پھر رہی ہیں۔ شاید آج امن کا دن ہے۔

تین لڑکیاں سامنے کے ٹیلے سے اتر کر اس کے نزدیک آئیں۔

ہم دستخط جمع کر رہے ہیں۔ ہم بہت غیر اہم، کمزور ہستیاں ہیں۔ تمہارے ملکوں کی، دنیا کی طاقت بہت بڑی ہے۔ لیکن اس سفید کاغذ کی طاقت غالباً سب سے زیادہ ہو جائے گی اگر اس پر تمہارے دستخط ہوں ___ دونوں ملکوں میں ہم نے دستخط جمع کئے ہیں۔

انھوں نے کاغذ آگے بڑھایا۔

"ٹٹ ٹٹ ___ یہ بھی ایک اور قسم کی ذہنی عیاشی ہے ___ امن کے قیام کے لئے یہ پتلا سا سفید کاغذ ___ "تم کو جا کر پھیلا سینا میں شامل ہونا چاہئے۔ یہاں کیا کر رہی ہو" ___ ایک عقلمند آدمی نے پاس سے گذرتے ہوئے کہا۔

"آپ سب خرگوش ہیں۔" علی نے بگڑ کر جواب دیا۔

"کیا کہا تم نے ___؟ میں شہر کا نیا ڈی۔ سی ہوں ___ سمجھے تم ___؟" عقلمند آدمی نے شعلہ بار آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"خرگوش ___ خرگوش ___" علی نے ضد سے دہرایا

"لیجئے ___" لڑکی نے کاغذ اس کے آگے بڑھایا

"کیا ___؟" علی نے چونک کر اسے دیکھا ___ میں جو ہرنوں کے پیچھے چھپا پھرتا تھا

یکلخت میں امن پرست بن گیا ـــ ؟ مجھے یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا اب بھی میں لڑوں گا ـــ

"میں لڑوں گا" اس نے بآوازِ بلند دہرایا۔

لڑکیاں اس کے قریب دوسرے پتھر پر بیٹھ گئیں ـــ علی نے ان کو غور سے دیکھا۔ کیا یہ میرانلنی، اسٹیلا اور راجیل ہیں ـــ ؟ ان کے لباس بالکل سادے تھے اور ان کی شکلوں میں کوئی گلیمر نہ تھا۔

"بہنوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے ؟" اس نے منہ لٹکا کر ان سے پوچھا

"بہنیں ـــ ؟ بڑی فرسٹ کلاس ہوتی ہیں" لڑکیوں نے جواب دیا

"میری بہنیں بالکل فرسٹ کلاس نہیں تھیں۔ واش آؤٹ۔ قطعی واش آؤٹ" اس نے کہا

دھوپ زیادہ سیاہ ہو گئی۔ بوڑھا جو مدتوں سے، الگنر کے کنوئیں کے نکڑ پہ پھولوں کے گجرے بنا کر بیچتا آیا تھا، لاٹھی پہ جھکا دھیرے دھیرے قدم رکھتا ایک سمت کو جاتا دکھائی دیا۔ نانا ابا کا نقرئی پیچوان، سر ہنگر کا مجسمہ، جنرل ہیولاک کے محاصرے کی یاد، معظم منزل کی دہریاں، ان سب کا کیا ہوا ـــ دیکھو وہ سامنے سے کون لوگ چلے آ رہے ہیں۔ اندھے انسانوں کی قطاریں ـــ خبطی، جہاں پرش، دیوانی لڑکیاں، لنگڑے جنرل ـــ نہیں اب میں کچھ یاد نہ رکھوں گا ـــ یہ کاغذ مجھے دو ـــ اس پر لکھا ہوا میرا نام ساری دنیا میں جانا چاہیئے ـــ

وہ کاغذ پر جھک گیا۔

چاروں طرف جو گھما گھمی تھی اس میں اضافہ ہو گیا۔

ایک لموزین اس کے پاس آ کر رکی۔

"تسلیم میاں ـــ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں سڑک کے کنارے۔ چلئے میں آپ کو

گھر پہنچا آؤں ــــ" ایک اور لڑکی نے کار میں سے جھانک کر کہا۔

"گھر ــــ" علی نے کاغذ پر سے سر اٹھا کر ذرا جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ "گھر نہیں ہے ــــ لیکن تم کون ہو ــــ؟"

"ارے میاں۔ آپ پہچانے نہیں ــــ؟ میں بختاور ہوں جس کو ایک رات آپ نے پناہ دی تھی ــــ میرے باپ دادا کی عمریں آپ کے ہاں دھان پھٹکتے گذریں ــــ آپ کو پتہ نہیں ــــ" اس نے حیرت سے پوچھا ــــ میں سلطانہ مہ جبین ہوں۔ جو ریڈیو میں گاتی ہوں۔ بی بی سی سے میرے ریکارڈ نشر ہوتے ہیں۔ پلے بیک کے لئے میرے پاس ان گنت کنٹریکٹ آتے ہیں۔ میرے چار فلم ایک ساتھ تیار ہو رہے ہیں۔ رضا میاں ہزاروں بار شادی کا پیغام بھیج چکے ہیں ــــ میری زندگی بے حد کامیاب رہی ہے نا علی میاں ــــ؟"

"تم مجھے علی میاں کہتی ہو۔ گویا میں اب بھی تمہارا آقا ہوں۔" علی نے جھنجھلا کر کہا

"ارے بھیا ــــ" اس نے اپنے خوبصورت سانولے بازوؤں کو اٹھا کر ان پر نظر ڈالی ــــ "آپ آقا نہیں ہیں تو اور کون ہیں ــــ میرے روئیں روئیں نے تو میاں آپ کا نمک کھایا ہے۔"

علی جھنجھلا کر سنگ نیل پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھیک ہے تمہاری زندگی بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ اس طرح کی کامیاب زندگیوں کے متعلق انٹرویو کئے جاتے ہیں۔ افسانے تحریر ہوتے ہیں۔ سوانح عمریاں تصنیف ہوتی ہیں۔ میں نے اکثر سوچا۔ تم کہاں ہوگی شاید کسی گاؤں میں کسی کسان کی بیوی کی حیثیت سے اپلے تھاپنے میں مصروف ہو یا شاید رضا میاں نے پھر تم کو بلوا لیا ہو ــــ یا شاید ــــ شاید ــــ"

"علی بھیا آپ خوش نہیں کہ میں اتنی شکھی بن گئی —؟" علی کو خاموش دیکھ کر بھاورنے پوچھا۔ "بھیا جتنے بڑے بڑے آدمی آپ کے یہاں آکر گول کمرے میں بیٹھا کرتے تھے اور میں ان کے لیے پان یا چائے لے کر جاتی تھی۔ اب وہ سب میرے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے"۔ علی نے سوچا۔ "اس نظام میں یا تم بھاور رہو گی یا کانو ادر پروڈکشنز کی چیف اسٹار سلطانہ مہ جبین بن جاؤ گی۔ تیسرا راستہ تمہارے سامنے نہیں۔ تیسرا راستہ اختیار کرنے کی تم کو صلاحیت نہیں عطا کی گئی۔ ورنہ ان تین لڑکیوں کے ساتھ چوتھی تم بھی ہو سکتی تھیں — اس نے سفید لباس والی لڑکیوں کو دیکھا۔

"مس ماہ جبیں آپ بھی اس کاغذ پر دستخط کر دیجیے —" ایک لڑکی نے سکون کے ساتھ کاغذ اس کے سامنے پیش کیا۔

اس نے بے حد پرشفقت مسکراہٹ کے ساتھ اپنے نام کا کاغذ پر اضافہ کر دیا —

"اچھا۔ اللہ حافظ بھیا —" اس نے سادگی کے ساتھ علی سے کہا اور رلموزین اسٹارٹ کر کے آگے چلی گئی۔

علی پھر پتھر پر بیٹھ گیا۔

اس کے دماغ میں جو شور مچ رہا تھا۔ اس میں زیادتی ہو گئی۔

اب یہ کون لوگ سامنے سے آ رہے ہیں —؟ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر تھکن کے ساتھ پوچھا

"شاید یہ لوگ روٹی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یا ممکن ہے یہ وہ انسان ہیں جو بیحد ارمانوں کے ساتھ نئے ملک گئے تھے اور وہاں سے بھی نکالے گئے اور اب اپنی

فریاد دے کر گورنمنٹ ہاؤس جا رہے ہیں۔ یہاں روزانہ اس قسم کے جلوس نکلتے رہتے ہیں۔" ایک لڑکی نے اسے بتایا۔

انقلاب ایک خواب تھا۔ ہم کس موت سے بچے۔ اب کونسی موت ہمارے سامنے ہے۔۔۔؟

مجھے ہر ایک سے توقعات تھیں ۔۔ علی نے آہستہ آہستہ کہا ۔۔ میں غالباً اس قدر فرشتہ صفت تھا۔ مجھے انتہائی ہیرو سمجھا گیا ۔۔ جو صفات دوسروں میں نہیں تھی وہ ان کو مجھ میں نظر آئیں۔ ہر جگہ مجھے، جذبات، تعریف اور تکریم کے ذریعے خریدا گیا۔ شاید ان سب کے خیال میں، میں ایک قسم کا چھوٹا موٹا بنے بھائی والا تھا۔ کزن اسٹیلا نے جو میرے ساتھ میرے کسی جذباتی تجربے میں شریک نہ تھی مجھ سے کہا کہ مجھ میں زندگی کا شدید ڈرامائی احساس ہے ۔۔ سو واٹ ۔۔ میں نے اسے جواب دیا۔ ہر ایک کو ہے۔ آخر تم کیوں یہ جینین اڈنیل پر مری جاتی ہو ۔۔ اور یہ بات قبول کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں کہ سب اپنے آپ کو اپنی اپنی جگہ ہیرو سمجھتے ہیں، یا ایک سے ایک ٹریجک کردار ۔۔ تم نے ایک بات نوٹس کی ۔۔ اس نے رک کر کہا۔ میں تم لوگوں سے برابر باتیں کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں تم کو بالکل نہیں جانتا۔ کلب میں بھی کبھی تم سے ملاقات نہیں ہوئی ۔۔ بچپن میں میں نے صرف ہرمزی خانم اور مس کیتھلین چیہ سے اس طرح باتیں کی تھیں ۔۔ مس کیتھلین چیہ کس قدر زبردست اسنوب تھیں ۔۔ تم کو معلوم ہے؟ لیکن بھلا تم ہم لوگوں کو کیا جانو ۔۔

زندگی مستقل اسرار تھی۔ مستقل راز ۔۔ لیکن اب ہر چیز عیاں ہے ۔۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ سوپر جینیس سمجھا گیا ۔۔ میں نے کبھی اپنے بل خود ادا نہیں کئے۔ مسعود بی کی طرح

خلافِ قانون گھوڑے دوڑاتے۔ گھر والوں کو جی بھر کے پریشان کیا۔ اور وہ سب اس بات سے بے حد خوش تھے (اسے محسوس ہوا کہ اس وقت وہ بے حد مقدس نظر آ رہا ہے)۔ زندگی کی معصومیت بالآخر معصوم نہیں رہی۔ ہم آخر کس طرح اپنا اظہار کرتے۔ ہر موقع پر ہم کو غلط سمجھا گیا۔ ہم سے کہا گیا۔ ہم ریاکار ہیں، پوزیٹر۔ ذہنی امارت پر نازاں۔ اور ہم مستقل تکلیفیں اٹھاتے رہے۔

میں یہ زمانے دیکھ رہا ہوں۔ تیس سال۔ عمرِ عزیز کے تیس سال میں نے یونہی گنوائے۔ دس سال پہلے، گوپال پور جا کر میں نے لگان کی رقم بڑھا دی۔ ہمارے کسان جو لگان نہ دے سکتے تھے، زمینیں چھوڑ کر روتے ہوئے کانپور روانہ ہوئے جہاں ہری کے والد کی ملیں تھیں اور حکومت جنگ کے خطرے کی وجہ سے آرڈیننس فیکٹریاں قائم کر رہی تھی۔ میرے گاؤں کی رونق لٹ کر شہروں کی ان تاریک گنجان گلیوں میں آگئی جہاں میری آنٹی اور کزن اسٹیلا سفید خوبصورت ساریاں پہن کر سوشیولوجی کی تحقیق کے لئے جاتی تھیں اور اقتصادیات کے تھیسس کے لئے اعداد و شمار جمع کرتی تھیں۔

میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرا۔ میرے ہاتھ میں شمع تھی لیکن میرے چاروں اور بہت سی شمعیں بجھ کر جل رہی تھیں اور جل کر بجھ چکی تھیں۔ روح کی بے آرامی اور زندگی کے جمود سے گھبرا کر میں ٹراٹسکیوں میں جا شامل ہوا۔ میں نہرو کا چیلا بنا۔ سوشلسٹوں کے ساتھ میں ریلیں جلانے۔ پل اڑانے اور پٹریاں اکھاڑنے کے انتظامات میں مصروف رہا اور ایک سہانی شام میرے خاندانی دوست ایلمر رکیسٹن نے مجھے قید کر لیا۔ دو سال بعد میں رہا ہوا لیکن دنیا وہی تھی۔ کسی چیز میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ جنگ زوروں پر تھی اور میرا پیارا دوست ایلمر کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا۔ ہنستا اس لئے تھا کہ دنیا کی مارکیٹوں میں جرمن اس کا مقابلہ

کرنے کے لئے اب موجود نہ تھے۔ رونا اس لئے تھا کہ اس فتح کے باوجود ایمپائر آخر کار متزلزل ہو رہی تھی۔

پھر ملک میں بڑے بڑے ایڈوینچر رہے۔ نہرو جی رہا کئے گئے۔ کانفرنسیں ہوئیں۔ آئی این۔ اے کا سلسلہ رہا۔ پھر میرے اور تمہارے باوجود ملک کو تقسیم کر دیا گیا۔ کوئی گہری۔ تیز دھار دار چیز تھی جس نے روح کو کاٹ ڈالا۔ بالکل کاٹ ڈالا ــــ اب یہ لوگ کیا چاہتے ہیں کیا کہہ رہے ہیں؟ اس نے آنکھیں اٹھا کر انسانوں کے ہجوم کی طرف دیکھا جو دھیرے دھیرے گورنمنٹ ہاؤس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ جلوس کے آخری سرے پر غالب رضا قاسم تھے۔ اُن کی باریک نفیس مونچھیں نیچے کو جھک آئی تھیں اور ان کا جامدانی کا انگرکھا اتنا شفاف نہیں رہا تھا۔

یہ لوگ دوسرے نئے دیس سے واپس کر دیئے گئے اور اب یہاں لوٹ کر سر چھپانے کے لئے کسی ٹھکانے کی بھیک مانگ رہے ہیں ـــــــــــــــ

ایک براہمن نے دوسرے براہمن سے سرگوشی کے لہجے میں کہا اور کنارے کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے لگے۔

"خدا ان الّو کے بھائیوں پر اب کیا رحم کرے گا ـــ" علی نے دفعتہً غصے سے کہا۔

"ہیں" ایک سفید ریش انسان نے چلتے چلتے رک کر اسے دیکھا "کچھ دینِ اسلام کی باتیں کرو میاں صاحبزادے۔ دوسروں کو گالیاں دیتے ہو ـــ؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو تم کو تو اپنے خاندان کا نام روشن کرنے کے لئے اس وقت پی اے ایس میں ہونا چاہیے تھا ـــ" سفید ریش نے خفگی سے سر ہلا کر کہا۔

ایک پیکارڈ آ کر رکی جس میں گورنر کے دو اے ڈی سی بیٹھے تھے۔

"آپ لوگوں کو لفٹ چاہیے۔" انھوں نے بے حد گیلنٹ انداز میں لڑکیوں سے پوچھا

"جی نہیں — ہم کو ابھی بہت کام کرنا ہے۔" لڑکی نے اخلاق سے جواب دیا۔

"کام — اچھا یہ عالمگیر امن اور کلچر کے تحفظ وغیرہ کا کچھ سلسلہ ہے"۔ ایک اے۔ ڈی۔ سی نے دوسرے کو بتایا

"کلچر —؟"

"میاں اس میں یہ ہوتا ہے کہ چھٹی کے دن ساری قوم کی قوم کلچر پیلس میں جاتی ہے اور فوک آرٹ پر تقریریں کی جاتی ہیں۔"

"بھائی جب تک یہ کلچر دلچر کی وبا یہاں نہیں پھیلتی تبھی تک خیریت ہے۔ ورنہ پھر دیکھنا۔" دوسرے نے جواب دیا۔ پیکارڈ بھی آگے نکل گئی۔

زندگی کا بہت لمبا جلوس تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ موٹریں چل رہی تھیں۔ آسمان پر بمبار طیارے اور خوبصورت ایر لائنر اڑ رہے تھے۔ انسان بھاگ رہے تھے۔ مر رہے تھے۔ زندہ تھے۔ لڑائیاں شروع کی جا رہی تھیں۔ فوجیں مارچ کر رہی تھیں۔ زندہ رہنے کا جوش وخروش جاری تھا۔ مدھم پڑتا تھا۔ پھر تیز ہو جاتا تھا۔ تیز مدھم۔ تیز مدھم — یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ اس نے ہاتھ کھول کر سب طرف نظر ڈالی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے فوجیوں کی سنگینیں تیزی سے چمکیں —

سنگینیں — اس نے خوفزدہ ہو کر چاروں اور دیکھا۔ یہ لوگ جو چل پھر رہے ہیں چائے خانوں میں جا رہے ہیں۔ بچہ کی انگلی پکڑے جو عورت بس پر سے اتری ہے۔ بوڑھا جو کتے کے ساتھ سڑک کے کنارے جا رہا ہے — ان کو ختم کر دیا جائے گا۔ موت ان سب

کے لئے ہر لحظہ مستعد کھڑی ہے۔ جنگ کے رسیا چوکس ہیں۔

"تم کون ہو ـــ؟" بانکے فوجی نے سنگین کی نوک بالکل اس کی آنکھوں کے آگے جھلملا کر پوچھا۔

"میں ـــ میں امن پرست ہوں ـــ میں امن پرست ہوں" علی نے تقریباً چلا کر جواب دیا۔

"ابھی یہ کس نے شور مچایا تھا۔ تحفظِ امن عامہ میں خلل اندازی ـــ" ایک اور افسر نے قریب آکر پوچھا۔

"میں چلایا تھا" علی نے بچوں کی طرح فخریہ جواب دیا۔

"یہاں سے آگے جاؤ ـــ کیا تم کو معلوم نہیں ـــ یہ فتح کا دن ہے۔ ہمارا سیناپتی محاصرہ ختم کرکے لوٹتا ہے۔ اس کی خوشی میں چراغاں ہوگا۔ لڑکیاں اسے جے مالا پہنائیں گی راستے پر سے ہٹو۔ اس پر قالین بچھائے جا رہے ہیں"۔

"لیکن میں علی ہوں"۔ اس نے ضد سے دہرایا۔

"کون ـــ؟ تب تو تم کو قطعی یہاں سے دفع ہو جانا چاہئے"۔ افسر نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"کدھر جاؤں ـــ؟" علی نے سوال کیا۔

افسر نے سیاہ روشنی میں مغرب کی سمت اشارہ کیا "وہاں۔ ادھر جدھر اور سب جا چکے ہیں"۔

"لیکن یہ میری زمین ہے۔ اس پر میرا خون گر چکا ہے۔ اس کے لئے میں نے اپنا خون بہایا ہے۔ تم نے میرے زخموں کو نہیں دیکھا ـــ؟" اس نے اپنا ہاتھ آگے پھیلا دیا۔

بالآخر فاتح کی کیڈی لیک قریب آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے آئی جی چلا آ رہا تھا۔ جو آوارہ گردوں، انقلابیوں اور بدقسمتوں کو جیل بھجوائے گا۔

"ہمارے پیارے پیشواتی کی جے"۔ فضا نعروں سے گونجی

"یہ کون ہے"۔ علی نے اسے غور سے دیکھا

"یہ کون انسان ہے جو راستہ روکے کھڑا ہے"۔ کیڈی لیک میں سے آواز آئی۔

"ہلو۔ اردن۔ ارے اردن میرے بھائی"۔ علی نے اس کی جانب بازو پھیلا دیئے

"یہ کون انسان ہے"۔ جنرل نے اپنے ایڈ جنٹ سے دریافت کیا۔

"سرکار یہ وہ روح ہے جس کی دونوں ملکوں میں کوئی جگہ نہیں۔ اس کی پوری رپورٹ میرے پاس موجود ہے۔ سرحد پار کے پولیس نے بھی اس کی رپورٹ میرے پاس بھیج جا چکی ہے"۔ حاکم پولیس نے مستعدی سے سرگوشی کے لہجے میں فاتح کو بتلایا۔

"اردن۔ میرے پیارے بھائی۔ میرے دوست"۔ علی نے بازو پھیلائے پھیلائے آواز دی۔

کیڈی لیک ایک جھٹکے کے ساتھ آگے جا چکی تھی۔

میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔ میرے پیارے علی۔ میں میجر جنرل اردن کمار راجوتش ہوں۔ میں ابھی جنوب کے صوبے میں اپنے دس ہزار ہم وطنوں کو بلا کسی وجہ کے ہلاک کروا کے آ رہا ہوں۔ رائل اکیڈیمی سے پاس ہو کر باہر نکلتے وقت اپنے دوسرے ہم وطن افسروں کے ساتھ چپکے سے جو عہد نامہ اپنے خون سے ہم نے لکھا تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ لیکن میں فاتح ہوں اور اس وقت فوج کی سلامی لینے جا رہا ہوں۔ پھر گورنمنٹ ہاؤس واپس

جا کر چارج لوں گا اور اس کے بعد اپنے ملک کے ملٹری مشن کی قیادت کرتے ہوئے تمہارے نئے دیس جا کر وہاں کے جنرلوں سے ہاتھ ملاؤں گا — مجھ سے بھی محبت کرو۔ مجھے بھی جانو۔ کسی نے روح کی اس جلا وطنی کو دیکھا ہے —— اس جلا وطنی کو دیکھا ہے —؟

ارون نے کیڈی لیک کی پچھلی سیٹ کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

فارخ کی کیڈی لیک راستے کے دھندلکے میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

شام ہوتی جا رہی تھی اور عبادت خانے کی گھنٹیوں کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ علی سنگ میل پر سے آہستہ سے اٹھا۔ تینوں سفید پوش لڑکیاں کسی اور سمت جا چکی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے مقدس دیواروں کے جنگل کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں صدیقہ مریم کی عبادت گاہ تھی۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ گرجا کے پورچ میں سیاہ لباس پہنے ٹوپیاں اتارے چند انسان جمع تھے۔ شمعیں اٹھائے فادر انتھنی آخری دعا پڑھ رہے تھے۔

یہ کس کا اختتام ہے —— دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ روش کے پتوں پر دبے پاؤں رکھتا وہ ایک دیوار کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ خزاں کی بارش کے پہلے قطرے اس کے بالوں پر ٹپکے۔

۵۰

اسپری ٹو ان گلوریا ڈیئی پیٹرس۔ ایکس ماریا ورجنے ایٹ ہومو فکٹس ایسٹ۔ بینے ڈکٹس او منی پوٹینس ڈیوس پیٹر ایٹ فلیوس ایٹ اسپری ٹس سنکٹس۔ آمین۔ فادر انطنی نے کہا۔

گھنٹیاں بجتی رہیں۔ رانا تامرایا ـــ علی نے چپکے سے کہا۔ اور ٹوپی اتار کر یوکلپٹس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ شمعوں کی جھلملاہٹ میں ارفنٹ برومل کی نماز جنازہ جاری رہی۔

میرلو۔ اس نے دہرایا ـــ

سنکٹس سنکٹس سنکٹس۔ ایلمر نے دوسرے درخت کے نیچے سے نکل کر آہستہ سے کہا۔

ہاتھوں میں اونچی موم بتیاں لئے ہوئے جنازے کا جلوس عبادت خانے کے پیچھے کی سمت بڑھنے لگا۔ جدھر قبرستان تھا۔ سنگِ مرمر کی سلیں پانی میں بھیگ رہی تھیں اب میرے اور کسی اور کے درمیان کسی خیالات کا پل نہیں ہے۔ میں بالکل الگ ہوں۔ بالکل الگ ـــ ایلمر نے ٹوپی ہاتھ میں لئے تابوت کی جانب نظر ڈالی ـــ یہ

ارنسٹ بربیل ہے جو آخر کار ختم ہو گیا ـــــ جو بیتھوون بجاتا تھا۔ اس نے محاذِ عوام میں کام کیا۔ اپنے گھر والوں کو گیس چیمبر کی بھینٹ دے کر سن تینتیس کی جرمنی سے فرار حاصل کیا۔ اس نے یہاں کے الوہی رقص اور نغموں میں پناہ لے کر یہاں کے فن کو اور سنوارنے کی لگن رکھی۔ اسے دُنیا کے ہر انسان پر مکمل اعتماد تھا۔ ہر چیز سے اسے خوشی حاصل ہوتی تھی وہ بچوں کی طرح خواب دیکھتا تھا اور گہری نیند سوتا تھا۔ سات سال تک اس کے اعصاب دل و دماغ اور ہاتھوں کو مفلوج رکھا گیا۔ لیکن اپنے مہلک مرض سے ہار مان کر آج جب وہ مرا تو اس کے ہونٹوں پر دھیما تبسم تھا۔ گویا وہ اپنے باویریا کے جنگلوں اور سبز میدانوں کو واپس پہنچ گیا ہے۔

ایلمر پورج کی سیڑھیاں طے کر کے قربان گاہ کے پردے کے آگے جھک گیا ـــــ خداوندا ـــــ اس نے آہستہ آہستہ کہا۔ تو نے مجھے پیدا کیا۔ تیرے سارے خیالات میں میں سب سے زیادہ افسوسناک اور قابلِ رحم خیال تھا۔ میرا وجود ایک انتہائی شرمناک خیال تھا۔ تو نے مجھے پیدا کیا۔ تو نے ذلیل کتنے بھی پیدا کئے ہیں ـــــ مجھ پر رحم کر ـــــ

قربان گاہ کی رنگین کھڑکیوں کے باہر نمازِ جنازہ کی دعا کے آخری الفاظ جنگل کے کہرے میں پھیلتے جا رہے تھے ۔ ریکوئی ایس کنٹ اِن پیسے ۔ آمین

میں قابیل ہوں اور میں نے اپنے آپ کو قتل کیا ہے ۔ ایلمر نے خدا کی ماں کے سامنے دو زانو ہو کر مدھم آواز میں کہا۔

میں غیر فانی ہوں ـــــ کلی نے اپنے آپ کو بتایا اور موم بتیوں کی گیلی مدھم روشنی کو دیکھتا رہا۔ فراٹرس کاراشمے ہم اگ دیسنر ٹیم سکر ٹیسیام "تمہاری قربانی قبول ہوگی"۔

"میرے دماغ میں جو ندی بہہ رہی ہے۔ اس کا شور تم نے سُنا۔" دفعتہً ایلمر نے مڑکر، ذرا خوف کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"میں غیر فانی ہوں"۔ علی نے دہرایا۔

"میں خوف کی وادیوں کی طرف سے آیا ہوں ——— جہاں خدا کا ماتس بھوت مناتے ہیں —— ہم اور تم ایک گذرے ہوئے وقت کے بھوت ہیں —" ایلمر نے کہا۔

"تمہارا اور میرا وقت ختم ہو چکا —" علی نے کہا۔ سیڑھیوں سے اتر کر شمعیں لئے ہوئے وہ پورچ کے سامنے آ گئے۔

یہ قبریں کیسی پُراسرار ہیں جن کے کتبوں پہ مرثیے، نصیحتیں، ارمان بھرے شعر اور دعائیں لکھی ہیں۔ ایلمر نے کہا۔

"یہ کتبے جیسے وزیٹنگ کارڈ ہیں۔ جو یہاں آکر جانے والے دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے" علی نے کہا۔

"ہاتھوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ جنہوں نے بندوقیں اٹھائیں تصویر کشی کی، پانچویں سمفنی بجائی۔ پیروں کو بکسوں میں کیلوں سے بند کر دیا گیا۔ جنہوں نے وی آنا کا والتس کیا۔ برف کی سطح پہ پھسلے، خوبصورت شہروں کی سڑکوں پہ مارچ کیا" ایلمر نے کہا۔

چاند کبھی کبھی کسی ٹوٹی ہوئی صلیب پہ جھک آتا ہے۔ سنگِ مرمر کی صلیبوں کے پیچھے سے پتھریلے چہرے اور گلابی، معصوم آنکھیں جھانکتی ہیں ——— زندگی کا خوف پالتو کتے کی طرح پھر تمہارے پاس واپس

آگیا ہے۔" علی نے کہا

"میری روح، ہر آرام دہ جگہ سے بھاگ کر پھر باہر کی سردی اور تاریکی میں جا کھڑی ہوتی ہے ـــــ" البجمترہ نے ہتھیلیاں کھول کر کہا۔

"یہاں چاروں اور خوبصورت عورتوں کے مردہ چہرے ہیں۔ فلسفے سو چکے" علی نے کہا۔

چاند رفتہ رفتہ دیودار وں پر بلند ہو کر ان کے مقابل میں آگیا۔

۵۱

چاند اوپر آ کر دریچے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

میں واپس آگئی ہوں۔ چنانچہ میں واپس آگئی ہوں ــــ دفعتاً اسے ایک۔ شدید روشنی کا احساس ہوا۔ جو کھڑکی میں سے اندر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ چاروں اور دیکھا۔ روشنی۔ تاریکی۔ خوف۔ چھبیس سال سے میں اس طرح زندہ ہوں۔ مجھے سکون نہیں ملا۔ یہ بہترین زندگی تھی۔ خوابناک زندگی جس کا عموماً کہانیوں میں ذکر ہوتا ہے۔ جو اب تک میں نے بتائی۔ یہ بے حد ہولناک زندگی تھی۔ قدم قدم پہ مجھے ڈر کا احساس ہوا۔ ہر طرف خطرہ ہے۔ لوگ جو مجھ سے ملتے ہیں۔ جو میری تعریف کرتے ہیں۔ ان سب نے نقابیں پہن رکھی ہیں۔ یہ سب ٹنڈو ناچ ناچ رہے ہیں۔ شروع سے میں نے چیزوں کو بچانا چاہا ــ (تم کو تو ــــــ

ــــــ Persecution Complex ہو جائے گا۔ میرا نے عقلمندی سے کہا

تھا۔ اس وقت وہ اپنے کتے سے باتیں کر رہی تھی۔ پیارے کتے میں تم کو کرنل جہانگیر کے پاس لے جاؤں گی۔ ایک ہنگامی کانفرنس کر کے جب وہ کتا خریدا گیا۔ اس کا نام تجویز کرنے کی سعی کی گئی۔ لیکن آخر کار بالاتفاق رائے اس کا نام کتا ہی تجویز کیا گیا تھا لیکن کتے کو یہ نام بہت ناگوار گزرے گا۔ میرا نے افسوس کے ساتھ کہا تھا جیسے تم لوگ مجھے میراثنی کہتے ہو تو مجھے رنج ہوتا ہے۔ میرا نام دراصل ستیہ وتی دیوی یا کچھ اور ہونا چاہئے تھا۔ پھر میں نادرہ اور عالیہ باجی کے گروپ میں رہی۔ چھ سال سے میں سینٹ جان ایمبولنس کے ایک اعلیٰ فوجی عہدے پر فائز ہوں۔ میں نے گوپالا کی جستجو کی۔ اور اب مجھے اس خوف کا احساس ختم کر رہا ہے۔ وقت بھاگا جا رہا ہے۔ لمحہ لمحہ لمحہ۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس نے آتشدان پر رکھی ہوئی اپنی ایک تصویر کو دیکھا۔ یہ لڑکی جو نجم الدولہ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہے۔ کبھی واپس نہ آئے گی۔ یہ تبدیل ہو چکی ہے۔ خالی کمروں میں گھومتی ہوئی یہ لڑکی وہی نہ ہو گی جو پہلے تھی۔

میں کن چیزوں کو پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ دماغ میں اس نے فہرست بنائی۔ ساری زندگی کچھ اٹل تصورات۔ کلاس کی نفرت۔ دو ساریاں جو وہ کراچی میں رنگ ساز کے ہاں بھول آئی تھی۔

سامنے یونیورسٹی کی بلند عمارات چاندنی میں ساکت تھیں۔ دارالعمل اور کتب خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دو پروفیسر نہر کے پل پر سے گذر رہے تھے۔ یہ برگساں کا مطالعہ کرتے تھے۔ چند طالب علم جھنجھلا جھنجھلا کر ایک دوسرے کو کانٹ کے نظریئے سمجھاتے ہوئے گذر رہے۔ دولتمند طالب علم لڑکیاں تھیں جو درزیوں کی دوکانوں پہ گھنٹے صرف کرتی تھیں۔ اوپر سے بی۔ ٹی۔ سی کا ایک طیارہ نکل گیا۔

روشنی سے گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

راحیل بیگم ـــ کسی نے اس سے کہا۔ زندگی میں افسوس نہیں ہیں۔

اب میرے سامنے ایک اور دروازہ آگیا ہے۔ جو بند ہے۔ راحیل نے کہا

تم جو یہ کام کر رہی ہو۔ اس کے لئے بعد میں تم کو دکھ ہوگا کہ وقت ہمیشہ تمہارا تھا

آپ کون ہیں ـــ؟ راحیل نے سہمی ہوئی آواز میں آنکھیں کھولے بغیر چپکے سے سوال کیا۔

مجھے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اٹل تنہا ہوں جو بلیا میں مرا۔ میں علی ہوں۔ جو جالن پور میں زخمی ہوا۔ میں ارون راج ونش ہوں جس نے دس ہزار انسانوں کو اپنی مشین گنوں اور ٹینکوں سے روند ڈالا۔ میں وہ روح ہوں جو ہمیشہ کائنات کے سارے راستوں پہ بھٹکتی پھری۔ کیونکہ وقت کے اور میرے درمیان ہمیشہ راستے میں اور چیزیں آ گئی ہوتی ہیں اب دنیا تمہاری منتظر ہے۔ انسان تمہاری آس میں بیٹھے ہیں جو مارے جا رہے ہیں۔ کچلے جا چکے ہیں۔ اپنے اوپر تم اب بھی نازاں رہو گی ـــ؟

تم کون بولا ہو ـــ؟ میں اب تم تک نہیں آؤں گی ـــ راحیل نے کہا۔

راحیل بیگم۔ اس زمستاں کی رات، فیصلہ بالآخر تم کو کرنا ہے۔ وقت کا انتخاب تمہارا ہے۔

نہیں۔ وقت کا انتخاب بھی میرا نہیں ہے ـــ زندگی کی اہم پیاری چیزیں دسترس سے باہر ہیں تو میں نسبتاً کم اہم چیزوں کا سہارا نہیں لے سکتی ـــ

مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے آنکھیں ملیں۔ وہاں کوئی نہ تھا صرف یہ سکوت تھا۔ ایسا سکوت تھا جس میں گلاب کے پھول، باغ کے پرند تصویریں ـــ

سب باتیں کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔

بے چینی، رنج کی سلطنت ہر جگہ ایک سی ہے اور اب میں اس سلطنت سے نکلتی ہوں ــــ اس نے کہا۔ باغ کا راستہ طے کر کے وہ سڑک پر آگئی۔

موریکے ملس کی گھنٹیوں کی آواز اس کے کان میں آئی ــــ وہ بے خیالی سے بھیگی سڑک پر ایک سمت کو چلتی رہی۔ دیوداروں کا جنگل چاندنی میں ساکت تھا۔

یہ روح کی آخری ضیافت ہے اور ہوا مقدس جنگلوں میں ناچ رہی ہے۔

ٹیلے پر چاند کے نیچے، ایک مصلوب خدا کے کراس کے سائے میں بیٹھے ہوئے اسے وہ دونوں نظر آئے۔

اندھیارے اور پانی کا بھیگا ہوا خدا چٹان پر تنہا بیٹھا ہے۔ خدا ــــ اس کا بیٹا۔ اور ایک اونگھتا ہوا، اکتایا ہوا کبوتر ــــ صدیقہ مریم، انسانوں کی ماں ــــ ہم حوا کے بدنصیب فرزند اس آنسوؤں کی وادی میں سے روتے ہوئے گذر رہے ہیں ــــ علی عنہ سامنے آکر اس سے کہا۔

دماغ کے زلزلوں میں اضافہ ہو گیا۔

"پرانے دیوتا پہاڑوں پر آوارہ پھر رہے ہیں اور میں پھولوں پر چلنا بھول چکی ہوں۔" اس نے کہا۔ جس طرح ایک زلزلہ دوسرے زلزلے سے بات کرتا ہے۔

اب یہاں کوئی رنگ نہیں ہے۔ کوئی جسم۔ کوئی حسن۔ خلا خلا سے مل گئی ہے۔ موت موت سے۔ خلا بھی نہیں ہے۔ آسمان کا سمندر سیاہ ہو چکا ہے اور پتے موت کے خیال سے زرد پڑ گئے ہیں۔ ایلیزر نے کہا۔

ایلمر میں تمہارے پاس واپس آگیا ہوں — اور میں کوئی ہیرو نہیں ہوں۔ میں نہایت شرافت رہا۔ تم سب نے اب تک نہایت ذلیل قسم کی مہربانی کا مجھ سے اظہار کیا۔ کائنات میں اور کوئی نہیں ہے۔ صرف میں ہوں — سینٹ این کی کہانیاں بھی نہیں ہیں۔ شروع سے آخر تک اس نے کیا بکواس لکھی تھی۔ اس نے کیا پڑھا۔ کتنے ڈرامے اسٹیج کیے۔ شام کو کہاں گئی — یہ کمینی انانیت — اور اپنی انانیت سے میں تھک چکا ہوں۔ ستاروں کی روشنی میں زائرین ڈگمگاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ کوائر چیخ رہے ہیں اور میرا دماغ چلا رہا ہے — علی نے کہا۔

تمہارا وقت ابھی باقی ہے علی اور میرا وقت ختم ہو چکا ہے۔ ہم سب نے ایک دوسرے کے محافظ فرشتے بننے کی کوشش کیوں کی تھی۔ تمہاری طرح اپنا عقیدہ میں نے بھی ایک مرتبہ کھویا اور مدتوں تک بے عقیدہ گھوما پھرا۔ اسٹریم لائینڈ فلسفے حاصل کرنے کے لئے گردش میں رہا اور آخر وےٹی کن جاکر تازہ دم ہوا۔ پچھلے بیس سال تک میں تمہارا محافظ فرشتہ رہا۔ اب میں بصد رنج و غم تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں — ایلمر نے کہا۔

تمہارا وجود ماضی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ تمہاری زندگی کا سوائے تمہارے اب کسی کو فائدہ نہیں۔ تم اپنے زمانے کے نمائندے ہو اور تمہاری ایسی کوئی چیز باقی نہ رہ جائے گی۔ تم کس طرح سوچتے تھے۔ کیسے زندہ تھے۔ سب زندگیاں برابر ہیں۔ ایک سی ہیں۔ مستقبل کو اب کسی کا انتظار نہیں رہا ہے — راحیل نے کہا۔

خیالات کی راکھ میں سلگتا ہوا وقت اب مجھ سے بے تعلق ہے۔ روحوں کے بوجھ سے لدے ہوئے جہاز مسلسل گردش میں ہیں۔ وقت کے کیڑے مجھے کھائیں گے۔ اس نیلی، تاریک روشنی میں مرے ہوئے انسانوں کے دماغ چلا چلا کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ باریک آوازوں والی روحیں سرخ پرندوں کی طرح شور مچا رہی ہیں۔ جنوب کی سانولی دیوداسیاں

دماغ کی سطح پر سے ناچتی ہوئی گذر گئی ہیں اور خزاں کی دنیا جل رہی ہے۔ ایلمر نے کہا۔

میں تمہارا محافظ فرشتہ ہوں — میں محض ایک پیدائش ہوں۔ مردم شماری کے خانے کا ایک نشان — ایک لمبے چوڑے خاندان کی ایک شاخ۔ لیکن پوری نسل ہوں۔ پورا ملک ہوں۔ سارا زمانہ ہوں۔ میں خدا کا ایک فرشتہ ہوں۔ میں محبت ہوں — میرے وجود میں تمہاری زندگی کی کہانی پنہاں ہے کتنے مواقع کھوئے۔ کتنی غلط چیزوں کی تلاش کی۔ کن دکھوں کو دیکھا۔ صلیبیں ہوا میں دھندلی موم بتیوں کی طرح لرزاں ہیں۔ تاریخ کا شور مدھم پڑ گیا ہے۔ پرکھوں کے نام قصیدوں کی جھنکاریں۔ مرثیوں کا گداز۔ آنکھیں تاروں پر اٹک رہی ہیں اور جنرل لنگڑا ہو چکا ہے۔ تمہاری آواز اور میرا کرب مل جل کر ایک ہو گیا ہے۔ مجھے زندگی کے خوف سے چھٹکارا مل رہا ہے ——————— میں زندہ رہوں گا۔ علی نے کہا۔

میں نے تمہارے رنج دیکھ لئے ہیں اور چاندنی کی سطح پر سے تانیں اٹھتی جا رہی ہیں۔ آج کی رات ہم اپنی اپنی غلطیاں بھول جائیں گے۔ آج کی رات فرشتے نیچے گر رہے ہیں۔ جو ان خدا ناریکی میں روتے ہیں۔ سبز ستارے ہوا میں جل رہے ہیں اور ایک اجنبی نیا چاند ہوا میں تیر رہا ہے۔ جب تم شیری کے سرخ گلاس دیکھو گے۔ اکتوبر کی زمین کی خنک مہک محسوس کرو گے، جب تم کو سمندر کے جھلملاتے پانی میں بندرگاہوں کا پرسکون عکس نظر آئے گا۔ اس وقت شاید تم کو میرا خیال آئے۔ میں تم سب کی قسمت کی تنہا، اجنبی ساتھی ہوں۔ راحیل نے کہا۔

وہ تینوں چاند کے سائے میں چلتے ہوئے جنگل کے سرے پر آئے۔ اس ٹیلے پر، درخت اور پرانی کرم خوردہ صلیب کے نیچے زمین، آسمان، وقت، اور ابدیت کا سنگم تھا۔

۵۲

میری رفیق — میری دوست — اسی دھندلکے میں اس نے دہرایا — میں ہزارویں بار تمہارا جامِ صحت پیتا ہوں۔ تم اسی لئے تخلیق کی گئی تھیں کہ دنیا تمہارے جامِ صحت پیتے پیتے دیوانی ہو جائے۔ کیا تم اپنی تخلیق کے مقصد سے واقف نہیں؟ اصل عورت تم ہو۔ راحیل وغیرہ تو سب بکواس تھی۔ محض ذہن، محض دماغ۔ دماغ جو سوچتے سوچتے پاگل ہو جائے اور دوسروں کو پاگل کر دے۔ محض سائے۔ میں سایوں سے اب تنگ آ چکا ہوں۔ میں صرف تمہاری باتیں سننا چاہتا ہوں۔ تمہاری ہلکی پھلکی بے معنی باتیں۔ تمہارے شیفون کے سیاہ کلوک کی مہک "شینل نائنٹی" جو تم استعمال کرتی ہو۔

"لیلے — لیلے — مسز بلگرامی —" اس نے پلنگ پر سے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔

"ہلو ۔۔۔" لیلیٰ کی شائستہ آواز آئی: "ریاض صاحب ۔۔ کیا یہ آپ ہیں ۔
۔۔ ہاؤ آر یو ۔۔؟"

"مسز بلگرامی ۔۔" اس نے کہا ۔۔ اور پھر چپ ہو گیا۔

"ریاض صاحب! آپ کی آواز بہت مضمحل معلوم ہوتی ہے۔ کیسی طبیعت ہے ۔۔؟"
لیلیٰ نے اخلاق سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں ۔ کل کلب میں ہم لوگ بہت رات گئے تک لان پر بیٹھے رہے تھے نا۔
اس وجہ سے مجھے زکام سا ہو گیا ہے ۔۔۔ اور بخار ہے ۔۔ اور کچھ ہینگ اوور بھی ہے
۔۔ اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"اوہو ۔۔" لیلیٰ نے تشویشناک آواز بنا کر جواب دیا: "آپ مکمل آرام کیجیے ۔۔
یوں کہیے کہ ہینگ اوور زیادہ ہے ۔۔۔ !! میرے ہزبینڈ کو بھی دو دن سے بخار
آ رہا ہے۔"

"اوہو ۔۔ کرنل صاحب کے مزاج کیسے ہیں ۔۔" اس نے بھی ویسی پُر اخلاق
تشویش ظاہر کی۔

"او ۔۔ ہی از آل رائٹ ۔ تھینک یُو ۔۔ اچھا ۔" لیلیٰ کی آواز آئی ۔۔ "ٹیک
آفٹر یور سیلف ۔۔ گڈ نائٹ:"

"سنیئے ۔۔ سنیئے مسز بلگرامی ۔۔" ریاض نے گھبرا کر کہا

"جی ۔۔؟"

"مسز بلگرامی ۔۔ میں بہت بیمار ہوں اور میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں ۔۔
آپ کو اپنے قریب بٹھانا چاہتا ہوں ۔۔ کیا ۔۔ کیا ایسا کبھی نہ ہو سکے گا کہ آپ

آتشدان کی آگ کے سامنے' میرے قریب بیٹھی ہوں ___ جبکہ باہر برف گرتی ہو۔"
وہ دفعتہً رک گیا ___ میں بالکل دیوانہ ہوگیا ہوں۔ اس نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر
خود سے کہا۔

بیلا چونکی ___ ہوا جو چپکے چپکے سمندروں پر سے چلتی ہوئی آ رہی تھی، کمرے میں
آکر اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ یہ الفاظ جو اس نے فون پر سُنے دہرائے گئے تھے
جب ارون نے اس سے یہ کہا تھا تو اس نے جواب دیا تھا۔ کرنل راج ونش
کیا آپ بھول گئے کہ میرا شوہر ہے۔ جس نے میرا کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ میرے
بچے ہیں۔ گھر ہے۔

فون بند کرکے وہ کمرے سے باہر آئی۔ اس نے یہ بات نہیں دہرائی۔
نیچے آکر اس نے کار نکالی اور اس طرف روانہ ہوگئی جہاں وہ رہتا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔ لکڑی کا زینہ طے کرکے وہ ڈرائنگ روم میں آئی۔
ہوا کی طاقت اور عظمت کا اس نے اندازہ کیا جو کمرے کے نیلے پردوں کو مار ڈالے
دے رہی تھی۔

یہ اس کا بیڈ روم تھا۔ اس مشہور و معروف خود پسند الگ تھلگ رہنے والے
بیچلر کا بیڈ روم جس میں وہ داخل ہوئی۔

"ہاؤ آر یو ___" اس نے جھک کر مزاج پرسی کی اور قریب ایک کرسی پر
بیٹھ گئی۔

وہ بہت معمولی' ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہوگئے۔

باتیں کرتے کرتے لیلیٰ کو خیال آیا ــــ اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔ باہر کھجور کے پتوں میں اٹل تاریکی سرسرا رہی ہے اور یہ انسان تکیوں پر سر رکھے تھکی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ ٹٹ ٹٹ ــــ اس نے دل میں کہا ــــ اروِن راج ونش ــــ مبارک ہو۔ میں آخر کار اس جگہ پر پہنچ گئی ــــ میرے پہلے تجربے بالکل بیکار ثابت ہوئے۔

یکلخت اسے محسوس ہوا اسے نروان حاصل ہو گیا ہے۔ گمان ــــ مکمل گیان۔ اس اجنبی کمرے میں۔ اس مسہری کے کنارے۔ اس پر روشنی سی عیاں ہو گئی۔ لڑکیاں جو کل سہ پہر دستخط جمع کرتی اس کے پاس آئی تھیں۔ راحیل۔ راج ونش بھائی اور یحییٰ علی۔ ان سب کو میں نہیں سمجھ سکی تھی۔ اب سب عقل میں آ گیا ہے۔ یہ لوگ جو دائیں و بائیں بے حد شائستہ طریقے سے اس سے فلرٹ کرتے ہیں۔ میں جو رات رات بھر ناچتی ہوں۔ جس کے ملبوسات کا تذکرہ تفصیل سے تماشائی اور آئینے میں شائع ہوتا ہے۔ میں اب تک بالکل بیوقوف تھی۔ میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں اروِن راج ونش۔

"اب آپ کیا سوچ رہی ہیں لیلیٰ بیگم ــــ" ریاض نے مضمحل آواز میں سوال کیا۔

اس نے اپنی براؤن اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس انسان نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ یہ انسان ــــ جس نے راحیل کو کتنے بے پایاں دکھ پہنچائے تھے۔ کتنے اطمینان اور مکمل مسرت کے ساتھ نیم دراز مجھے دیکھ رہا ہے۔ اسے محسوس ہوا۔ وہ دفعتہً ادھیا تھی جا رہی ہے۔ اس کمرے، ان دروازوں کے نیلے پردوں، دیوار کی اس بڑی پینٹنگ، ان سب چیزوں سے آگے نکل گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ راحیل کے پاس واپس جا کر کہے گی۔ تم

میری سمجھ میں آ گئی ہو۔ اب تک میرے دماغ پر زندگی کی دلچسپی اور حسن کا کہرہ چھایا ہوا تھا۔
اس میں تمہاری آوازیں تیرتی ہوئی مجھ تک پہنچتی تھیں اور میں حیرت سے تم کو دیکھتی تھی۔

اب میں ریاض کے کمرے میں موجود ہوں۔

ترتیب ایک شیلف پر کتابیں رکھی تھیں۔ ایک خانے میں بے شمار سادے کاغذات
اور کاپیاں پڑی تھیں۔

"ایک زمانے میں میں افسانے لکھا کرتا تھا۔" کتابوں کا جائزہ لیتے دیکھ کر اس
نے لیلےٰ سے کہا۔

"آپ بھی ——؟" لیلےٰ کو ہنسی آئی۔

"عرصہ ہوا۔ بہت مدتوں بعد میں نے کل ایک کہانی اور لکھی ہے۔"

"اچھا —— واقعی ——؟"

"آپ کو دیکھنے کے بعد ——" اس نے اضافہ کیا۔

"اچھا۔" لیلیٰ نے ذرا دلچسپی سے پوچھا —— "آپ اپنے افسانے دے دیجئے تو
میں گھر لے جا کر ان کو پڑھوں گی۔"

"بہت خوب ——" اس کو بھی ہنسی آ گئی۔

"اور میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہوں ——" اس نے پھر اطلاع دی۔

"آپ انگریزی میں شعر کہتے ہوں گے ——؟" لیلیٰ نے ذرا اکتا کر پوچھا۔

یہ لٹریچر وٹریچر کا سلسلہ اس نے راجیل، میرا اور رملی وغیرہ کے وہاں اتنا دیکھا تھا کہ
اس نے پھر بور ہونا شروع کیا۔

"کمرہ آپ کا خاصے سلیقے سے سجا ہے۔ آپ کی بیگم صاحبہ تو بے حد خوش رہیں گی ——"

اس نے کمرے پر نظر ڈال کر کہا۔

"میری بیگم صاحبہ — !" وہ بہت ہنسا اور تاریکیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب میں غالباً شادی کروں گا — زندگی میں مجھے آپ کی آمد کا انتظار تھا۔ اب جبکہ آپ ظاہر ہو چکی ہیں۔ مجھے اور کسی چیز کی تمنا نہیں رہی۔ لہٰذا شادی ایک اور روزمرہ کا معمول ہے جسے پورا کر لینا ہو گا — مثلاً، مثلاً —"

"مثلاً جیسے شیو کرنا یا چائے پینا —" لیلیٰ نے ہنس کر کہا۔

"بالکل —" ریاض نے جواب دیا "اور چنانچہ وہ سانحہ بھی ایک روز وقوع پذیر ہو جائے گا۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک باتیں کرتا رہا۔ باتیں جو اس نے برسوں سے نہیں کی تھیں جو مدتوں سے اس کے دماغ میں محصور تھیں۔

دیوار کے نیچے سمندر شور کرتا رہا۔

پھر شور زیادہ ہو گیا۔ موجیں، اونچے اٹھتے ہوئے طوفان، ہوا کے ریلے ایک عظیم تباہی جس میں دماغ پاش پاش ہونے لگا۔ لیلے۔ لیلے ۔۔۔ لیلے ۔۔۔ وہ خوب زور سے چیخا۔

میں راجیلی ہوں۔ کہیے آپ کیا چاہتے ہیں۔ لیلے ۔۔۔ راجیلی نے سامنے آ کر کہا۔ اس نے زرد ہاؤس کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اون کا سفید گولہ تھا جسے وہ سلجھا رہی تھی۔ پوپی کا ایک پھول اس نے میز پر رکھ دیا۔ اور وہ مڑ کر اس کا مذاق اڑاتی ہوئی چلی گئی۔ وہ پدما تھی۔

اسے اپنے اوپر کچھ شک ہوا۔ میں ریاض الدین احمد ہوں ۔۔۔ اس نے غور سے خود پر نظر ڈالی ۔۔۔ شاید مجھے اردن راجپال کہتے ہیں۔

میں اردن ہوں ۔۔۔ اس نے خوش ہو کر آواز دی ۔۔۔ سنو بھائی لیلے

میں دراصل اردن راجپالی ہوں ـــــ

بکومت ـــــ تم شیعی ہو گئے ہو ـــــ لیلٹے نے جواب دیا۔

راحیل ـــــ! اس نے ذرا پریشان ہو کر آنکھیں ملیں۔

اب آپ اس قدر دُکھ مندی کے ساتھ کیا تلاش کر رہے ہیں ـــــ! پرما نے سوال کیا۔ تلاش ختم ہو چکی۔ تلاش ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی۔ اب آرام اور سستانے کا وقت ہے ـــــ! انہوں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

سب خاموش ہو گئے۔ وہاں بہت ساری جانی پہچانی اور نئی نئی شکلیں جمع ہو گئی تھیں۔ انہی میں ایک طرف صوفے پر بیگم ریاض بیٹھی تھیں۔ انہوں نے سرخ رنگ کی کمخواب کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بالکل موم کی سفید پتلی کی طرح چپ تھیں لیکن کبھی کبھی اپنے شوہر کو دیکھ کر ہنس پڑتی تھیں۔ ان ہی کی طرح کی کئی اور لڑکیاں بھی کمرے میں تھیں اور اب انہوں نے کوئی پارٹی گیم شروع کر دیا تھا۔

افوہ کیسی تنہائی ہے مجھے پہلی بار خوف محسوس ہو رہا ہے۔ دراصل شائد مجھے اب تک بخار ہے۔ اور ہچکیں اولہ ـــــ ریاض نے خود سے کہا۔ بتاؤ اب میں کیا کروں ـــــ!

خاموشی نے جواب دیا۔ میں اپنی رائے محفوظ رکھتی ہوں۔ میں نے آج تک تم لوگوں سے کبھی کسی قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ میں حسبِ معمول خاموش رہوں گی۔

فواد اندر آیا۔ اس نے الزبتھن وضع کا ادوا کلوک پہن رکھا تھا۔ اور لمبے پروں والی سیاہ ٹوپی۔ اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔

بیج بخیر کورس ـــــ راحیل میرا آستیا نے کہا۔

"صبح بخیر" —— اس نے بڑے گیلینٹ انداز سے جھک کر جواب دیا اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر سب پر نظر ڈالی۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بے حد سیلف کونشس ہو گئے۔

"اتنے عرصے میں میں نے تمہارے لیے کورس کا کام کیا۔ اب میں ذرا رخصت چاہتا ہوں" —— اُس نے اطلاع دی۔

"کہاں جاؤ گے" —— راحیل نے سوال کیا۔

"میں ذرا باہر کی دنیا کی سیر کروں گا۔ اور طب پڑھوں گا۔ وسعت" —— اس نے ہاتھ ہوا میں ہلا کر سمجھایا۔

"ہلو" —— ایک لڑکی اندر آ کر چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اس کے میک اپ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جنوبی ہند کے کسی رقاص کے بیلے میں شامل رہ چکی ہے پرس کھول کر اس نے کاغذ اور پنسل نکالا۔

"یہ کون ہے" —— ریاض نے آنکھیں مل کر چپکے سے دریافت کیا۔

"یہ کوئی پریس رپورٹر جان پڑتی ہے" —— کسی نے اس کے کان میں بھنبھنا کر اور رازدارانہ انداز میں جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ شادی کر رہے ہیں۔ یا کر چکے ہیں۔" لڑکی نے بے حد اغشیل انداز میں جلدی جلدی کہنا شروع کیا "آپ ہمارے ملک کے پرائز بیچلر تھے اور قوم کی آنکھ کا تارا وغیرہ وغیرہ ملت کو آپ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لہٰذا لڑکی جو آپ نے منتخب کی ہے۔ اس کا ذکر میں "تماشائی" کے خاص نمبر کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔ مع اس کے پسند ناپسند اور مشغلوں کے تذکرے کے اور یہ بھی کہ ملک کی پیچیدہ مسائل کے متعلق اس کے کیا خیالات ہیں۔

اس کے اللہ کا شکر ہے کہ کوئی خیالات نہیں ہیں۔ ریاض نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کا سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔ اس نے ٹیل کوٹ پہن رکھا تھا۔ اور ہاتھ میں کارنیشن۔ کیئے بڑے تکلف کے ساتھ وہ کمرے کے وسط میں ٹہلتا رہا۔

فواد اپنا کلوک بیحد پسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے میں مصروف تھا۔ اگر آپ اپنا انٹرویو ختم کر چکی ہوں تو میں آپ کا انٹرویو کروں۔ اس نے بیحد سنجیدگی سے نو وارد لڑکی کو مخاطب کیا۔

"آپ کون ہیں —" لڑکی نے پوچھا۔

"یہ تو آپ کو نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ ابھی تک مجھے مطلع نہیں کیا گیا کہ میں دنیا سے اپنا تعارف کس طرح کراؤں۔" فواد نے جواب دیا۔

"آپ کو مطلع کرنے والے کون ہیں —؟" لڑکی نے دریافت کیا۔

"آپ — میں — ہم سب" فواد نے کہا "ویسے میں نے آپ سب کو ہمیشہ بے حد محفوظ کیا ہے۔ آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیئے۔"

"لیکن آپ نے ایسا ماسک پہن رکھا ہے کہ آپ کا چہرہ مجھے آج تک نظر نہ آیا۔" لڑکی نے کہا۔

"ماسک تو آپ نے بھی پہن رکھا ہے۔" فواد نے کہا۔ اور اپنی ٹوپی کو بڑے اسٹائل سے جنبش دی۔

لڑکی نے گھبرا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا جس پر ماسک تھا۔

"دیکھیئے اسے اتاریئے گا نہیں —" فواد نے بڑے تکلف سے منع کیا۔

ہر شخص نے ہڑبڑا کر اپنے ماسک تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ ایک افراتفری مچ گئی اور سمندر سے بہتا ہوا گہرا کہرہ کمرے میں داخل ہوا جس میں سارے چہرے کھو گئے۔ اور ساری آوازیں دب گئیں۔

۵۰

اسپری ٹو ان گلوریا ڈیئی پیٹرس۔ ایگس ماریا درجنتہ ایٹ ہوموفکٹس ایٹ بینے ڈکٹس او منی پوٹینس ڈیوس پیٹر ایٹ فلیوس ایٹ اسپری ٹس سنکٹس۔ آمین۔ فادر ہائیلی نے کہا۔

گھنٹیاں بجتی رہیں۔ سناٹا مر آیا۔۔۔ علی نے چپکے سے کہا۔ اور ٹوپی اتار کر یوکلپٹس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ شمعوں کی جھلملاہٹ میں ارنسٹ برومل کی نماز جنازہ جاری رہی۔

میرپو۔۔ اس نے دہرایا۔۔۔

سنکیٹس سنکیٹس سنکیٹس۔ آیلمر نے دوسرے درخت کے نیچے سے نکل کر آہستہ سے کہا۔

ہاتھوں میں اونچی موم بتیاں لئے ہوئے جنازے کا جلوس عبادت خانہ کے پیچھے کی سمت بڑھنے لگا۔ جدھر قبرستان تھا۔ سنگ مرمر کی سلیں پانی میں بھیگ رہی تھیں اب میرے اور کسی اور کے درمیان کسی خیالات کا پل نہیں ہے۔ میں بالکل الگ ہوں۔ بالکل الگ۔۔۔ ایلمر نے ٹوپی ہاتھ میں لئے تابوت کی جانب نظر ڈالی۔۔۔ یہ

ارنسٹ بروہیل ہے جو آخر کار ختم ہو گیا — جو بیتھوون بجاتا تھا۔ اس نے محاذ جوام میں کام کیا۔ اپنے گھر والوں کو گیس چیمبر کے بھینٹ دے کر سن تینتیس کی جرمنی سے فرار حاصل کیا۔ اس نے یہاں کے الوہی رقص اور نغموں میں پناہ لے کر یہاں کے فن کو اور سنوارنے کی لگن رکھی۔ اسے دُنیا کے ہر انسان پر مکمل اعتماد تھا۔ ہر چیز سے اسے خوشی حاصل ہوتی تھی وہ بچوں کی طرح خواب دیکھتا تھا اور گہری نیند سوتا تھا۔ سات سال تک اس کے اعصاب دل و دماغ اور ہاتھوں کو مفلوج رکھا گیا۔ لیکن اپنے مہلک مرض سے ہار مان کر آج جب وہ مرا تو اس کے ہونٹوں پر وہ تبسم تھا۔ گویا وہ اپنے باویریا کے جنگلوں اور سبز میدانوں کو واپس پہنچ گیا ہے۔

ایلمر پورچ کی سیڑھیاں طے کر کے قربان گاہ کے پردے کے آگے جھک گیا —
خداوندا — اس نے آہستہ آہستہ کہا۔ تو نے مجھے پیدا کیا۔ تیرے سارے خیالات میں میں سب سے زیادہ افسوسناک اور قابلِ رحم خیال تھا۔ میرا وجود ایک انتہائی شرمناک خیال تھا۔ تو نے مجھے پیدا کیا۔ تو نے ذلیل کتنے بھی پیدا کئے ہیں — مجھ پر رحم کر —

قربان گاہ کی رنگین کھڑکیوں کے باہر نماز جنازہ کی دعا کے آخری الفاظ جنگل کے کہر میں پھیلتے جا رہے تھے۔ ریکوئی ایس کنٹ اِن پیسے۔ آمین

میں قابیل ہوں اور میں نے اپنے آپ کو قتل کیا ہے۔ ایلمر نے خدا کی ماں کے سامنے دو زانو ہو کر مدھم آواز میں کہا۔

میں غیر فانی ہوں — علی نے اپنے آپ کو بتایا اور موم بتیوں کی گیلی مدھم روشنی کو دیکھتا رہا۔ فراٹرس کلاٹ مے امم اک دیسر میم سکر یفنسی ام — تمہاری قربانی قبول ہوگی۔

"میرے دماغ میں جو ندی بہہ رہی ہے۔ اس کا شور تم نے سنا۔" دفعتہً ایلمر نے مڑ کر، ذرا خوف کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"میں غیر فانی ہوں"۔ علی نے دہرایا۔

"میں خوف کی وادیوں کی طرف سے آیا ہوں —— جہاں خدا کا ماسک بھوت مناتے ہیں —— ہم اور تم ایک گذرے ہوئے وقت کے بھوت ہیں ——" ایلمر نے کہا۔

"تمہارا اور میرا وقت ختم ہو چکا ——" علی نے کہا۔ سیڑھیوں سے اتر کر شمعیں لئے ہوئے وہ پورچ کے سامنے آ گئے۔

"یہ قبریں کیسی پراسرار ہیں جن کے کتبوں پہ مرثیے، نصیحتیں، ارمان بھرے شعر اور دعائیں لکھی ہیں۔" ایلمر نے کہا۔

"یہ کتبے جیسے وزٹنگ کارڈ ہیں۔ جو یہاں آ کر جانے والے دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔" علی نے کہا۔

"ہاتھوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ جنہوں نے بندوقیں اٹھائیں۔ تصویر کشی کی، پانچویں سمفنی بجائی۔ پیروں کو بکسوں میں کیلوں سے بند کر دیا گیا۔ جنہوں نے دی آتا کا والٹس کیا۔ برف کی سطح پہ پھسلے، خوبصورت شہروں کی سڑکوں پہ مارچ کیا۔" ایلمر نے کہا۔

چاند کبھی کبھی کسی ٹوٹی ہوئی صلیب پہ جھک آتا ہے۔ سنگِ مرمر کی صلیبوں کے پیچھے سے پتھریلے چہرے اور گلابی، معصوم آنکھیں جھانکتی ہیں —— زندگی کا خوف بالتو کتے کی طرح پھر تمہارے پاس واپس

آگیا ہے۔" علی نے کہا

"میری روح۔ ہر آرام دہ جگہ سے بھاگ کر پھر باہر کی سردی اور تاریکی میں جا کھڑی ہوتی ہے ۔۔۔" ایلمستر نے ہتھیلیاں کھول کر کہا۔

"یہاں چاروں اور خوبصورت عورتوں کے مردہ چہرے ہیں۔ فلسفے سو گئے" علی نے کہا۔

چاند رفتہ رفتہ دیو داروں پر بلند ہو کر ان کے مقابل میں آگیا۔

۵۱

چاند اوپر آ کر دریچے میں سے اندر جھانکنے لگا۔

میں واپس آگئی ہوں۔ چنانچہ میں واپس آگئی ہوں —— دفعتہً اسے ایک شدید روشنی کا احساس ہوا۔ جو کھڑکی میں سے اندر آرہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ چاروں اور دیکھا۔ روشنی۔ تاریکی۔ خوف۔ چھبیس سال سے میں اس طرح زندہ ہوں۔ مجھے سکون نہیں ملا۔ یہ بہترین زندگی تھی۔ خوابناک زندگی جس کا عموماً کہانیوں میں ذکر ہوتا ہے۔ جو اب تک میں نے بتائی۔ یہ بے حد ہولناک زندگی تھی۔ قدم قدم پر مجھے ڈر کا احساس ہوا۔ ہر طرف خطرہ ہے۔ لوگ جو مجھ سے ملتے ہیں۔ جو میری تعریف کرتے ہیں۔ ان سب نے نقابیں پہن رکھی ہیں۔ یہ سب ٹھنڈ وناچ ناچ رہے ہیں۔ شروع سے میں نے چہروں کو پہچاننا چاہا —— (تم کو تو —— Persecution Complex ہو جائے گا۔ میرا نے عقلمندی سے کہا

تھا۔ اس وقت وہ اپنے کتے سے باتیں کر رہی تھی۔ پیارے کتے میں تم کو کرنل جہانگیر کے پاس بے جاؤں گی۔ ایک ہنگامی کانفرنس کر کے جب وہ کتا خریدا گیا۔ اس کا نام تجویز کرنے کی سعی کی گئی۔ لیکن آخر کار بالاتفاق رائے اس کا نام کتا ہی تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن کتے کو یہ نام بہت ناگوار گزرے گا۔ میرا نے افسوس کے ساتھ کہا تھا جیسے تم لوگ مجھے میرا جی کہتے ہو تو مجھے رنج ہوتا ہے۔ میرا نام دراصل ستیہ وتی دیوی یا کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ پھر میں نادرہ اور عالیہ باجی کے گروپ میں رہی۔ چھ سال سے میں سینٹ جان ایمبولنس کے ایک اعلیٰ فوجی عہدے پر فائز ہوں۔ میں نے گوپالا کی جستجو کی۔ اور اب مجھے اس خوف کا احساس ختم کر رہا ہے۔ وقت بھاگا جا رہا ہے۔ لمحہ لمحہ۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس نے آتشدان پر رکھی ہوئی اپنی ایک تصویر کو دیکھا۔ یہ لڑکی جو نجم الدولہ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہے کبھی واپس نہ آئے گی۔ یہ تبدیل ہو چکی ہے۔ خالی کمروں میں گھومتی ہوئی یہ لڑکی وہی نہ ہو گی جو پہلے تھی۔

یہ کن چیزوں کو پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ دماغ میں اس نے فہرست بنائی۔ ساری زندگی کچھ اٹل تصورات۔ کلاس کی نفرت۔ دو ساریاں جو وہ کراچی میں رنگ ساز کے ہاں بھول آئی تھی۔

سامنے یونیورسٹی کی بلند عمارات چاندنی میں ساکت تھیں۔ دارالعمل اور کتب خانے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دو پروفیسر نہر کے پل پر سے گذر رہے تھے۔ یہ برگساں کا مطالعہ کرتے تھے۔ چند طالب علم جھنجھلا جھنجھلا کر ایک دوسرے کو کانٹ کے نظریئے سمجھاتے ہوئے گذرے۔ دولتمند طالب علم لڑکیاں تھیں جو درزیوں کی دوکانوں پر گھنٹے صرف کرتی تھیں۔ اوپر سے بیو۔ٹی۔سی کا ایک طیارہ نکل گیا۔

روشنی سے گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

راجیل بیگم ـــ کسی نے اس سے کہا۔ زندگی میں افسوس نہیں ہیں۔

اب میرے سامنے ایک اور دروازہ آ گیا ہے۔ جو بند ہے۔ راجیل نے کہا

تم جو یہ کام کر رہی ہو۔ اس کے لئے بعد میں تم کو دکھ ہو گا کہ وقت ہمیشہ تمہارا تھا

آپ کون ہیں ـــ؟ راجیل نے سہمی ہوئی آواز میں آنکھیں کھولے بغیر چپکے سے سوال کیا۔

مجھے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اٹل تنہا ہوں جو بلیا میں مرا۔ میں علی ہوں۔ جو جالن پور میں زخمی ہوا۔ میں ارمن راج ولش ہوں جس نے دس ہزار انسانوں کو اپنی مشین گنوں اور ٹینکوں سے روند ڈالا۔ میں وہ روح ہوں جو ہمیشہ کائنات کے سارے راستوں پہ بھٹکتی پھری۔ کیونکہ وقت کے اور میرے درمیان ہمیشہ راستے میں اور چیزیں آکھڑی ہوتیں اب دنیا تمہاری منتظر ہے۔ انسان تمہاری آس میں بیٹھے ہیں جو مارے جا رہے ہیں۔ پچھلے جا چکے ہیں۔ اپنے او پر تم اب بھی نازاں رہو گی ـــ؟

تم کو بالا ہو ـــ؟ میں اب تم تک نہیں آؤں گی ـــ راجیل نے کہا۔

راجیل بیگم۔ اس زمستاں کی رات، فیصلہ بالآخر تم کو کرنا ہے۔ وقت کا انتخاب تمہارا ہے۔

نہیں۔ وقت کا انتخاب بھی میرا نہیں ہے ـــ زندگی کی اہم پیاری چیزیں دسترس سے باہر ہیں تو میں نسبتاً کم اہم چیزوں کا سہارا نہیں لے سکتی ـــ

مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہاں کوئی نہ تھا صرف یہ سکوت تھا۔ ایسا سکوت تھا جس میں گلاب کے پھول، باغ کے پرند، تصویریں ـــ

سب باتیں کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔

سب جیتی، رنج کی سلطنت ہر جگہ ایک سی ہے اور اب میں اس سلطنت سے نکلتی ہوں — اس نے کہا۔ باغ کا راستہ طے کر کے وہ سڑک پر آ گئی۔

مویشی کے پاس کی گھنٹیوں کی آواز اس کے کان میں آئی — وہ بے خیالی سے بھیگی سڑک پر ایک سمت کو چلتی رہی۔ دیوداروں کا جنگل چاندنی میں ساکت تھا۔

یہ روح کی آخری ضیافت ہے اور ہوا مقدس جنگلوں میں ناچ رہی ہے۔

ٹیلے پر چاند کے نیچے، ایک مضطرب خدا کے کراس کے سائے میں بیٹھے ہوئے اسے وہ دونوں نظر آئے۔

اندھیارے اور پانی کا بھیگا ہوا خدا چٹان پر تنہا بیٹھا ہے۔ خدا — اس کا بیٹا۔ اور ایک اونگھتا ہوا، اکتایا ہوا کبوتر — صدیقہ مریم، انسانوں کی ماں — ہم حوا کے بدنصیب فرزند اس آنسوؤں کی وادی میں سے روتے ہوئے گزر رہے ہیں — علی نے سامنے آ کر اس سے کہا۔

دماغ کے زلزلوں میں اضافہ ہو گیا۔

"پرانے دیوتا پہاڑوں پر آوارہ پھر رہے ہیں اور میں پھولوں پر چلنا بھول چکی ہوں۔" اس نے کہا۔ جس طرح ایک زلزلہ دوسرے زلزلے سے بات کرتا ہے۔

اب یہاں کوئی رنگ نہیں ہے۔ کوئی جسم۔ کوئی حسن۔ فنا فنا سے مل گئی ہے۔ موت موت ہے۔ خلا بھی نہیں ہے۔ آسمان کا سمندر سیاہ ہو چکا ہے اور پتے موت کے خیال سے زرد پڑ گئے ہیں۔ ایلمر نے کہا۔

ایلمر میں تمہارے پاس واپس آگیا ہوں۔ اور میں کوئی ہیرو نہیں ہوں۔ میں نہایت شہوانی رہا۔ تم سب نے اب تک نہایت ذلیل قسم کی مہربانی کا مجھ سے اظہار کیا۔ کائنات میں اور کوئی نہیں ہے۔ صرف میں ہوں ـــ سینٹ ایلن کی کہانیاں بھی نہیں ہیں۔ شروع سے آخر تک اس نے کیا بکواس لکھی تھی۔ اس نے کیا پڑھا۔ کتنے ڈرامے اسٹیج کیے۔ شام کو کہاں گئی ـــ یہ کیسی انانیت ـــ اور اپنی انانیت سے میں تھک چکا ہوں۔ ستاروں کی روشنی میں نوائیں ڈگمگاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ کوّے چیخ رہے ہیں اور میرا دماغ جلا رہا ہے ـــ علی نے کہا۔

تمہارا وقت ابھی باقی ہے علی اور میرا وقت ختم ہو چکا ہے۔ ہم سب نے ایک دوسرے کے محافظ فرشتے بننے کی کوشش کیوں کی تھی۔ تمہاری طرح اپنا عقیدہ میں نے بھی ایک مرتبہ کھویا اور مدتوں تک بے عقیدہ گھوما گھوما پھرا۔ اسٹریم لائینڈ فلسفے حاصل کرنے کے لئے گردش میں رہا اور آخر دسے ٹی کن جا کر تازہ دم ہوا۔ پچھلے بیس سال تک میں تمہارا محافظ فرشتہ رہا۔ اب میں بصد رنج و غم تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں ـــ ایلمر نے کہا۔

تمہارا وجود ماضی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ تمہاری زندگی کا سوائے تمہارے اب کسی کو فائدہ نہیں۔ تم اپنے زمانے کے نمائندے ہو اور تمہاری اپنی کوئی چیز باقی نہ رہ جائے گی۔ تم کس طرح سوچتے تھے۔ کیسے زندہ تھے۔ سب زندگیاں برابر ہیں۔ ایک ہی ہیں مستقبل کو اب کسی کا انتظار نہیں رہا ہے ـــ راحیل نے کہا۔

خیالات کی راکھ میں سلگتا ہوا وقت اب مجھ سے بے تعلق ہے۔ روحوں کے بوجھ سے لدے ہوئے جہاز مسلسل گردش میں ہیں۔ وقت کے کیڑے مجھے کھائیں گے۔ اس نیلی تاریک روشنی میں مرے ہوئے انسانوں کے دماغ چلا چلا کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ باریک آوازوں والی روحیں سرخ پرندوں کی طرح شور مچا رہی ہیں۔ جنوب کی سانولی دیو داسیاں

دماغ کی سطح پر سے ناچتی ہوئی گذر گئی ہیں اور خزاں کی دنیا جل رہی ہے۔ ایلمر نے کہا میں تمہارا محافظ فرشتہ ہوں — میں محض ایک پیدائش ہوں۔ مردم شماری کے خانے کا ایک نشان — ایک لمبے چوڑے خاندان کی ایک شاخ۔ لیکن پوری نسل ہوں۔ پورا ملک ہوں۔ سارا زمانہ ہوں۔ میں خدا کا ایک فرشتہ ہوں۔ میں محبت ہوں — میرے وجود میں تمہاری زندگی کی کہانی پنہاں ہے۔ کتنے مواقع کھوئے۔ کتنی غلط چیزوں کی تلاش کی۔ کن دکھوں کو دیکھا۔ صلیبیں، ہوائیں دھندلی موم بتیوں کی طرح لرزاں ہیں۔ تاریخ کا شور مدھم پڑ گیا ہے۔ پرکھوں کے نام۔ قصیدوں کی جھنکاریں۔ مرثیوں کا گداز۔ آنکھیں تاروں پر ٹنک رہی ہیں اور جنرل لنگڑا ہو چکا ہے۔ تمہاری آواز اور میرا کرب مل جل کر ایک ہو گیا ہے۔ مجھے زندگی کے خوف سے چھٹکارا مل رہا ہے ——————— میں زندہ رہوں گا۔ علی نے کہا۔

میں نے تمہارے رنج دیکھ لئے ہیں اور چاند کی سطح پر سے قازیں اڑتی جا رہی ہیں۔ آج کی رات، ہم اپنی اپنی غلطیاں بھول جائیں گے۔ آج کی رات فرشتے پیچھے گر رہے ہیں۔ جو ان خلا تاریکی میں روتے ہیں۔ سبز ستارے ہواؤں میں جل رہے ہیں اور ایک اجنبی نیا چاند ہواؤں میں تیر رہا ہے جب تم شیری کے سرخ گلاس دیکھو گے۔ اکتوبر کی زمین کی خنک مہک محسوس کرو گے جب تم کو سمندر کے جھلملاتے پانی میں بندرگاہوں کا پرسکون عکس نظر آئے گا۔ اس وقت شاید تم کو میرا خیال آئے۔ میں تم سب کی قسمت کی تنہا، اجنبی ساتھی ہوں۔ راحیل نے کہا۔

وہ تینوں چاند کے سائے میں چلتے ہوئے جنگل کے سرے پر آئے۔ اس ٹیلے پر، درخت اور پرانی کرم خوردہ صلیب کے نیچے زمین، آسمان، وقت، اور ابدیت کا سنگم تھا۔

۵۲

میری رفیق — میری دوست — اسی دھندلکے میں اس نے دہرایا — میں ہزارویں بار تمہارا جامِ صحت پیتا ہوں۔ تم اسی لئے تخلیق کی گئی تھیں کہ دنیا تمہارے جامِ صحت پیتے پیتے دیوانی ہو جائے۔ کیا تم اپنی تخلیق کے مقصد سے واقف نہیں تھیں؟ اصل عورت تم ہو۔ راحیل وغیرہ تو سب بکواس تھی۔ محض ذہن، محض دماغ۔ دماغ جو سوچتے سوچتے پاگل ہو جائے اور دوسروں کو پاگل کر دے۔ محض سائے۔ میں سایوں سے اب تک بچتا رہا ہوں۔ میں صرف تمہاری باتیں سننا چاہتا ہوں۔ تمہاری ہلکی پھلکی بے معنی باتیں۔ تمہارے ویلویٹین کے سیاہ کلوک کی مہک "شینل نائنٹین" جو تم استعمال کرتی ہو۔

"لیلتے — لیلتے — مسز بلگرامی —" اس نے پلنگ پر سے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔

"ہلو —" لیلےؔ کی شائستہ آواز آئی: "ریاضؔ صاحب — کیا یہ آپ ہیں۔

— ہاؤ آر یو —؟"

"مسز بلگرامی —" اس نے کہا — اور پھر چپ ہو گیا۔

"ریاضؔ صاحب! آپ کی آواز بہت مضمحل معلوم ہوتی ہے۔ کیسی طبیعت ہے —؟"

لیلےؔ نے اخلاق سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ کل کلب میں ہم لوگ بہت رات گئے تک لان پر بیٹھے رہے تھے نا۔ اس وجہ سے مجھے زکام سا ہو گیا ہے — اور بخار ہے — اور کچھ ہینگ اوور بھی ہے — اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"اوہو —" لیلےؔ نے تشویشناک آواز بنا کر جواب دیا۔ "آپ مکمل آرام کیجئے — یوں کہیئے کہ ہینگ اوور زیادہ ہے — !! میرے ہزبینڈ کو بھی دو دن سے بخار آ رہا ہے۔"

"اوہو — کرنل صاحب کے مزاج کیسے ہیں —" اس نے بھی ویسی ہی پُراخلاق تشویش ظاہر کی۔

"او — ہی از آل رائٹ۔ تھینک یو — اچھا۔" لیلیٰ کی آواز آئی — "ٹیک آفٹر یور سیلف — گڈ نائٹ۔"

"سنئے — سنئے مسز بلگرامی —" ریاضؔ نے گھبرا کر کہا

"جی —؟"

"مسز بلگرامی — میں بہت بیمار ہوں اور میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اپنے قریب بٹھانا چاہتا ہوں — کیا — کیا ایسا کبھی نہ ہو سکے گا کہ آپ

آتشدان کی آگ کے سامنے، میرے قریب بیٹھی ہوں — جبکہ باہر برف گرتی ہو"
وہ دفعتہً رک گیا — میں بالکل دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خود سے کہا۔

بیلا چونکی — ہوا جو چپکے چپکے سمندروں پر سے چلتی ہوئی آ رہی تھی، کمرے میں آ کر اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ یہ الفاظ جو اس نے فون پر سُنے دہرائے گئے تھے جب ارون نے اس سے یہ کہا تھا تو اس نے جواب دیا تھا۔ کرنل راج ونش کیا آپ بھول گئے کہ میرا شوہر ہے۔ جس نے میرا کوئی قصور نہیں کیا ہے — میرے بچے ہیں۔ گھر ہے۔

فون بند کر کے وہ کمرے سے باہر آئی۔ اس نے یہ بات نہیں دہرائی۔ نیچے آ کر اس نے کار نکالی اور اس طرف روانہ ہو گئی جہاں وہ رہتا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔ نوکر کا زینہ طے کر کے وہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ ہوا کی طاقت اور عظمت کا اس نے اندازہ کیا جو کمرے کے نیلے پردوں کو ہلارے دے رہی تھی۔

یہ اس کا بیڈ روم تھا۔ اس مشہور و معروف خود پسند الگ تھلگ رہنے والے بیچلر کا بیڈ روم جس میں وہ داخل ہوئی۔

"ہاؤ آر یو" — اس نے جھک کر مزاج پرسی کی اور قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ بہت معمولی، ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

باتیں کرتے کرتے لیلئے کو خیال آیا۔۔۔ اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔ باہر کھجور کے پتوں میں اٹل تاریکی سرسرا رہی ہے اور یہ انسان تکیوں پر سر رکھے تھکی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ ٹٹ ٹٹ۔۔۔ اس نے دل میں کہا۔۔۔ اروِن راجونش ۔۔۔ مبارک ہو۔ میں آخر کار اس جگہ پر پہنچ گئی۔۔۔ میرے پہلے تجربے بالکل بیکار ثابت ہوئے۔

یکلخت اسے محسوس ہوا اسے نروان حاصل ہو گیا ہے۔ گیان۔۔۔ مکمل گیان۔ اس اجنبی کمرے میں۔ اس مسہری کے کنارے۔ اس پر روشنی سی عیاں ہو گئی۔ لڑکیاں جو کل سہ پہر دستخط جمع کرتی اس کے پاس آئی تھیں۔ راحیل۔ راج ونش بھائی اور یہین علی۔ ان سب کو میں نہیں سمجھ سکی تھی۔ اب سب عقل میں آ گیا ہے۔ یہ لوگ جو دائیں اور بائیں بے حد شائستہ طریقے سے اس سے فلرٹ کرتے ہیں۔ میں جو رات بھر ناچتی ہوں۔ جس کے بلبرسات کا تذکرہ تفصیل سے تماشائی اور آئینے میں شائع ہوتا ہے۔ میں اب تک بالکل بیوقوف تھی۔ میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں اروِن راج ونش۔

"اب آپ کیا سوچ رہی ہیں لیلئے بیگم۔۔۔" ریاض نے مضمحل آواز میں سوال کیا۔

اس نے اپنی براؤن اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس انسان نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا۔ یہ انسان۔۔۔ جس نے راحیل کو کتنے بے پایاں دکھ پہنچائے تھے۔ کتنے اطمینان اور مکمل مسرت کے ساتھ نیم دراز مجھے دیکھ رہا ہے۔ اسے محسوس ہوا۔ وہ دفعتہً اوپر اٹھتی جا رہی ہے۔ اس کمرے، ان دروازوں کے نیلے پردوں، دیوار کی اس بڑی پینٹنگ۔ ان سب چیزوں سے آگے نکل گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ راحیل کے پاس واپس جا کر کہے گی۔ تم

میری سمجھ میں آگئی ہو۔ اب تک میرے دماغ پر زندگی کی دلچسپی اور حسن کا گہرہ چھایا ہوا تھا۔ اس میں تمہاری آوازیں تیرتی ہوئی مجھ تک پہنچتی تھیں اور میں حیرت سے تم کو دیکھتی تھی۔

اب میں ریاض کے کمرے میں موجود ہوں۔

قریب ایک شیلف پر کتابیں رکھی تھیں۔ ایک خانے میں بے شمار سادے کاغذات اور کاپیاں پڑی تھیں۔

"ایک زمانے میں میں افسانے لکھا کرتا تھا۔" کتابوں کا جائزہ لیتے دیکھ کر اس نے لیلےٰ سے کہا۔

"آپ بھی۔۔۔!" لیلےٰ کو ہنسی آئی۔

"عرصہ ہوا۔ بہت مدتوں بعد میں نے کل ایک کہانی اور لکھی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ واقعی۔۔۔!"

"آپ کو دیکھنے کے بعد۔۔۔" اس نے اضافہ کیا۔

"اچھا۔" لیلیٰ نے ذرا دلچسپی سے پوچھا۔۔۔ "آپ اپنے افسانے دے دیجئے تو میں گھر لے جا کر ان کو پڑھوں گی۔"

"بہت خوب۔۔۔" اس کو بھی ہنسی آگئی۔

"اور میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہوں۔۔۔" اس نے پھر اطلاع دی۔

"آپ انگریزی میں شعر کہتے ہوں گے۔۔۔!" لیلیٰ نے ذرا اکتا کر پوچھا۔

یہ لٹریچر وٹریچر کا سلسلہ اس نے راحیل، میرا اور علی وغیرہ کے دہاں اتنا دیکھا تھا کہ اس نے پھر بور ہونا شروع کیا۔

"کمرہ آپ کا خاصے سلیقے سے سجا ہے۔ آپ کی بیگم صاحبہ تو بے حد خوش رہیں گی۔"

اس نے کمرے پر نظر ڈال کر کہا۔

"میری بیگم صاحبہ ـــ!" وہ بہت ہنسا اور تاریکیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب میں غالباً شادی کر لوں گا ـــ زندگی میں مجھے آپ کی آمد کا انتظار تھا۔ اب جبکہ آپ ظاہر ہو چکی ہیں۔ مجھے اور کسی چیز کی تمنا نہیں رہی۔ لہٰذا شادی ایک اور روزمرہ کا معمول ہے جسے پورا کر لینا ہو گا ـــ مثلاً، مثلاً ـــ"

"مثلاً جیسے شیو کرنا یا چائے پینا ـــ" بیاٹے نے ہنس کر کہا۔

"بالکل ـــ" ریاض نے جواب دیا۔ "اور چنانچہ وہ سانحہ بھی ایک روز وقوع پذیر ہو جائے گا۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک باتیں کرتا رہا۔ باتیں جو اس نے برسوں سے نہیں کی تھیں جو مدتوں سے اس کے دماغ میں محصور تھیں۔

دیوار کے نیچے سمندر شور کرتا رہا۔

نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں۔ میں نے ہمیشہ تم سے کہا کہ میرے حافظے کو کچھ ہوتا جا رہا ہے اور پھر انہوں نے شادی کر لی۔ اب ان کے ہاں تین بچے ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ تقسیم انعامات کے جلسوں کی صدارت کرتی ہیں۔"

"ٹٹ ٹٹ —" دوسرے فرشتے نے کہا۔ "مگر میں یہ بھول گیا ہوتا کہ میں ایک بے حد مہذب اور اعلیٰ خاندان کا فرشتہ ہوں یں لے بے انتہا عمدہ تعلیم حاصل کی ہے تو میں اس وقت کہتا — واٹ گوڈ ڈیم روٹ۔"

انہوں نے مشین کے شیشوں میں سے عبادت خانے کی طرف آخری نظر ڈالی۔ جہاں ساری شمعیں اب تک جل رہی تھیں۔

"خدا ن سب پر اپنی برکت نازل کرے۔ اور ان ساری معصوم روحوں کو زندہ رکھے —" انہوں نے زیر لب کہا اور سیلی کوپٹر نیلی فضا میں بلند ہو کر آسمان کی طرف واپس پرواز کر گیا۔

مارچ ۱۹۵۲

یہ کتاب

سن انیس سو ستائیس سے لے کر آج تک ، پچیس سال کا زمانہ ۔ جب انہوں نے لنگر اٹھایا اور جب وہ بھنور میں پہنچے اور گو ان کی شب سست موج کا ساحل ابھی سامنے نہیں آیا ہے ، لیکن اس پار بہت سے چراغ جل اٹھے ہیں ۔

قیمت : بیس روپے